

جولائی ۱۹۸۱ء

مَدَوۃِ اَیۡنِ دینی علمی و دینی مآہرنا

فُرکَانُ

قیمت سالانہ : بیس روپے

مُرَاتِبُ  
سَعید احمد بک آبادی

# برہان

جلد نمبر ۸ رمضان المبارک ۱۴۳۸ھ مطابق جولائی ۱۹۸۱ء شمارہ نمبر ۱

نظرات سعید احمد اکبر آبادی ۴

## مقالات

- ۱۔ خدا پرستی اور مادیت کی جنگ } مولانا سید کاظم صاحب نقوی، ریڈر ۱۰  
شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگر ٹھہ
- ۲۔ حکیم شافی کے ایک ممدوح یعنی قاضی حسن بلخی: آئسنہ رضیہ ایم۔ اے ۳۳
- ۳۔ اقبال کا اردو کلام } جناب جعفری ایم۔ اے آل انڈیا ۴۱  
ریڈیو۔ نئی دہلی
- ۴۔ تسخیرِ اشیا اور نبھائے الہیہ - } جناب مولوی شہاب الدین صاحب ۵۱  
[ندوی انانٹم فرقانیہ اکیڈمی (بیکانور)]
- ۵۔ ادبیات مولانا محمد کفیل فاروقی ۵۷
- ۶۔ تبصرے (ط) ۵۹



# نظرات

## دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا اجلاس صد سالہ (مارچ ۱۹۸۰ء) کس شان و شوکت اور طنطراق سے ہوا تھا کہ دنیا میں اس کی عظمت و سطوت کا سکہ بیٹھ گیا اور جو نہیں جانتے تھے وہ بھی اس کی جلالت مرتبہ و مقام کے قائل اور معترف ہو گئے، لیکن سخت افسوس اور رنج کی بات ہے کہ مورخ کے قلم کی روشنائی ابھی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ ناموافق حالات و واقعات کی تیز و تند آمد بھی اس قہرمانی سے چلنی شروع ہو گئی کہ اجلاس صد سالہ نے اس مرکز علوم و مینہ کی عظمت و شہرت کے جو نقوش صفحات گیتی پر اجاگر کئے تھے وہ دھندلانے لگے اور اس کی دیرینہ عظیم روایات و تاریخ کے ادراک زریں منتشر ہو گئے، اختلاف کا فلسفہ یہ ہے کہ شروع شروع میں چند اکابر میں پیدا ہوتا ہے اور عام طور پر چند غلط فہمیوں اور دور از کار اندیشیوں پر مبنی ہوتا ہے اگر اس کے تدارک کی کوشش آغاز کار میں ہی کر لی جائے تو اختلاف دور ہو جاتا ہے، دل صاف ہو جاتے ہیں اور رضا خوشگوار بن جاتی ہے۔ مثلاً یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جگر گوشہ رسول حضرت فاطمہ کو فدک اور خیبر کے معاملہ میں خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کی طرف سے یک گونہ ملال اور رنج تھا، اور اس بنا پر حضرت عائشہ بھی آئندہ خاطر تھے، لیکن حضرت ابوبکر صدیق کو اس کا علم ہوا تو ذرا ناخیر نہ کی، فوراً کا شائہ مرتضوی پہنچے



اور حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے گفتگو کی پہلے حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کا جو مرتبہ و مقام تھا اور اس کی وجہ سے خود حضرت ابو بکر کے دل میں دونوں کے لیے غایت احترام و ادب کے علاوہ جو محبت تھی اس کا ذکر فرمایا اور پھر حضرت علیؓ سے مخاطب ہو کر ارشاد کیا، کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ ”ہم انبیاء کے ترکہ میں وراثت نہیں ہوتی، اس لیے ہمارا جو کچھ ترکہ ہوتا ہے وہ صدقہ ہوتا ہے“ حضرت علیؓ نے اس کی تصدیق فرمائی تو شدت جذبات کے عالم میں حضرت ابو بکرؓ پر گریہ طاری ہو گیا، ان کی یہ حالت دیکھ کر حضرت علیؓ بھی رو پڑے اور حضرت فاطمہؓ بھی آبِ دیدہ ہو گئیں اور وہ غلط فہمی جو ایک بڑے فتنہ کا سبب بن سکتی تھی۔ صدیق اکبرؓ کے فوری نہایت مدبرانہ اور جرأت مندانہ اقدام کے باعث دور ہو گئی، لیکن اگر اختلاف کا تدارک فوراً نہ کیا جائے تو اس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا رہتا ہے، مخلصین کے ساتھ خود غرض اور فتنہ پسند لوگ بھی شریک ہو جاتے ہیں اور پھر معاملہ اس قدر آگے بڑھ جاتا ہے کہ اختلاف سخت نزاع یا بھی اور عظیم فتنہ و فساد کا سبب بنتا ہے، تاریخ میں اس کی دو ایک نہیں سینکڑوں مثالیں موجود ہیں:

یہاں جو اختلاف پیدا ہوا اس کی بنیاد کیا تھی؟ اور پہلے سے اس کے دواعی اور اسباب کیا تھے؟ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ سب کو معلوم ہے، بہر حال اختلاف پیدا ہوا اور چونکہ اسے ختم کرنے کے لیے فوری طور پر کوئی موثر عملی اقدام نہیں کیا گیا اس بنا پر اس اختلاف نے پر پورے نکلنے شروع کیے اور اس کا دائرہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا یا گیا، ارباب اخلاص و دیانت کے ساتھ تنگ نظر اور اصحابِ ہوا و اغراض بھی شامل ہو گئے، جانبین سے پھٹنوں، اشتہاروں اور اخبارات و رسائل کی وہ بھرمار ہوئی کہ خدا کی پناہ، ملت اسلامیہ



برصغیر کے دل دہلی گئے اور ہر طرف سے سخت احتجاج واعتساب کی آوازیں آنے لگیں، اس صورت حال سے دارالعلوم دیوبند کی اندرونی فضا کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ یہاں طلباء اور اساتذہ میں بھی دو گروپ ہو گئے، نہایت افسوس اور رنج اس بات کا ہے کہ اس قسم کے مواقع کے لیے قرآن و سنت کی تعلیمات میں کیا کچھ نہیں ہے اسے بھی یکسر فراموش کر دیا گیا، قرآن مجید میں ارشاد ہوا: **إِنَّ بَعْضَ النَّاسِ أَكْثَمُ، إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا**، حدیث میں فرمایا گیا: **كُفَى بِالْمُرْعَكْنِ يَا اَنَیْحَدَثُ بَكْلِ مَا سَمِعَ**، ایک حدیث میں حکم دیا گیا: **لَا تَجَاسَدُوا وَلَا تَحَاسَدُوا وَادْكُوا عِبَادَ اللَّهِ اخَوَانًا**، ان سب تعلیمات سے صرف نظر کر کے گروپ بندی کی وجہ سے یہاں افواہوں، الزام تراشیوں اور خوردہ گیریوں کی وہ گرم بازاری ہوئی کہ دارالعلوم کا امن و امان اور اس کا سکون درہم و زہر ہم ہو گیا، طلباء میں آئے دن فسادات اور سخت ہنگامے ہونے لگے اور بار بار پولیس کو مدد طلب کرنی پڑی، ان حالات کے باعث مدرسہ کے ارباب صلہ و عقد کو جن صبر آزمائیاں واقعات سے دوچار ہونا پڑا وہ تو کتنا ہی تعلیمی اعتبار سے اجلاس کے بعد سے اب تک کے دو برس برباد گئے۔ تعلیم ہوئی مگر نہایت ناقص، کوئی کتاب پوری تو کیا ہوتی آدمی بھی نہیں ہوئی، طلباء شورش کرتے تھے اور انتظامیہ اور اساتذہ ان غورثوں کے سد باب کی کوششوں میں لگے رہتے تھے، ۸ اور ۹ جون ۱۹۸۱ء کو طلباء کی شورش خود مجلس شوریٰ کے سامنے ہوئی اور ایک شورش میں تو مجلس شوریٰ کے ارکان بھی طلباء کی یورش کا نشانہ بنے۔

مجلس شوریٰ جو دستوری اور قانونی طور پر دارالعلوم دیوبند کی سب سے بڑی اور ذمہ دار مجلس منتظمہ ہے اس نے اس درمیان میں صورت حال کی اصلاح کی



بڑی کوشش کی اور اس سلسلہ میں مفاہمت کا ایک فارمولا بھی منظور کیا، لیکن چند اسباب و وجوہ کے باعث یہ فارمولا عملی جامہ نہ پہن سکا۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا، حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے، مسلمان تو مسلمان غیر مسلموں میں بھی دارالعلوم دیوبند کے ان حالات و واقعات کا چرچا تھا۔ پرتاب دہلی نے اس پر ایک طویل اڈیٹوریل لکھا۔ انگریزی اخبارات نے بھی ان سے دلچسپی لی اور ان میں خبروں کے علاوہ خطوط بھی شائع ہوتے رہے، بعض غیر ذمہ دار اخبارات عجیب طرح کی بے بنیاد اور غلط سلط باتیں لکھ رہے اور ہوائی خبریں نشر کر رہے تھے، ۱۲ مئی کو طلباء میں پھر فساد ہوا جس میں بعض سینئر اساتذہ کے ساتھ نہایت ناروا سلوک کیا گیا۔ مسلمانوں اور خصوصاً مدارس عربیہ اور دینی حلقوں میں سخت اضطراب و تشویش کا عالم تھا۔ انہیں حالات میں ۳۰ مئی سے یکم جون تک مجلس شوریٰ کا ایک اہم جلسہ ہوا جس نے متفقہ طور پر چند نہایت اہم فیصلے کیے ہیں، ان فیصلوں کو دونوں جماعتوں کے ذمہ دار اصحاب اور عام مسلمانوں نے پسند کیا اور ان پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا ہے، ہمیں معلوم ہے کہ ہماری اصل منزل مقصود ابھی دور ہے، لیکن اگر شریعت و عناصر کی دراندازی سے محفوظ رہ کر خوش دلی اور طمانیت قلب سے محض دارالعلوم دیوبند کے مفاد کے پیش نظر ان فیصلوں میں کھنڈت نہ ڈالی گئی تو اللہ کے فضل و کرم سے پوری امید ہے کہ یہ فیصلے اصلاح حال اور مستقبل میں دارالعلوم کی خاطر خواہ فلاح و ترقی کے لیے ایک موثر اقدام ثابت ہوں گے۔

وَلَيْسَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ

اس مجلس کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ بعض ممبر حضرات جو اپنے اعداد طبعی یا بعض مجبوریوں کے باعث ایک مدت سے شوریٰ کے جلسوں میں شریک نہ ہو سکے تھے وہ بھی



جس طرح بن پڑا حالات کی نزاکت کے پیش نظر دیوبند پہنچ گئے اور تینوں دن صبح سے لیکر رات کے دس گیارہ بجے تک جلسوں میں شریک ہوئے، اس طرح عرصہ دراز کے بعد شوری کا یہ ایک ایسا جلسہ تھا جس سے ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا، پھر جو سجاویز منظور ہوئیں وہ متفقہ طور پر ہوئیں، کسی ایک تجویز پر بھی نہ دو ٹوک کی نوبت آئی اور نہ بحث و گفتگو میں کہیں تلخ کلامی پیدا ہوئی، ایک جماعت کے مختلف افراد میں اختلاف فکر و نظر ایک امر طبعی اور ناگزیر ہے اور وہ یہاں بھی ہے، لیکن شوری کے اس اجلاس نے ثابت کر دیا کہ جب کبھی دارالعلوم کے حفظ و بقا اور اس کے حقیقی مفاد کو خطرہ لاحق ہوگا یہ سب ہم آہنگ و ہم آواز ہوں گے اور ان میں اختلاف نہیں ہوگا۔ بے شبہ مجلس شوری کے ارکان کا یہ جذبہ تعاون باہمی دارالعلوم کے حق میں فضل الہی اور رحمت خداوندی کی نشانی ہے :

مجلس نے جو سجاویز منظور کی ہیں ان کی تعداد بہت ہے۔ ہم یہاں صرف وہ چند اہم سجاویز اپنے لفظوں میں لکھتے ہیں جن کا تعلق پبلک سے ہے : (۱) گذشتہ چند برسوں سے ارکان شوری کی چار جگہیں متعلقہ حضرات کے انتقال پر ملال کے باعث خالی چلی آ رہی تھیں ان کے لیے حسب ذیل چار حضرات ممبر منتخب ہوئے : (۱) جناب مولانا صدیق احمد صاحب (ضلع باندہ) (۲) نواب حاجی عبید الرحمن خاں صاحب شروانی (علی گڑھ) (۳) جناب حاجی علاء الدین صاحب (تاجر بمبئی) (۴) مولانا محمد عثمان نمبرہ حضرت شیخ الہند (دیوبند) (۲) مجلس میں حضرت مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب نے مجلس کے نام اپنا ایک طویل مگر نہایت موثر اور رقت انگیز مکتوب گرامی خود ڈپھہ کر سنایا، اس خط میں حضرت موصوف نے کمال بلاغت و طلاقت بیانی سے اولاً اس تمام دارالعلوم کے ساتھ اپنے تعلق اور اس حیثیت سے اپنی خدمات کی ایک طویل داستان بیان کی تھی اور پھر اپنے ضعف پیری



و نقابہ کا ذکر کر کے استہام کے بارگراں سے سبکدوشی کی خواہش کا اظہار کیا تھا مجلس اس خط سے بڑی متاثر ہوئی اور اس نے کافی اور سنجیدہ غور و فکر کے بعد تجویز یہ منظور کی کہ حضرت مہتمم صاحب اس وقت جس منصب پر فائز ہیں اس پر اب بھی بلکہ تا حین حیات فائز رہیں گے البتہ آپ سے بحیثیت مہتمم کے جو فرائض و واجبات متعلق ہیں ان میں سے جن کا تعلق دارالعلوم کے اندرونی نظم و نسق سے ہے ان کی انجام دہی کے لیے ضروری ہے کہ مولانا نصیر احمد خاں صاحب شیخ الحدیث و نائب مہتمم کے علاوہ مجلس شوریٰ کے قدیم اور باصلاحیت ممبر مولانا مرغوب الرحمن بجنوری کو مددگار مہتمم اور مولانا محمد عثمان دیوبندی کو نائب مہتمم مقرر کیا جائے، اس موقع پر مجلس یہ بھی کر سکتی تھی کہ حضرت مہتمم صاحب کے مکتوب گرامی کی روشنی میں حضرت موصوف کو صدر مہتمم بناتی اور مہتمم کے عہدہ پر کسی اور کا تقرر کرتی۔ لیکن چونکہ صدر مہتمم کا تعلق انتظامیہ سے عملاً برائے نام ہوتا ہے اس بنا پر موجودہ حالات میں ایسا کرنا پبلک میں بہت سی غلط فہمیوں کا موجب اور حضرت مہتمم صاحب کی شان ارفع و اعلیٰ کے نامناسب ہو سکتا تھا اس لیے مجلس نے ایسا کرنے سے اجتناب کیا۔ لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ مجلس نے جو احتیاط ملحوظ رکھی تھی ایک انگریزی خبر رساں ایجنسی نے غلط سلط خبر انگریزی کے اخباروں میں شائع کر کے اسے برباد کر دیا۔

مذکورہ بالا دو تجویزوں کی ایک عظیم قادیت اور اہمیت یہ ہے کہ ان تجویزوں کے ذریعہ ایک نہایت سخت اور خطرناک غلط فہمی دور ہو گئی جس نے برصغیر کے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے دل و دماغ میں گھر کر رکھا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کی ممبری اور نیابت استہام ان دونوں منصبوں اور عہدوں کے لیے مہینوں سے مقامی اور غیر مقامی اخبارات و رسائل اور پروپیگنڈہ لٹریچر میں بار بار دو حضرات کے اسمائے گرامی اس زور شور اور قوت و شدت سے آرہے تھے کہ گویا دیوبند میں اختلافات



کی ساری بنیاد ہی شخصی اقتدار کی جنگ اور کشمکش ہے اور حقیقت یہ ہے کہ پرتاپ اور بعض انگریزی اخبارات نے یہ خیال ظاہر بھی کیا تھا اور بہت سے مسلمان بھی سمجھنے لگے تھے کہ واقعہ یہی ہے اور اس کی وجہ سے مجلس شوریٰ میں بھی دو گروپ ہیں، ایک ایک کا حامی اور اس کے لیے سرگرم رسائی اور دوسرے کا حامی اور اس کے لیے سبوتاہم ہرگز یہ باور نہیں کر سکتے تھے کہ یہ دونوں حضرات ان عہدوں کے خود طلبکار اور خواہاں ہیں اور اس بنا پر اس سلسلہ میں جو پروپیگنڈہ ہو رہا ہے وہ خود ان کے ایمار اور اشارہ پر ہو رہا ہے، کیونکہ یہ دونوں حضرات اپنے ذاتی علمی و عملی اوصاف و کمالات کے علاوہ ان بزرگوں کی اولاد و امجاد ہیں جنہوں نے اپنے خون جگر سے چین زار دارالعلوم دیوبند کی آبپاری محض خالصتہً لوجہ اللہ کی اور وہ کبھی اپنی خدمات کے عوض دنیوی مرتبہ و جاہ کے آرزو مند نہیں ہوئے، اس بنا پر ہمارا خیال تھا اور بالکل صحیح تھا کہ یہ پروپیگنڈہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے صرف ان چند کوتاہ اندیش لوگوں کی طرف سے ہو رہا ہے جو ”پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند“ کا مصداق ہیں اور جیسا کہ ہر تحریک میں ہوتا ہے اب معاملہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ ان دونوں حضرات کے کنٹرول سے باہر ہو گیا ہے، الحمد للہ ثم الحمد للہ! مجلس شوریٰ کی ان دو تجویزوں نے اس عام اور سخت غلط فہمی کا پردہ چاک کر کے مطلع بالکل صاف کر دیا۔ صدر جلسہ مولانا محمد منظور نعمانی نے الگ الگ ارکان شوریٰ سے گفتگو اور تبادلہ خیال کے بعد شوریٰ کے جلسہ میں شوریٰ کی ممبری اور نیابت اہتمام کے لیے نام پیش کیے اور سب ارکان نے ہنسی خوشی بغیر استکراہ کے انہیں منظور کر لیا کسی نے شوریٰ کی ممبری کے لیے نہ ان کا نام پیش کیا اور نہ نیابت اہتمام کے لیے ان کا، اس معاملہ میں حضرت مہتمم صاحب نے جس عالی ظرفی اور بلند نظری کا ثبوت دیا ہے وہ بھی بڑا قابل قدر اور ان کی خاندانی روایات کے شایان شان ہے، حضرت موصوف نے اپنے مکتوب گرامی بنام مجلس شوریٰ میں سب کچھ فرمایا لیکن اس کی طرف اک ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں



کیا کراہتام کا بارگراں ہلکا کرنے کی غرض سے فلاں صاحب کو میرا مددگار یا نائب ہتم مقرر کر دیا جائے۔

بہر حال مجلس شوریٰ نے اپنے حالیہ اجلاس سے جو نفاذ پیدا کی ہے وہ بڑی خوش آئند اور خوشگوار ہے، یہی خواہاں دارالعلوم دیوبند کا فرض ہے کہ اس نفاذ کو خوشگوار سے خوشگوار تر بنانے کی کوشش کریں، ہمیں یقین ہے کہ اگر یہ نفاذ بڑھتی اور ترقی کرتی رہی تو وہ دن جلد آسکتا ہے جب کہ مجلس شوریٰ خود متفقہ طور پر باد صبا کو گلے کے ہم نفس ہونے کی دعوت دے گی، خود دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں اگر اب سے چالیس پینتالیس برس پہلے ایسا ہو سکا ہے تو پھر دوبارہ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔

گزشتہ دو برس میں دارالعلوم میں جو تعلیمی ابتری اور پراگندگی رہی ہے مجلس شوریٰ نے بڑے درد و کرب کے ساتھ اس کا بہت سخت نوٹس لیا لیکن چونکہ ایجنڈے کا یہ جز آخری دن کی نشست میں پیش آیا تھا اور معاملہ تھا بہت اہم اس لیے شوریٰ نے طے کیا کہ سوال میں جب مدرسہ کھلے شوریٰ کا ایک خصوصی جلسہ صرف تعلیم سے متعلق امور و مسائل پر غور و خوض کرنے کی غرض سے منعقد کیا جائے، امید ہے کہ مشکل بھی خاطر خواہ طور پر حل ہوگی اور آئندہ سال تعلیمی اعتبار سے بھی دارالعلوم کا کامیاب سال ہوگا۔



# خدا پرستی اور مادیت کی جنگ

مولانا سید کاظم صاحب نقوی ریڈر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

(۱)

مادیوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ خدا پرستوں کا دعویٰ ہے کہ اس بات کا ثابت کرنا بہت آسان ہے کہ اس عالم کو ایک باشعور طاقت نے اپنے ارادے اور اختیار سے پیدا کیا ہے۔ وہ دلیل کے طور پر نظام کائنات کو پیش کرتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں ہمارا کہنا ہے کہ اگر ایسا ہے تو بڑے بڑے عقلاء زمانہ مشہور عالم مفکرین وجود خدا کے منکر نہ ہوتے۔ اُن کی یہ شدید مخالفت اگر خدا کے نہ موجود کی دلیل نہ قرار پائے تو کم از کم اثباتِ وجود خدا کے انتہائی مشکل ہونے کی دلیل ضرور ہے۔

مذکورہ بالا خیال اس وقت بالکل غلط ثابت ہو جاتا ہے جب مادہ پرست مفکرین کے خدا پرست طبقے مقابلے کی نوعیت اور کیفیت پر نظر کی جاتی ہے۔

تاریخ کا مطالعہ فیصلہ کرتا ہے کہ نیچرل سائنس (Natural Sciences)

کے ماہرین نے وجودِ خدا کا انکار اس وقت سے شروع کیا جب کلیسا کے نام نہاد حامیوں نے اپنے بیجا مذہبی اقتدار کے بچانے کے لیے ان کے علمی تحقیقات کی شدید مخالفت کی۔ ایک دور میں مسیحیت کے راہنما پورے یورپ پر حکومت کر رہے تھے۔

انہوں نے دیکھا کہ اگر علمی حقیقتوں کو پھلنے پھولنے کے واسطے آزاد چھوڑ دیا جائے تو ان کے بیان کردہ مٹز خرافات کو کوئی شخص باور نہیں کرے گا۔ اس کے بعد ان کے قصرِ اقتدار کا ڈھ جانا



یقینی ہے۔ یہ خیال کر کے انہوں نے نیچرل سائنس (Natural Sciences) کے اہرین پر سختی شروع کر دی۔ ان کے تحقیقات کا دروازہ بند کرنا چاہا۔ انہیں جیلوں میں ڈالا۔ انہیں سائنس لینے تک کی اجازت نہ دی۔

ہمارا قلم شرمارہا ہے کہ وہ عیسائی راہنماؤں کے اُن ہولناک مظالم اور جرائم کو نقل کرے جو تاریخ کے صفحات میں اب تک محفوظ ہیں۔ ۱۲۳۳ء میں مذہبی طبقے کی طرف سے ایک مذہبی عدالت (Inquisition) قائم کی گئی۔ اس کا مقصد مسیحیت کے مخالف خیالات پر قابو پانا تھا۔ مورخین نے تصریح کی ہے کہ مسیحیت کے خلاف نظریات رکھنے کے جرم میں اس محکمے نے جن لوگوں کو سزا دی ان کی تعداد پچاس لاکھ ہے۔ کچھ کو بچائی دی گئی۔ کچھ سوختہ بخت جلا ڈالے گئے، یہ محکمے مسلسل صدیوں تک انسانی خون کے دریا بہاتے رہے۔ وہ مسیحیت کے جھوٹے، تنگ نظر راہنماؤں کے ہاتھوں میں اپنے دشمنوں کے انتقام لینے اور انہیں تباہ و برباد کرنے کا بہترین وسیلہ بن گئے تھے۔ اسی دور میں بیچارے گلیلیو (Galileo) کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ ان کی بعض تحقیقات عقائد مسیحیت کے مخالف تھی۔ وہ حرکت زمین اور گردش سیارات کے قائل تھے ۱۶۳۲ء میں ان کا ایک دوست پوپ کے درجے تک پہنچ گیا۔ گلیلیو نے اس زمانے میں ایک کتاب لکھی جس میں تین آدمی مصروف گفتگو ہیں۔ ایک شخص بطلموس (Ptolemy) کے نظریات کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور دوسرا آدمی "کوپرنیکس" (Copernicus) کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت نے عیسائیت کے طبقہ روحانیت کے غیظ و غضب کو دوبالا کر دیا۔ انہیں فوراً روم طلب کیا گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ ایک گھر میں مدتوں نظر بند رہے) بالآخر ۲۰ جنوری ۱۶۳۳ء کو جب انہوں نے مجبوراً مندرجہ ذیل نوید مے پر دستخط کیے تب انہیں رہائی نصیب ہوئی :

"میں گینیلیو ستر برس کی عمر میں آپ لوگوں کے سامنے اپنے گھٹنوں کے بل کھڑا



ہوا ہوں۔ کتاب مقدس میرے سامنے ہے۔ میرے ہاتھ اس کے اوپر رکھے  
ہیں۔ اس عالم میں میں تو بہ کرتا ہوں۔ میں اپنے اس بے حقیقت دعوے پر  
پیشمان ہوں کہ زمین متحرک ہے۔ میں اسے قابل نفرت سمجھنے ہوئے اس کا  
انکار کرتا ہوں۔“ (تاریخ علوم)

یکتھولک (Catholic) عیسائیوں کی علم دشمنی اور اس سلسلے میں ان کے  
مظالم کی داستان کتنی بسوء اتفاق سے پروٹسٹنٹ (Protestant) بھی تعصب  
اور علوم و فنون سے عداوت میں یکتھولک سے کم نہ تھے۔ یہ انہی ظالموں کا کارنامہ ہے کہ  
انہوں نے متعدد سائنسدانوں کو جدید علمی نظریات کے جرم میں جیتا جاگتا جلاد کر خاکستر  
کر دیا!

مسیحیت کے نام نہاد طرفداروں کے یہی ہونا کہ مظالم وہ تھے کہ نیچرل سائنس  
کے ماہرین مذہب اور خدا سے ایک بار گزیدہ شخص کی طرح بھاگنے لگے۔ ان لوگوں کی  
تنگ نظری نے سلاطین وقت کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ انگلینڈ کے بادشاہ  
ایڈورڈ (Edward) نے ”بیکن (Bacon)“ کو کیمسٹری کے متعلق  
بحث کرنے سے روک دیا۔ آکسفورڈ میں انہیں اس علم کی تدریس نہیں کرنے دی۔ آخر  
میں بیکن کو انگلستان سے جلا وطن کر کے بیرس بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ ہمیشہ کلیسا کی  
نگرانی میں زندگی بسر کرتے رہے۔

جس وقت کلیسا کا ظلم و ستم اپنے شباب پر تھا تو رفتہ رفتہ علمی تحریک  
(Renaissance) نے زور پکڑا۔ روشن خیال طبقہ جو اس دور کے مسخ شدہ  
بیہودہ مذہبی عقائد سے عاجز آچکا تھا اس تحریک کا حامی بن گیا۔ دوسری طرف آزادی  
خواہ جماعت نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ظالم حکومت وقت کے خلاف بغاوت  
کر دی۔



ان تین طاقتوں نے مل کر ایک دوسرے کا پشت پناہ بن کر مذہب کا مقابلہ شروع کیا۔ انہوں نے اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے مختلف طرح کے وسائل سے کام لیا۔ تمام دنیا کے خدا پرستوں کو دل کھول کر برا بھلا کہا۔ تمام دینی عقائد کو مزخرفات سمجھنے اور کہنے لگے۔ مدتوں یہ صورت حال باقی رہی۔ آخر میں پوپ اور کلیسا قدم پیچھے ہٹانے پر مجبور ہوئے۔ رفتہ رفتہ مذہب کے خلاف مادہ پرستوں کے پروپیگنڈوں سے پوری مغربی دنیا متاثر ہو گئی۔ کچھ عرصے کے بعد یہ آوازیں ایک گراں بہا، قیمتی علمی تحفے کے طور پر یورپ کے دروازوں سے مشرق تک بھی پہنچیں۔ اہل مغرب کی طرح اہل مشرق بھی مذہب سے بدظن اور متنفر ہو گئے۔

علوم طبیعیہ (Natural Sciences) کے ماہرین نے بہت بڑی غلطی یہ کی کہ انہوں نے مسیح شدہ مسیحیت کے تعلیمات کی صف میں تمام دنیا کے مذاہب کو قرار دے دیا۔ وہ انتقام اور ان نقصانات کی خانہ پوری کرنے کے پیش نظر جو انہیں کلیسا کے دو اقتدار میں پہنچے تھے سرے سے خدا کے منکر ہو گئے۔ ممکن ہے کہ نیچرل سائنس کے ماہرین میں اکثر کا مقصد پوپ اور پادریوں کے بیہودہ تعلیمات کو بے اثر بنا کر علوم و فنون کی نشر و اشاعت کرنا ہو۔ لیکن بعد میں متعصب اور جاہ پرست مادہ پرستوں نے اس مخالفت کو تمام آسمانی مذاہب کے بے اصل ہونے کا آلہ کار بنا لیا۔ انہوں نے مذہب کو علم اور فلسفے کا مقابل قرار دے دیا۔ وہ اپنے طرفداروں کو مذاہب عالم سے بیز ارادہ متنفر بنانے کی بے پروا کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دس کے مادہ پرستوں کا اخبار مورخہ ۸ اکتوبر ۱۹۸۱ء رقم طراز ہے:

”کمیسونٹ پارٹی مذہبی امور کے بارے میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتی۔ وہ دینی رجحانات کے خلاف تمام پروپیگنڈوں کی سرپرستی کرتی ہے۔ کیوں کہ ہماری جماعت علم کی طرفدار ہے اور مذہبی عقائد اس کے مخالف ہیں۔“



بنائیں سائنسداں طبیقے کی مذہب سے مخالفت کو اس بات کی دلیل نہ قرار دینا چاہیے کہ وجود خدا کا ثابت کرنا مشکل ہے کیونکہ ہم نے عرض کیا کہ ان میں سے ایک گروہ کی مخالفت کی غرض یہ تھی کہ وہ مسیحی راہنماؤں کے مقلدوں میں اقتدار حاصل کریں۔ دوسرے اس طبیقے کی مخالفت کی بنیاد تھی علوم طبیعیہ (Natural Sciences) کی نشر و اشاعت اور کلیسا کے یہودہ معتقدات کی مقبولیت کی روک تھام۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ انہی جدید علوم کے ماہرین میں بکثرت ایسے افراد موجود ہیں جو وجود خدا کے معتقد اور خدا پرستی کے انتہائی طرفدار ہیں۔ جو خود اس امر کی ایک بڑی دلیل ہے کہ پوپ کے مذہب سے اختلاف اصل مذہب اختلاف کا مترادف نہیں ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بعض سائنسدانوں کے وجود خدا کے متعلق خیالات نقل کر دیے جائیں۔

”تبدیل انواع“ (Transformisme) کے مشہور نظریے کے موجد ڈارون اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”صمیم العقل شخص کے لیے محال ہے کہ وہ کائنات میں یہ عجیب و غریب نظام اور ہم آہنگی دیکھنے کے بعد کہے کہ اس عالم کا کوئی خالق نہیں ہے۔“

(ارتباط انسان — جہان ج ۱ ص ۱۱۲۶)

اس صدی کے مشہور ریاضی داں آئن اسٹائن (Einstein) کے خیالات

ملاحظہ ہوں:

”مذہبی احساس علمی تحقیقات کا نہایت طاقتور اور معزز سرچشمہ ہے۔ میرا مذہب یعنی ایک بلند ترین۔ غیر محدود اور غیر مادی ذات کی نارسا اور ناقابل اعتنا ستائش وہ ذات کہ جو خود اپنے کو نمایاں کرتی ہے تاکہ ہم اپنے کمزور مشاعرے کے ذریعہ اس کا ادراک کر سکیں۔ میرے باطنی عمیق ایمان اور خدا کے



متعلق میرے عقیدے کی تشکیل وہ بلند یا شعور عدالت کرتی ہے۔ جس نے اپنے  
کو ناقابل ادراک جہان میں ظاہر کیا ہے۔ ”جہان در کتر انیشتین“  
اسی مشہور دو زبان شخص نے ایک دوسری جگہ یہ گراں قدر الفاظ کہے ہیں:  
”اس پر اسرار عالم وجود میں جس کی اکثر و بیشتر چیزوں سے ہم واقف ہیں ضرور  
یا ضرور ایک صاحب عقل و اقتدار ذات موجود ہے۔ اس کی دلیل یہی عالم  
اور اس کے موجودات ہیں“ (حوار بین الالہامین والمارین)

یہ غلط تعارف کا نتیجہ ہے | مبداء وجود اور خالق کائنات کی حیثیت سے عیسائی راہ نمائوں  
نے لوگوں سے جس خدا کا تعارف کرایا تھا وہ نہ صرف نیچرل سائنس (Natural  
Sciences) کے ماہرین کے لیے وحشت محسوس کرنے کا سبب تھا بلکہ کوئی  
صاحب عقل جس نے فات کے متعلق کچھ غور و خوض کیا ہو اسے ماننے کے واسطے تیار نہیں ہو سکتا  
تھا۔ ان کا پیش کیا ہوا خدا کسی معمولی چیز کے پیدا کرنے کے قابل نہ تھا۔ چہ جائیکہ اس  
عالم وجود کے گہرے نظم و نسق کو اس کے وجود کا پر تو قرار دیا جائے۔

کیا جو خدا کھائے، پیے۔ سوئے۔ ٹہلے کیشتی رٹے۔ خلاصہ یہ کہ ایک جسم کی تمام  
خصوصیات رکھے۔ سر سے پیر تک محتاج ہو۔ جس میں تمام مذموم صفات جہل، غصہ، حسد،  
بخل وغیرہ موجود ہوں، انسان کی پرستش کے لائق ہے؟ ہرگز ایک سائنسدان تسلیم  
نہیں کر سکتا کہ ایسی باتوں اور کمزور ہستی عالم کے ان عظیم اور حیرت انگیز آثار کی خالق ہو۔  
ممکن ہے کہ کوئی پوچھے کہ یہ غلط تعارف کہاں کرایا جا رہا تھا؟ اسی جگہ جہاں  
سائنسدان اور موجدین زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسی جگہ جہاں وہ مسلسل علمی تحقیقات  
میں مشغول تھے۔ اسی جگہ جہاں مذہبی اعتقادات کا خزانہ تحریف شدہ توریت و انجیل  
تھی جو اسی قسم کے مزخرفات بلکہ ان سے بدتر باتوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہاں مذہبی  
حقائق اور خدا پرستوں کے صحیح عقائد تک پہنچنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا وہی بات ہے،



کہ ایک پڑھا لکھا آدمی مذکورہ بالا صفات سے متصف خدا کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ ضرور بالفور کسی نہ کسی طرح وہ اپنا اور دوسرے لوگوں کا اس عقیدے سے پچھا چھڑانے کی کوشش کرے گا۔

کیا برا ہے کہ یہاں چند جملے نمونے کے طور پر عیسائیوں اور یہودیوں کے ذات خدا کے متعلق عقائد کے نقل کر دیے جائیں۔ ان کے پیش نظر ہونے کے بعد واضح ہو جائے گا کہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ ایک سائنسدان ایسے خدا پر ایمان نہ لائے۔

۱۔ توریت کی کتاب "پیدائش" کے تیسرے باب کی آٹھویں آیت میں یہ پڑھتے ہیں: "اور انھوں (آدم و حوا) نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی اور آدم اس کی بیوی نے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا تو کہاں ہے؟"

اس آیت میں خداوند عالم کو انسان کے مانند قرار دیا گیا ہے کہ وہ بھی صبح تازہ ہوا کھانے کے لیے ٹھہلتا ہے۔ وہ ایسی باتوں سے بھی بے خبر ہے جو چند قدم کے فاصلے پر گزر رہی ہیں۔

۲۔ توریت کی اسی کتاب "پیدائش" کے تیسرے باب کی چوبیسویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"اور یعقوب اکیلارہ گیا اور پوچھنے کے وقت تک ایک شخص وہاں اسے کشتی لٹاتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اس پر غالب نہیں ہوتا تو اس کی مان کو اندر کی طرف چھوڑا اور یعقوب کی نس اس کے ساتھ کشتی میں چڑھ گئی۔ اور اس نے کہا مجھے جانے دے کیونکہ پوچھٹ چلی۔ یعقوب نے کہا کہ جب تک تو مجھے برکت نہ دے میں تجھے جانے نہیں دوں گا۔ تب اس نے پوچھا کہ

نیرا کیا نام ہے؟ اس نے جواب دیا یعقوب۔ اس نے کہا تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔ تب یعقوب نے اس سے کہا کہ میں تیری منت کرتا ہوں۔ تو مجھے اپنا نام بتا دے۔ اس نے کہا کہ تو میرا نام کیوں پوچھتا ہے؟ اور اس نے اسے وہاں برکت دی اور یعقوب نے اس جگہ کا نام فنی ایل رکھا اور کہا کہ میں نے خدا کو رو برو دیکھا تو بھی میری جان بچی رہی۔“

اس آیت کے بیان کے مطابق سرشام سے صبح تک خدا یعقوب سے کشتی لڑتا رہا جب صبح ہونے لگتی تو بڑے اصرار کے ساتھ ان کے چنگل سے جھٹکا را پاتا ہے یعقوب سے کشتی میں خدا ہار جاتا ہے!

۳۔ سفر خروج کے چوبیسویں باب کی نویں آیت میں ہے:-

”تب موسیٰ اور ہرون اور ندب اور ابیہوا اور بنی اسرائیل کے ستر بزرگ اور گئے۔ اور انھوں نے اسرائیل کے خدا کو دیکھا اور اس کے پاؤں کے نیچے نیلم کا چبوتر اٹھا جو آسمان کے مانند شفاف تھا اور اس نے بنی اسرائیل کے شرفار پر اپنا ہاتھ بڑھایا، سنا انھوں نے خدا کو دیکھا اور کہا یا پیا!“ اس آیت میں آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ بنی اسرائیل کے خدا کو دیکھنے اور اس کے کھا لینے یا اپنے کھانے پینے کا اس کے مہمان کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے:

۴۔ کتاب پیدائش کے چھٹے باب کی دوسری آیت میں ہے:-

”تو خدا کے بیٹوں نے آدمی کی بیٹیوں کو دیکھا کہ وہ خوبصورت ہیں اور جن کو انھوں نے چنا ان سے بیاہ کر لیا۔“

اس آیت میں صریحاً کہا جا رہا ہے کہ خدا کے بیٹے ہیں۔ وہ ان کا باپ ہے۔ پھر ان کے جذبات ایسے بے قابو ہیں کہ وہ لوگوں کی لڑکیوں کو دیکھ کر فوراً عاشق ہو جاتے ہیں!



۵۔ اسی سفر کے گیارھویں باب کی پانچویں آیت ہے :

”اور خداوند اس شہر اور برج کو جسے بنی آدم بنانے لگے دیکھنے کو اترا“

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کو اپنے بندوں کی ہزنائیاں دیکھنے کا شوق ہے۔

اسی غرض سے اس نے زمین اور آسمانوں کی طولانی مسافت طے کی۔!

یہ ”مشتے نمونہ از خردارے“ کے طور پر ان کتابوں کی بعض عبارتیں ہیں جنہیں منزل من اللہ کہہ کر پیش کیا جا رہا تھا۔ یہ یہود و نصاریٰ کے خدا کا حلیہ جس میں جہالت کمزوری تمام انسانی صفات کا نقشہ نظر آ رہا ہے۔

انتہائی واضح بات ہے کہ کسی سائنس دان کا کیا ذکر ہر سنجیدہ فہمیدہ تعلیم یافتہ شخص کی سطح ذہن اس سے بالاتر ہے کہ وہ ان موهومات کی گردیدہ ہو۔ وہ شخص ایسے خدا کو ہرگز اس وسیع اور عظیم الشان عالم کا خالق اور کائنات کے حیرت انگیز اسرار و رموز کا موجد نہیں مان سکتا۔ ظاہر ہے کہ صحیح مذہبی عقائد سے ناواقفیت کی صورت میں لوگوں کا لمحہ اور منکر خدا ہو جانا لازمی ہے۔

۲۔ معقول طرز فکر | معاف کیا جائے سائنسدانوں کے اندازِ فکر کو بھی مذہب اور خدا کے روگردان بنانے کا سبب قرار دیا جاسکتا ہے۔ یرپ کے علمی انقلاب (Reno-essence) نے ان کے سوچے کا ڈھنگ بالکل بدل دیا عقلی استدلال کی جگہ تجربے اور آزمائش نے لے لی تعلیم یافتہ طبقے کی نظر میں بس ایسے مسائل کی وقعت رہ گئی جن کا تعلق احساس اور آزمائش سے ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے مسائل جنہیں خالص عقلی غور و خوض سے حاصل کیا جاسکتا ہے اہل علم نے ان کی بابت گفتگو اور بحث کرنا بے فائدہ سمجھ لیا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس نیچرل مادی دنیا میں نامعلوم چیزوں کا پتہ چلانے کا بہترین راستہ مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ قدیم یونان میں نیچرل سائنس (Natural Science)

کے کچھ زیادہ نہ سمجھنے پھٹنے کی وجہ سے شاید یہی ہے کہ اس زمانے کے اہل تحقیق کو مشاہدے اور تجربے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان کے نزدیک ارسطو کی کسی کتاب کا ایک ورق بڑھ ڈالنا دسوں تجربات سے بہتر تھا۔ حالانکہ علمی انقلاب کے بعد نیچرل سائنس نے قابل لحاظ ترقی کی۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ ہماری صرف ایک صدی میں انسان کے ایجادات اور اکتشافات کی تعداد گزشتہ زمانے کے مجموعی ایجادات کے کم از کم برابر کہی جاسکتی ہے اس کا موجب یقیناً تحقیق اور ریسرچ کے ڈھنگ کی تبدیلی ہے۔

مشاہدے اور تجربے سے گرویدگی نے اگرچہ نیچرل سائنس کے مسائل میں انھیں بہت آگے بڑھا دیا، لیکن اسی نے انھیں خالص عقلی مسائل سے بدگمان بھی کر دیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اہل علم کے دماغوں میں یہ خیال پیوست ہو گیا کہ حقیقتوں تک پہنچنے کا واحد راستہ مشاہدہ اور تجربہ ہے۔

واقعہ رہے کہ انسان کی دماغی طاقت جس شعبے میں زیادہ صرف کی جائے گی اس میں وہ زیادہ ماہر اور کارگر ہو جائے گی۔ ایسے شخص کی نظر میں تمام دنیا کے مسائل سمٹ کر اسی شعبے کے دائرے میں آجائیں گے جس کا وہ ماہر ہے۔

شاید یہی راز تھا کہ فلکیات کے گزشتہ ماہرین دنیا کے تمام حوادث و واقعات کو ستاروں کی مختلف حالتوں کا نتیجہ سمجھتے تھے بالکل اسی طرح جیسے اس زمانے کے سیاستدان ہر چیز کی نسبت سیاسی اسباب کی طرف دیتے ہیں۔ کمیونزم کے طرفدار تمام سماجی، علمی، ہنری، فلسفی اور سیاسی امور کو اقتصادیات سے وابستہ قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک عالم وجود کے ہر حادثے کو اپنے مسلک کے مطابق اپنے نظریات پر منطبق کرنا چاہتا ہے۔

سائنسدانوں کا طبقہ چونکہ اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں کو علومِ حسیہ کے شعبے میں صرف کرتا ہے۔ چونکہ وہ ہر چیز کو انہی علوم کے معیار پر جانچتا ہے اس لیے وہ ایسی چیزوں سے



اجنبیت محسوس کرتا ہے جو غیر محسوس ہیں۔ ایسے امور کے سلسلے میں وہ ان کا بنوع فکری کام نہیں کرتا۔ غیر محسوس۔ غیر مادی چیزوں کا تصور ان کے واسطے دشوار بلکہ محال ہو جاتا ہے حالانکہ تصور محال محال نہیں ہے۔ ایسا ان کی زبان پر برابر آتا رہتا ہے کہ ایسی چیزوں کا تصور غیر ممکن ہے جو زمان و مکان کے حدود سے باہر ہوں۔

یہ مسلم ہے کہ جس خدا نے مادے اور زمان و مکان کو پیدا کیا ہے وہ یقیناً زمان و مکان اور مادے سے بالاتر ہے: علوم طبیعیہ کے آلات (Natural Sciences) و وسائل سے اس کا ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ بنیادی طور پر یہ امید ہی نہ رکھنا چاہیے کہ غیر حسی حقیقتیں محسوسات کی ترازو میں تولی جاسکیں گی۔ جو چیز مادے اور مادیات کے دائرے سے باہر ہے اُسے عام مادے کی عینک سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اصل ایک علم کا معیار دوسرے علم کے لیے رتی بھر مفید نہیں ہے۔ علوم طبیعیہ اور طب پر ایک کا ایک خصوصی مستقل معیار ہے جس پر دوسرے علوم کے مسائل کو نہیں جاسنجا جاسکتا۔

بنا بریں وہ دماغ کہ جن کی کارگزاری کا محور فقط نیچر اور محسوسات ہوں وہ مابعد طبیعیہ امور کا تصور تک نہ کر سکیں گے۔ یقیناً اس خدا سے بے خبر رہیں گے جس نے نیچر اور مادے کو پیدا کیا ہے۔ ایسے ذہن ہمیشہ آرزو کرتے رہیں گے کہ خدا کو کبھی تجربہ گاہوں اور لیبارٹریوں میں دیکھیں۔ اپنے مخصوص آلات سے ان کی خصوصیات کا کبھی پتہ چلا لیں۔ علوم طبیعیہ کے بعض ماہرین کے ذہنوں پر فلسفہ حسی اس طرح چھا گیا۔ وہ اسے ایسے متاثر ہو گئے کہ انھوں نے تجربے اور آزمائش کو جو صرف مادی علوم کا ایک وسیلہ ہے ان علوم کے دائرے سے نکل کر تمام انسانی علوم کے صحت و سقم کا معیار قرار دے دیا۔ بلاشبہ سوچنے کا یہ ڈھنگ احساس و آزمائش کے دائرے سے باہر دنیا سے نیچر کے ان ماہرین کو روشناس نہیں بنا سکتا۔ یہ طرز تفکر نہایت نخوت اور غرور کے ساتھ ایک سائنسدان

کی زبان سے یہ الفاظ کھلوا دے گا۔

”جب تک خدا کو اپنے آپریشی کے چاقو کے نیچے نہیں دیکھ لوں گا اس کے وجود کا اقرار نہیں کروں گا!“

پولیٹسر نے اپنی کتاب ”اصول مقدماتی فلسفہ“ میں لکھا ہے:

”ایسی چیز کا تصور محال ہے جو زمان و مکان میں نہ ہو۔ جو تغیر و تبدل سے محفوظ ہو!“

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس طرح کے فقروں میں ان کے طرز فکر کی جھلک ہے بلکہ مکمل عکاسی ہے۔ یہ فقرے بتاتے ہیں کہ ان لوگوں کی ذہنی طاقتیں بس محسوسات کی آزمائشوں میں کام آتی ہیں۔ ان کے علاوہ تجربے اور آزمائش کے حدود سے باہر چیزوں کے سلسلے میں ان کا وجود اور عدم برابر ہے۔ قدرتی طور پر جوہور ان کی ذہنی کارگزاری سے دور ہیں جیسے خدا۔ روح و جان کے لیے قابل ادراک نہیں ہیں۔

واقعاً ایک خدا شناس آدمی کے واسطے یہ کتنا حیرت انگیز ہے کہ کوئی مادہ پرست کہے کہ ”جب تک خدا کو آپریشی کے چاقو کے نیچے نہیں دیکھ لوں گا اس پر ایمان نہیں لاؤں گا“ اسی طرح یہ فقرہ بھی انتہائی قابل تعجب ہے کہ ”مذہب اصول علمی کے موافق نہیں ہے“ ایسا ہی ہے کہ کوئی کہے کہ جب تک کینسر اور ملیریا کے جراثیم کو ”ضرب تقسیم“ کی مدد سے معلوم نہیں کر لوں گا انھیں نہیں تسلیم کروں گا!!

حقیقی فلسفے اور فلاسفہ کا فقدان | یورپ کی علمی تحریک (Renoessence)

نے لوگوں کے خیالات اور نظریات کا زمین آسمان بدل دیا۔ ہر بات کا اچھی طرح جائزہ لیا گیا۔ نظر ثانی کی گئی۔ لیکن شاید ہم مشرقی لوگوں کا احساس کمتری اس حقیقت کا اقرار نہ کرنے دے کہ یورپ اس عظیم علمی تحریک کے بعد بھی کسی ایسے مکتب فلسفی کا مالک نہیں ہو سکا جو وجود خدا اور دوسرے مذہبی مسائل کے سلسلے میں ذہنی یکسوئی اور اطمینان کا



سامان فراہم کر سکے۔ اس علمی تحریک کی عمر اس وقت کئی سو برس ہو چکی ہے۔ لیکن اب بھی یورپ کے پاس نہ فلسفہ ہے اور نہ فلسفی۔ وہاں کے لوگوں کے دماغوں میں بھی مذہبی باتوں کے بارے میں شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی مکتب فلسفی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی جگہ باقی رہ جاتے ہیں اور ان کے دور ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا قطری نتیجہ یہ ہے کہ لوگ مذہب سے دور ہوتے جائیں۔ وہ خدا اور تمام غیر مادی چیزوں کا انکار کر دیں۔ اس کا شاہد یہ ہے کہ یسپ کی مشہور آفاق شخصیتوں کے خدا اور دوسرے مذہبی ائمہ کے متعلق اقوال کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فلسفہ کی الف۔ بے سے بھی واقف نہیں تھے۔ ناظرین اس جسارت کو معاف کریں لیکن ناچیز کے معروضات کو ٹھنڈے دل سے ملاحظہ فرمائیں۔

یہلا شاہ | کانٹ (Kant) کی علمی شخصیت سے کون واقف نہیں ہے لیکن اس علمی عظمت کے باوجود خدا کے بارے میں انہوں نے جس طرح اظہار خیال کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا فلسفہ دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ ان کا قول ہے:

”سائنس نے نیچر کے باپ کو اپنے کام سے معزول کر دیا۔ اسے گوشہ نشین بنا دیا۔ دراصل ایک اس نے اس کے وقتی اور عارضی خدات کی قدر کی۔“

(خدا اور طبیعت)

کانٹ (Kant) اگرچہ کچھ مادہ پرست شخص اور کلیسا کے سخت مخالف تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے مذکورہ بالا الفاظ سے کلیسا کی خیالات اور عقائد کی بوجھل ہے۔ باپ اور بیٹے کا مسئلہ کلیسا کے تعلیمات کا جزو ہے۔ کانٹ نے انہی لفظوں کو خدا اور نیچر کے لیے صرف کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی خدا شناسی کا معیار بس یہ ہے جس کا ان کے الفاظ سے پتہ چل رہا ہے کہ وہ خدا کو بھی دوسرے نیچرل اسباب کی لائن میں سمجھتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ نیچرل اسباب رفتہ رفتہ سہی پہچان لیے جاتے ہیں۔ لیکن خدا انہی جیسا ہونے

کے باوجود انتہائی پراسرار ہے اس کے چہرے سے ابہام کی نقاب کبھی نہیں سرتی ہے۔  
خدا کی نوعیت کے بارے میں کانٹ کے اس تصور کی تائید ان کے اس فقرے سے  
بھی ہوتی ہے کہ سائنس نے باپ کے خدمات کی قدردانی کرتے ہوئے اس سے معافی مانگ  
لی اور اسے اس کے کام سے علیحدہ کر دیا۔ صاف بات ہے کہ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ  
کانٹ کے نزدیک خدا بھی ایک ایسا سبب ہے جس کا تعلق اسی نیچر سے ہے۔ زیادہ سے  
زیادہ بھول اور مبہم ہے کیونکہ اگر یہ بات نہیں ہے تو موجودات عالم کے مادی اور نیچرل  
اسباب کا پتہ چل جانے کے بعد اسے اس کی خدمات سے سبکدش اور ریٹائرڈ کرنے کی  
کیا ضرورت ہے اس کے واسطے اب کوئی جگہ باقی نہ رہنے کے کیا معنی ہے

کانٹ کی یہ بات گواہی دے رہی ہے کہ وہ خدا پرستی کی الف ب سے بھی واقف  
نہیں تھے ورنہ جتنا چاہے سائنس ترقی کرے۔ موجودات عالم کے نیچرل اسباب کا  
انکشاف ہو ہرگز ہرگز، کبھی اور کہیں خدا استغنیٰ نہیں دے گا۔ وہ اپنے بلند اور انفسرادی  
درجے سے نیچے نہیں اترے گا۔

کانٹ نے قطعاً یہی خیال کیا ہے کہ خدا نیچر کا ایک جز ہے۔ وہ بھی دوسرے مادی  
اسباب کی قطار میں ہے۔ یہ تمام مادی موجودات۔ یہ تمام عدم سے وجود میں آنے والی چیزیں  
براہ راست اس کے ارادے اور اقتدار کے اثرات ہیں۔ یہ بارشیں، یہ برف باریاں۔ یہ بھول  
یہ کونسلیں، یہ بیماریاں، یہ تندرستیاں، یہ سیلاب، یہ آندھیاں، خدا کے علاوہ کسی نیچرل  
علت کی مرہون منت نہیں ہیں۔ صرف اس کی ذات کے یہ آثار ہیں۔ یقیناً ان مادی  
موجودات اور عدم سے وجود میں آنے والی چیزوں کے بارے میں اس طرح کا تصور اسی  
نتیجے تک تھا پہونچا دے گا جس تک کانٹ کا دماغ پہنچا ہے۔ بے شک جبکہ دنیا کے موجودات  
اور پیش آنے والے حوادث و واقعات کے نیچرل اسباب معلوم ہو گئے تو ایسے خدا سے ضرور  
استغنیٰ طلب کر لیا جائے گا۔ اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ کیونکہ ہمیں اس طرح کے



نیچر پر اثر انداز سبب کی احتیاج اس صورت میں تھی کہ جب حقیقی اور واقعی اسباب کا پتہ نہیں چلا سکتا لیکن جبکہ انسان اپنی علمی کاوشوں کے نتیجے میں ان موجودات اور واقعات و حوادث کی مادی علتوں سے آگاہ ہو چکا ہے۔ جبکہ وہ اس بات کو جان گیا ہے کہ کچھ نیچرل مادی امور ہیں جو تندرست لوگوں کو بیمار بنادیتے ہیں۔ انہیں بخار آ جاتا ہے اور وہ بید کی طرح تھک تھک کانپنے لگتے ہیں۔ وہی کبھی آسمان سے پانی اور کبھی برف برساتے ہیں۔ انہی کے اشارے سے درختوں میں کونسلیں پھوٹتی اور کھوپل پھل پیدا ہوتے ہیں۔ وہی براہ راست آندھیاں لاتے، طوفان اٹھاتے ہیں تو اب ان چیزوں کے سلسلے میں خدا کی کیا ضرورت رہ جائے گی؟ وہ اسباب و علل کی لائن سے نکل جائے گا۔ کوئی سبب نامعلوم نہیں رہے گا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ اس خدا کے ہاتھ میں کوئی عہدہ۔ اس پر کسی قسم کی ذمہ داری نہیں رہ جائے گی۔

بے ادبی معاف۔ خدا کے بارے میں سوچنے کا یہ ڈھنگ معرفت خدا کے اصول سے کانٹ کے نادائق ہونے کا نتیجہ ہے حقیقت یہ ہے کہ خدا ایک ایسا موجود ہے جو زمان و مکان سے بالاتر ہے۔ وہ مادے کا بھی پیدا کرنے والا ہے اور تمام ایسی چیزوں کا بھی جو عدم کے بعد وجود میں آئی ہیں۔ اس کی جگہ ہرگز نیچرل اسباب کی صف میں نہیں ہے۔ وہ نیچر کا خالق ہے۔ وہ تمام اسباب و مسببات اور پورے عالم ہستی کا منظم کرنے والا ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے وہ اس کے وجود کا فیض۔ اس کے ارادے کا طفیل ہے۔ ہرگز ہرگز یہ صحیح نہیں ہے کہ اس کو ان نیچرل اسباب و مسببات کے درمیان ڈھونڈا جائے یا اُسے مادی علتوں کا جانشین فرض کیا جائے۔

اس بنا پر برابر سائنس ترقی کرتا رہے۔ عدم سے وجود میں آنے والی تمام چیزوں کے اسباب کا انکشاف ہوتا رہے۔ اس کا خدا کی الوہیت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا بلکہ اس کے وجود کے ضروری ہونے کی بابت انسان کا ایمان اور عقیدہ پختہ سے پختہ تر

مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جائے گا کیونکہ اس دنیا کا حیرت انگیز نظام - علت و معلول کا یہ طویل سلسلہ بے شعور مادے کی کارگزاری کا نتیجہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس عالم کی پشت پر کوئی عظیم الشان عقل کوئی صاحب اقتدار ہستہ ہونا چاہیے جو بے جان مادے کو جاندار بنائے اس کے اجزاء کو مرتب اور منظم قرار دے۔

دوسرا شاہد | برٹنڈرسل (Bertrand Russell) نے مادہ پرستی اور انکار خدا کی طرف اپنے میلان اور رجحان کا غدر تراشتے ہوئے لکھا ہے :

”میں جوانی میں خدا کو ماننا اور مذہب کی حقانیت کا عقیدہ رکھتا تھا“ اور وجود خدا کے ثابت کرنے کے لیے بہترین دلیل علتہ العلل کے برہان کو سمجھتا تھا جس کی توضیح یہ ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز کے وجود کی کوئی علت ہے۔ اگر علتوں کو اس زنجیر کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں تو آخر میں سب سے پہلی علت تک پہنچ جائیں گے۔ اسی کا نام خدا رکھ لیا گیا ہے لیکن بعد کو بالکل میرا عقیدہ بدل گیا کیونکہ میں نے سوچا کہ اگر ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی علت ہوتا ضروری ہے جو اسے پیدا کرے تو پھر خدا کی بھی کوئی علت ہونا چاہیے جس نے اسے خلق کیا ہو“ (جرامن مسیحی میسٹرم)

برٹنڈرسل (Bertrand Russell) نے وجود خدا کے عقیدے سے اپنی روگردانی کا جو سبب بتایا ہے وہ بالکل ان سامنے کے اعتراضات میں سے ہے جو مادیین کی طرف سے خدا پرستوں پر کیے جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ برٹنڈرسل اپنے بڑھاپے میں اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ رسل نے خیال کیا ہے کہ اگر وہ خدا پرستی چھوڑ کر مادہ پرستی اختیار کر لیں تو انھیں اس اعتراض سے چھٹکارا مل جائے گا۔ حالانکہ جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے اس کی زد پر خدا پرست اور مادہ پرست دونوں یکساں طور سے ہیں۔



کیونکہ وہ ہوبہو یہی اعتراض مادہ پرستوں پر بھی ہوتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس دنیا میں جو گونا گوں موجودات دکھائی دے رہے ہیں جو طرح طرح کی شکلیں اور صورتیں نظر آرہی ہیں وہ سب مادے کی کار فرمائی ہے۔ یہاں بھی یہ سوال ابھرتا ہے کہ پھر مادے کی علت کون ہے؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ تمام چیزوں کو مادے نے پیدا کیا ہے۔ لیکن مادے کو کس نے پیدا کیا ہے؟

حسن اتفاق سے برٹرنڈ رسل اور ہم دونوں ایک کشتی پر سوار ہیں۔ اس بات میں مادہ پرست اور خدا پرست دونوں ایک دوسرے کے شریک ہیں کہ ایک ایسی چیز کو ماننا چاہیے جو قدیم و ازلہ ہو۔ وہ خالص علت ہی علت ہو۔ معلول معلول نہ ہو۔ نرمی خالق ہی خالق ہو۔ مخلوق نہ ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس طرح کی چیز کا نام خدا پرستوں کے درمیان ”اللہ“ ہے اور مادہ پرستوں کے درمیان ”ایٹم“، ”نیچر“ خلاصہ یہ کہ کوئی مکتب فکر بھی ہوا سے انتخاب کرنے کے بعد اس سے چٹکارا نہیں ہو سکتا کہ کسی ایسے موجود کا قائل ہوا جائے جو قدیم اور ازلہ ہو۔ اپنے وجود میں کسی دوسرے کا مرہون منت نہ ہو۔ اب ایسا کس طرح ہوا کہ یہ معمولی سا اعتراض برٹرنڈ رسل کے مذہب اور خدا پرستی سے روگردانی کا موجب بن گیا؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب خود ہی دے سکتے تھے۔

اس غفلت اور علمی چوک سے زیادہ قابل تعجب کسی چیز کے محتاج علت ہونے کے بارے میں ان کا نظریہ ہے۔ انھوں نے یہ خیال کیا ہے کہ کسی چیز کو علت اور سبب کی ضرورت اس لیے باقی ہے کہ وہ وجود کی صفت سے متصف ہے۔ اس لیے برٹرنڈ رسل نے فوراً نتیجہ نکال لیا کہ چونکہ خدا بھی موجود ہے لہذا وہ بھی علت کا محتاج ہے۔ لیکن اتنا عظیم شخص اس بنیادی نکتے تک نہیں پہنچ سکا کہ کسی چیز کے محتاج علت ہونے کی وجہ صفت وجود سے متصف ہونا نہیں ہے۔ یعنی اگر یہ پوچھا جائے کہ کوئی بھی چیز کسی علت اور سبب کی محتاج کیوں ہوتی ہے؟ تو اس کے جواب میں یہ کہنا غلط ہے کہ موجود ہونے کی وجہ سے، کیونکہ وہ ابھی

موجود تو ہے ہی نہیں۔ ابھی اس کی صفت افعال عدم ہے علت کی طرف وہ محتاج کسی ایسے پہلو اور رخ سے ہوگی جو معدوم ہونے کے باوجود اس میں پایا جائے۔ وہ پہلو اس چیز کا ممکن ہوتا ہے چونکہ موجود اور معدوم ہونا اس کے لیے یکساں حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے دونوں پلوں میں سے کوئی جھکا ہوا نہیں ہے لہذا اسے جھکانے والا کوئی ہونا چاہیے۔

بے شک کسی چیز کے ممکن ہونے کا پتہ آسانی اس صورت میں چل جاتا ہے جب وہ عدم سے وجود میں آئے۔ معدوم ہو کر موجود ہونا بتاتا ہے کہ خود اس کی ذات اپنے وجود کا سرچشمہ نہیں ہے۔ ذاتی طور پر اس میں وجود کا تقاضا نہیں پایا جاتا ہے لیکن جو ہستی واجب الوجود قرار دی گئی ہو، جو ذاتی طور پر وجود کی مقتضی ہو۔ جس کا پلہ وجود از خود جھکا ہوا مانا گیا ہو جواز لی اور ابدی ہو۔ جو عدم سے وجود میں نہ آئی ہو بلکہ ہمیشہ سے موجود ہو۔ جس کے دامن میں زاد جو دی وجود ہو وہ اپنے موجود ہونے کی وجہ سے علت کی محتاج کس لیے ہوگی۔ چونکہ اس کے لیے ذاتی طور پر موجود ہونا ضروری ہے اس لیے کبھی وہ معدوم نہیں ہوگی۔ اس کے پاس تو از خود سب کچھ موجود ہے اس کی جھولی میں کیا نہیں ہے جس کے حاصل کرنے کے واسطے وہ اپنے غیر کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ؟

اگر برٹریڈرسل کا دماغ اس باریکی تک نہیں پہنچ سکا تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ مدد و ریاضی۔ سائنس اور سماجیات کے ماہر تھے۔ مذہبی اور فلسفی مسائل میں انھیں مہارت حاصل نہیں تھی۔ ان کا دماغ ان کی بابت زیادہ گہرائی میں جا کر کچھ نہیں سوچ سکتا۔ ڈارون کی تھیوری [ڈارون (Darwin) نے پہلے پہل پودوں اور جانداروں کے ارتقاء اور نشو و نما کے بارے میں ایک ایسی انوکھی تھیوری دنیا کے سامنے پیش کی جس کا لوگوں کو سان گمان تک نہیں تھا۔ اس نے بعض سائنسدانوں اور ایسے اشخاص کو جنھوں نے الہیات کے بارے میں بھرپور محققانہ غور و خوض نہیں کیا تھا مادیت کی طرف مائل کر دیا۔ اس تھیوری کو ڈارون (Darwin) کے ذہن کی ایجاد کہنا اور سمجھنا خلاف



حقیقت ہے۔ اگرچہ اسے نہ بھی مانا جائے کہ قدیم یونان کے بعض مفکرین کا یہی عقیدہ تھا تو یہ بات یقینی ہے کہ ڈارون سے پہلے لامارک (Lamarck) نے اس تھیوری کو پیش کر دیا تھا۔ ڈارون کی یہ خوش قسمتی تھی کہ انھوں نے یہ نظریہ ایسے ماحول اور زمانے میں پیش کیا کہ جب علمی دنیا پورے طور پر اس کو ماننے کے لیے تیار تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب ”اصل الانواع“ چھاپ کر یورپ کے علمی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ حالانکہ ڈارون (Darwin) اپنی زندگی کے آخری لمحے تک خدا کے قائل رہے لیکن دشمنان مذہب نے ان کے ڈانوا ڈول نظریے سے دو طرح مذہب کے خلاف فائدہ اٹھایا ہے۔

۱۔ خواہ یہ مانا جائے کہ موجودات عالم رفتہ رفتہ ترقی کر کے اپنی منزل کمال تک پہنچے ہیں اور خواہ یہ تسلیم کیا جائے کہ یکبارگی ان کی رسائی اس نقطے تک ہو گئی ہے پھر حال عیسائیوں کی مذہبی کتاب کے مضامین سے ٹکراتا ہے مختلف حیثیتوں سے غلط ہے۔

الف:- اقسام موجودات کے تغیر و تبدل کا نظریہ ابدی اور جاودانی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ خواہ ان تبدیلیوں کو تدریجی مانا جائے اور چاہے دفعتاً، یکبارگی۔ اسی لیے ڈارون کے بعد اگرچہ اسے مختلف طرح بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ہر صورت مسترد کر دی گئی ہے۔ جہاں تک ڈارون کا تعلق ہے وہ تدریجی ارتقاء کے قائل تھے ان کے نظریے کی عمارت چار ستونوں پر بلند ہوئی تھی جنہیں مسمار کر دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانے کا کوئی سائنسدان ڈارون کا طرفدار نہیں ہے۔ البتہ موجودات کے یکبارگی ترقی کرنے کے اس زمانے میں بھی بہت سے سائنسدان قائل ہیں۔

اس نظریے کے ابدیت اور دوام سے محروم ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ڈارون سے پہلے اور ان کے بعد ارتقاء انواع کے بارے میں گونا گوں اور مختلف طرح سے اظہار خیال کیا جاتا رہا ہے۔ ارباب نظر کا دماغ کسی جگہ پر رکا نہیں ہے۔ اس کی دلیل لامارکزم

(Lamarckism) کے بعد نیو لامارکزم (New Lamarckism) اور ڈارون ازم (Darwinism) کے بعد نیو ڈارون ازم (New Darwinism) کا وجود میں آتا ہے۔ آخری تبدیلی وہ ہے جس کا نام میوٹیشن (Mutation) رکھا گیا ہے۔

ابھی نہیں کہا جاسکتا کہ ارتقائے انواع کا نظریہ اور کتنے اٹے پلٹے کھائے گا۔

ب: مسیحیت کی مذہبی کتاب میں کوئی ایسی پرزور تصریح موجود نہیں ہے جسے اس کے ظاہری معنی سے نہ ہٹایا جاسکے۔ جب کسی پست درجے سے ترقی کر کے انسان کا موجودہ شکل و صورت اور خصوصیات تک پہنچنا ناقابل انکار اور بدیہی مسئلہ بن جائے گا اس وقت موقع آئے گا کہ مذہبی کتابوں کے مضامین کو ایسے سانچے میں ڈھالا جائے کہ وہ نظریہ ارتقا سے نہ ٹکرائیں۔ کیونکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت اور اس کے وجود کے ابتدائی سرچشمے مٹی کے درمیان بہت سی منزلیں ہوں جن کو خاص وجہ ملحوظ رکھتے ہوئے نہ بیان کیا گیا ہو۔ چونکہ اس حقیقت کے سمجھنے کی قابلیت لوگوں میں نہ تھی اس لیے آسمانی کتابوں نے ان درمیانی منزلوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ج: یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ نظریہ ارتقا آدمی کا حیوانیت سے انسانیت تک پہنچنا اگر یقینی طور پر صحیح ثابت ہو جائے تو اس سے پس یہ پتہ چلتا ہے کہ آسمانی کتابیں ایسی چیز نہیں ہیں جن میں کوئی خلاف حقیقت بات نہ ہو۔ لیکن اس سے ہرگز ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خدا موجود نہیں ہے۔ اگر اس کا وجود یقین اور دلیلوں کے ذریعہ ثابت ہو جائے تو اس سے محض اس لیے دست بردار ہونا صحیح نہیں ہے کہ آسمانی کتابوں کے مضامین اور نظریہ ارتقا کے درمیان تضاد اور تضاد ہے۔ ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ توریت اور انجیل کے نام کی کتابیں ہی سرے سے موجود نہیں ہیں یا ہم ایسے دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں کہ جب توریت اور انجیل نازل ہی نہیں ہوئی ہے۔



خلاصہ نہ استقلال انواع (Fixisme) کا نظریہ خدا پرستوں کے دلائل کا جز ہے اور نہ تبدیل انواع (Transformism) کا مسلک الحاد اور انکار خدا کے ادلہ میں سے ہے بلکہ یہ دونوں متضاد نظریے اثبات خدا کے دلائل و براہین کے لحاظ سے یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔

۲۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے دشمنان مذہب کے فائدہ اٹھانے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خدا پرست طبقہ اس کا وجود ثابت کرنے کے لیے موجودات عالم کے نظم و ضبط کو پیش کرتا ہے۔ یہ اُن کی انتہائی آسان اور عام فہم دلیل ہے۔ اس نظام کا اصلی نمونہ پودوں اور جانداروں میں بہت واضح طور پر نظر آتا ہے لیکن یہ نظام وجود خدا کی دلیل اس صورت میں قرار پاتا ہے جبکہ انسان اور جانور کی بابت یہ مانا جائے کہ وہ دفعتاً اور یکبارگی وجود میں آگئے ہیں۔ اس شکل میں یہ اچانک نمودار ہو جانے والا نظم و ترتیب اعلان کرتا ہے کہ کسی صاحب عقل و شعور سہی نے پورے ارادے اور اختیار سے انسان اور حیوان کو پیدا کیا ہے لیکن اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ڈارون کا نظریہ صحیح ہے کہ تمام پودے اور انسان و حیوان تدریجی طور پر نمودار ہوئے ہیں۔ لاکھوں برس کے اربوں کھربوں اتفاقات کے نتیجے میں اس عظیم الشان مکمل نظام کا ایک جز وجود میں آیا۔ پھر لاکھوں سال گزرے۔ اربوں کھربوں نسلیں وجود میں آ آ کے فنا ہوتی رہیں۔ یہاں کہ دفعتاً اس نظام کا دوسرا جز عالم وجود میں آ گیا۔ نظم و ترتیب کی انہی کڑیوں کے اکٹھا ہونے سے اچانک۔ دفعتاً موجودات عالم کی کوئی مرتبہ منظم قسم نمودار ہو گئی۔ اس صورت میں کائنات عالم کا یہ نظم و ترتیب وجود خدا کی دلیل نہیں بن سکے گا۔

اس غلط فہمی کے ازالے کی غرض سے عرض ہے کہ یہ درست ہے کہ بعض ایسے کالات اور مکمل تنظیمیں ہیں جن کا تدریجی طور پر نمودار ہونا کسی موجود کی کامیابی کا موجب ہوتا ہے۔ مثلاً بطنوں اور بعض اسی قسم کے دوسرے جانوروں کے پیروں کی انگلیوں کے درمیان

والی نازک کھال لیکن بعض اعضاء جسم اس طرح کے ہیں کہ وہ کسی جاندار کی اسی شکل میں فائدہ پہنچا سکتے ہیں جب ان کا ایک ایک ٹکڑا انہیں بلکہ وہ مجموعی طور پر وجود میں آئیں۔ مثلاً آنکھ، کان، معدہ، وغیرہ۔ ان میں سے ہر عضو بہت سے اجزاء سے مل کر بنا ہے۔ لیکن وہ مجموعی طور پر صرف ایک عدد کام انجام دیتا ہے۔ آنکھیں دیکھتی اور کان سنتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان اعضاء جسم کے مختلف نازک اجزاء خواہ تدریجی طور پر نمودار ہوں اور خواہ دفعتاً وجود میں آئیں وہ بہر حال یہ بتاتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے وجود کا ایک مقصد ہے۔ ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان اعضاء کے پائے تکمیل تک پہنچانے کی کوئی غرض ہے۔ اگر کوئی مقصد نہ ہوتا۔ کوئی غرض ملحوظ نہ ہوتی۔ اگر یہ ارتقاء کسی عظیم عقل و شعور کا نتیجہ نہ ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ چہرہ ہزاروں شکلوں کو چھوڑ کر اس شکل کا انتخاب کرے جو دوسرے اجزاء کی شکلوں کے ساتھ مل کر کسی مقصد کو پورا کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ نظریہ ارتقاء صرف یہی نہیں کہ انکار خدا کا موجب نہیں ہے بلکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ موجودات عالم کی راہنمائی میں کسی صاحب عقل و شعور طاقت کا ہاتھ ہے۔

ہمیں پہلی بات پھر دہرانا پڑ رہی ہے کہ جس دور میں موجودات عالم کے تدریجی ارتقاء کا مسئلہ یورپ والوں کی زبانوں پر بکھتا اگر وہاں فلسفے کا کوئی باقاعدہ اسکول ہوتا اور کوئی شخص حقیقی فلسفیانہ مذاق رکھتا تو وہ اس نظریہ ارتقاء سے وجود خدا ثابت کرنے کے سلسلے میں مکمل فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے یہ نظریہ انکارِ خدا اور مادہ پرستی کے رواج پانے کا سبب نہیں بن سکتا تھا۔

(باقی آئندہ)



# حکیم سنائی کے ایک ممدوح یعنی قاضی حسن بلخی

از آنسہ رضیہ اکیم۔ اے

حکیم سنائی (م۔ قبل ۵۴۵ھ) فارسی کے عظیم شاعر اور ادیب تھے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ممدوحین میں سلاطین اور امراء سے زیادہ علماء و فضلاء، قضاة اور دوسرے حضرات نظر آتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کا دیوان اس دور کی علمی اور مذہبی تحریکات کے سمجھنے کا بہت مستند ماخذ ہے انھوں نے اپنے زمانے کے ان تمام ممتاز علمی شخصیات کا تذکرہ کر دیا ہے جو کسی نہ کسی اعتبار سے مشہور اور معروف تھے۔ انہی میں سے قاضی القضاة حسن بلخی ہیں جن کے بارے میں ایک مختصر گزارش سطور ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

قاضی القضاة محمود الحسن بلخ کے قاضی تھے ان کا لقب نجم الدین تھا۔ وہ خاندان محمودی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ کا نام محمود تھا اور انھیں کی نسبت

۱۔ اسی خاندان سے متعلق ایک بزرگ قاضی امین سلطان ابراہیم غزنوی (۳۹۲-۵۰۹) کے زمانے میں غزنی کے قاضی تھے، ان کی مدح میں سنائی کا ایک قصیدہ ہے جس میں ان کے جود کا ذکر اس بیت میں ہے :

ای نبیرہ قاضی با محبت محمود آنک + بود چوں تو باک طبع و پاک دین و پارسا (دیوان سنائی ص ۴)

سے یہ خاندان محمودی کہلاتا ہے۔

ان کے بارے میں اب تک سوائے دیوان سنائی کے اور کوئی دوسرا قابل ذکر ماخذ نہ تھا۔ البتہ تذکرہ خلاصۃ الاشعار تالیف (۹۸۵ھ) میں مندرج ہے۔

عماد الدین غزنوی کے اس شعر میں بھی قاضی حسن کا نام ملتا ہے :

چوں سنائی او فتاد از خطہ غزنی بہ بلخ

تازہ کرد از مدحت قاضی حسن روئے سخن

لیکن حال ہی میں ایک اہم ماخذ قاضی حسن کے سلسلہ کا معلوم ہو گیا ہے۔ امداد ہے 'فضائل بلخ' یہ کتاب ۶۱۰ھ میں عربی میں تالیف ہوئی اس کے مصنف شیخ الاسلام صفی الدین ابو بکر عبد اللہ واعظ بلخی تھے لیکن اصل کتاب کا کوئی نسخہ اب باقی نہیں ہے۔ البتہ اس کا ایک فارسی ترجمہ جو عبد اللہ محمد حسینی بلخی کے توسط سے بلخ ہی میں ۶۷۶ھ میں مکمل ہوا موجود ہے۔ اس میں قاضی محمود حسن کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خاندان محمودی کے ایک رکن تھے ان کے تین بھائی تھے، بڑے بھائی کا نام قاضی القضاۃ حسین تھا۔ دوسرے قاضی حسن اور تیسرے قاضی بہار الدین عمر تھے۔ یہ تینوں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ ان کا خاندان علم و فضل کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھا۔ بہار الدین عمر وہی ہیں جن کے بیٹے حمید الدین <sup>۱</sup> لہ اس کتاب میں ستر عالموں کا تذکرہ ہے جس کا تعلق سرزمین بلخ سے تھا۔

<sup>۲</sup> یہ کتاب استاد عبدالحی حبیبی نے دریافت کی ہے اور اس کو بنیاد فرہنگ تہران کی طرف سے ۱۳۵۰ شمسی میں شائع کر دیا ہے۔

<sup>۳</sup> ان کے حالات کے لیے دیکھیے لباب الالباب طبع نفیسی ص ۱۶۸، تاریخ ادبیات در

ایران تالیف صفاج ۲ ص ۹۵۷، سبک فتاویٰ ملک الشعراء بہار ج ۲ ص ۳۲۹۔



ابوبکر محمود بلخی ہیں۔ اور جو علمی و ادبی دنیا میں سب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ انہیں کی مشہور کتاب مقامات حمیدی فارسی ادب میں بے مثل سمجھی جاتی ہے۔ راقم نے ان کے نام کے سلسلے میں فضائل بلخ ہی کے بیان کی روشنی میں ایک مضمون علیحدہ قلمبند کیا ہے۔ فضائل بلخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی حسن کے بڑے بھائی قاضی القضاۃ حسین محمودی علم و فضل کے لحاظ سے سب بھائیوں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ انہیں کے نام سے اس تذکرہ میں ایک بیان ہے جس میں خاندان کے دوسرے افراد کا ضمناً نام آگیا ہے۔ انہیں میں سے قاضی حسن بھی ہیں ذیل میں فضائل بلخ کی عبارت کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

”ساٹھویں قاضی القضاۃ حسین محمودی ہے <sup>۱</sup>ان پر رحم کرے ایک مدت تک بلخ کے قاضی اور عدالت کے حاکم تھے راستی دیانت زہد اور پاکیزگی میں وہ ضرب المثل تھے۔ بڑے استحقاق والے اور بڑے محقق تھے۔ ساتھ ہی بڑی پڑہنمیت اور پراختشام شخصیت تھی۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جو خدا کے ساتھ سچائی کا برتاؤ کرتا ہے اس کی ہدایت دوسروں پر طاری ہو جاتی ہے۔

ان بزرگ کا تعلق خاندان سادات سے تھا۔ اصلاً وہ مالقان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے تین بھائی تھے ان میں سے بڑے حسین پھر حسن پھر عمر اور یہ سب کے سب قاضی، عالم اور فاضل تھے لیکن قاضی القضاۃ حسین محمودی دیانت اور عدل میں بہت

۱۔ ان کا مشہور نام حمید الدین عمر ہے، حالانکہ عمران کے باپ کا نام تھا۔

۲۔ ص ۳۲۳ - ۳۲۵۔

۳۔ ایران میں مالقان نام کے کئی مقام ہیں، بظاہر ان کا تعلق مالقان سے ہے جو خراسان میں ہے فضائل بلخ، ص ۲۳۹ ج ۱

مشہور ہو گئے تھے۔ چنانچہ ایک بار وہ بلخ میں وعظ کہتے تھے۔ ایک وقت ایسا ہوا کہ ان کی مجلس وعظ میں سارے اکابر حاضر ہوتے تھے قاضی القضاۃ حسین محمودی اقطار عالم میں اپنی لطیف اور شیریں گفتگو اور حسن خطاب کے لیے مشہور تھے۔ تحریر میں بھی وہ بڑے نامور تھے ان کا بیٹا انہی کی طرح نظم و نثر دونوں میں نہایت درجہ مشہور ہو چکا تھا۔ یہ سارا خاندان ملک الکلام کے لقب سے مشہور تھا۔ ان کے تیسرے بھائی قاضی القضاۃ بہار الدین عمر ۵۳۶ھ میں فوت ہوئے وہ بھی بلخ کے قاضی مقرر ہوئے تھے اور ان کا ایک لڑکا تھا نہایت عالم فاضل کامل۔ جن کا نام حمید الدین محمود تھا۔ ان کے کلام کی شہرت تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ نہایت عقلمند اور بڑے درجے کے فاضل تھے۔ نظم اور نثر دونوں میں دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ ان کی کتاب مقامات روضۃ الرضا اور رسائل متفرقہ ان کی فصاحت اور بلاغت پر دلیل ہے۔

سیدزادہ ابوالقاسم سمرقندیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بہار الدین عمر قاضی کو اس حالت میں دیکھا تھا کہ وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور اہل بلخ ان کو فصحاء عجم کہتے تھے۔ حقیقت یہ کہ وہ بلخ کے افصح الفصحاء تھے۔ بلکہ بلخ کے اکثر فصیح و بلیغ لوگ اسی خاندان سے منتسب تھے۔

۱۵ سنائی کا شعر ملاحظہ ہو :

من چہ گویم گر ز فردوس بریں پرسی تو این کز خوشتر چیست گوید مجلس قاضی حسن

۱۶ ان کی تصانیف کی بڑی فہرست لباب الالباب عمونی ص ۱۷۸ میں موجود ہے۔

۱۷ بلخ کے ایک مصنف تھے ان کی کتاب تاریخ بلخ فضائل بلخ کے باعث میں تھی، سیدزادہ کی

وفات ۵۵۶ ہجری میں ہوئی۔



قاضی القضاۃ حسین محمودی نے حضرت ابوسعید خدری <sup>ؓ</sup> سے حدیث روایت کی ہے، ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو مخا طب کیا اور کوئی چیز دنیا میں ایسی نہیں چھوڑی کہ جن کے تحفظ یا جن سے بے تعلقی کی خبر نہ دی ہو۔ اور فرمایا کہ سرسبز ہو وہ شخص کہ جس نے میری بات سنی اور اس کو محفوظ کیا۔ نہ جانے کتنے فقیہ لیسے ہیں جو فقیہ نہیں ہیں۔ اور بہت سے لوگ کہ جو فقیہ کو ایسے شخص تک پہنچاتے ہیں، یا جو اس سے زیادہ عقلمند اور دین کی بات سے واقف ہیں۔ قاضی القضاۃ حسن <sup>ؒ</sup> ۵۶۔ ۵۷ میں فوت ہوئے اور درنو بہار پراپنے (حظیرہ محمودی) خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔“

سنائی کا قصیدہ جو قاضی نجم الدین کی مدح میں ہے ان کے انہات قصائد میں سے ہے اس میں بڑا زور بیان ہے اور اس کی تشبیہات قابل توجہ ہیں۔ تشبیب میں باغ کا اور بہار کا بیان بڑے دلچسپ انداز میں ہوا ہے۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے اس قصیدے کے منتخب اشعار ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

دی زردل تنگی زمانی طوف کردم در چمن

یک جہاں جان دیدم آںجا رستہ از زندان تن  
بے طرب خوش دل طیور و بیطاب جنیان صبا

۱۔ ابوسعید سعد بن مالک بن سنان خدری انصاری مشہور صحابی ہیں۔ ۷۷ سنہ ۱۰ قبل ہجرت پیدا ہوئے اور ۷۴ھ میں وفات پائی، صحیحین میں ان سے ۱۱۷۰ احادیث مروی ہیں، رک: فضائل بلخ ص ۱۹۳۔ ج ۳

۲۔ بظاہر حسین ہونا چاہیے، درحقی نے فضائل بلخ کی بنیاد پر مزارات بلخ میں حسین اور حسن دونوں کی ہی تاریخ لکھی ہے۔ دیکھیے فضائل بلخ حاشیہ ۶ ص ۳۴۵۔ بظاہر حسن اس کے بعد فوت ہوئے ہوں گے۔ ۳۔ دیوان سنائی بلخ مظاہر مصفا ص ۲۷۵۔ ۲۷۷

بے دہن خنداں درخت و بے زباں گویا چمن  
 موسن آسجا برد ویدہ تا میان سر و بن  
 زگس آسجا خوش مخفتہ در کنار لستر ن  
 چاک کردہ بر نوائے عندلیب خوش نوا  
 فوطہ کھلی بنفشہ شعر سیاہی سمن  
 بستہ ہچوں گردن و گوش عروس جاوہ گر  
 شاخ مرجان ارغواں و عقد گوہر یا سمن  
 بوئی بیرون سوئی و عطار از در و نسو مشک سوز  
 نقش بیر و نسوی و نقاش از در و نسو خامہ زن  
 من در آں صحرائی خوش، بادل ہی گفتم چنین  
 کاینٹ عقل افزای صحرا، و نیت جان پرور وطن  
 باغ گفت از راہ دیدہ، کی ستائی آن تول  
 برجین آواز در رنگ و بوئی ماندہ مفتن  
 مجلس نجم القضاة و قاری رحالش ببین،  
 تا ہم از خود فارغ آئی، ہم ز بلبل ہم زمین  
 رنگ و بوئی باغ و بستاں را چہ بینی کامل دل  
 دل بدیں تزویدہ ہرگز ندارد مرہن  
 سوئے قاضی شو کہ خلق و خلق ادرا چاکرند  
 نقش بنداں در خطا و مشک سایان در منق  
 راستی از تارون بینی، ولی از روی ضعف  
 پیش ہر بادی کہ بینی، چفتہ گرد و تارون



نخم را آں استقامت ہست کا ندر راہ دین

جز بہ پیش راستی چغٹہ نشد چون نون "ان"  
شمع مارا گر لگن کردست چرخ از خاک دھوں

ہست شمع گفت اورا سمع ہستیاں ان لگن  
چوں عروس فکرث او چہرہ بکشا ید زلب

نعرہ ہائی "طرقوا" بر خیزد از جان در بدن  
ساکنی از حلم او خیزد چو جزم از حرف "لم"

برتری از علم او زاید چو نصب از حرف "لن"  
من چہ گویم گرز فردوس بریں پر سی تو این

کز تو خوشتر چیست؟ گوید مجلس قاضی حسن  
نخم را باغ این شامیگفت دزد شاخ چنار

فاختہ کو کوکناں یعنی کہ کو آن انجمن  
شاد باش ای مہتری کز بہر چشم زخم تو

خرقہ در بازو فقیر دبت لبوزد برہمن

۱۔ طرقوا، مصدر تفریق سے امر ہے معنی راہ دوا در ایک طرف ہو جاؤ۔  
سلاطین و امراء کی سواری نکلتی تو نقیب طرقوا، طرقوا کی صدا دیتا چلتا، تاکہ راستہ  
صاف ہو جائے، در شاہی سواری آسانی سے گذر جائے۔ شعراء نے اکثر اس  
فقرے کا استعمال کیا ہے۔

۲۔ عربی میں حرف "لم" مضارع کے آخری حرف کی حرکت کو جزم میں تبدیل کر دیتا ہے۔  
۳۔ عربی میں حرف لن فعل کے آخری حرف کی حرکت کو زبر میں تبدیل کرتا ہے۔

چوں بہنبر بر شوی "والشمس" <sup>۱</sup> خواندہ آسمان  
 چوں فردا آزد "والنجم" <sup>۲</sup> خواندہ ذوالمنن  
 ای نثار دوستان از کان تو یا قوت علم  
 وی مقرر دشمنان از رد تو تا بوت ظن  
 انجم دہنا توئی، چوں پشت بر تابد ہی  
 پردہ خلاق توئی، چوں روی بناید مہن  
 ای بتان کامروز بینی از سر دادن ہمتی  
 بندہ یک بت شود آنگہ کہ بسیار دشمن  
 اندرین بت خانہ قاضی صد ہزاران بت بدید  
 کز سر بہت یکے بت رانند ہرگز دشمن  
 سوسن آزادہ را بینی کہ بے تابید اصل  
 گنگ ماندست از چہ مستش دہ زبان در یکدہن  
 شمع دینار را بہیں کز یک زبان در یک زمان  
 در طریق دین بگوید صد ہزار الوان سخن  
 ای خطابت از دو معنی چوں بروں آید ہی  
 گر چنین خوانمت نجی و رچناں خوانم مہن  
 اندر آن ساعت کہ ہما مت زدست دشمنی  
 زہر خورد دوستان گشتند از آن دل پر حزین

۱ قرآن کی سورہ "والشمس" کی طرف اشارہ ہے۔

۲ قرآن کی سورہ والنجم مراد ہے۔



زین عبارت گزیش خالی نبود در رہائش  
 زہرہ خون گشتی در آن چوں مشک زادی بالین  
 روضہ شریع معین الدین زہرہ عسز دین  
 از جمال لفظ خود ہم عدن گردی ہم عدن  
 ہر دلی کز عشق و جاہ و مال چوں بت خانہ بود  
 سوختی بت خانہ و در ہم شکستی آن وتن  
 نسبت از محمودیاں داری و بہر عزدین  
 بچو محمود آمدی بت خانہ سوز و بت شکن  
 مدعی بسیار داری اندر سی صنعت و لیک  
 زہرہ کاں دانش سیر از سوسن و خار از سمن  
 بے جمال یوسف و بیوز یعقوب از گزاف  
 تو تیا ئی ناید از ہر باد و از ہر پیر، من  
 گرجہ در میدان قالی لیکن از روئی خرد  
 رفتہ ای جائے کہ بیش آبخانہ ما گنجد نہ من  
 از برائے انتظار مجلس را روز و شب  
 گرنہ بہر مصلحت بودی زمن گشتی زمن  
 شاد باش اے عذیبی کز پی و صفت ہی  
 مرغ بریاں طوطی گویا شود بر بارن  
 سطور بالا سے جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا مقصد بیخ کے ایک علمی خاندان پر کچھ روشنی  
 ڈالنا ہے چونکہ اس خاندان کے ماخذ محدود ہیں اس لیے اس سلسلے میں تفصیل سے کچھ نہیں  
 کہا جاسکتا آئندہ نئے ماخذ کی دریافت پر ممکن ہے اس خاندان کے اور افراد کا حال معلوم ہو سکے۔

# اقبال کا اردو کلام

از جناب کمال جعفری ایم۔ اے، آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی

یہ اردو زبان کی خوش اقبالی ہے کہ اسے علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر طے جن کی شاعری نے اسے دنیا کی زبانوں میں محترم بنا دیا۔ اقبال ایک ذہین فلسفی، حساس شاعر اور درد مند انسان تھے۔ انھوں نے حالات حاضرہ کا ہر زاویہ نظر سے گہرا مطالعہ لیا تھا جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں بڑی گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی۔ ان کی شاعری انسانی مسائل سے ہم آہنگ ہے اور حیات و کائنات کا ایک مکمل پیغام بھیجتی ہے۔ بقول علی سردار جعفریؒ:

”اقبال مسلم بیداری کے شاعر تھے اس میں ایشیائی بیداری شامل ہے، اقبال ہندوستان کی بیداری کے شاعر تھے اس میں پوری تحریک آزادی شامل ہے، اور اقبال عالم انسانیت کی بیداری کے شاعر تھے اس میں اختر اکیت کی فتح اور کارل مارکس و لنین کے افکار کی عظمت شامل ہے، اقبال کی دوسری اور تیسری حیثیت ان کی پہلی حیثیت کی تردید نہیں کرتی بلکہ میرے نزدیک اس کی توثیق اور توسیع کرتی ہے کیوں کہ

علامہ ”اقبال شناسی“ علی سردار جعفری، صفحہ ۱۱ (دیباچہ)



ہندوستان اور ایشیا کی مسلم بیداری عالم انسانیت کی بیداری کا ایک حصہ ہے۔ اقبال صبح معنوں میں عالمی شاعر تھے۔

اقبال کی قومی، ملی، وطنی اور فلسفیانہ شاعری بڑی پہلو دار ہے، انھوں نے فکر و تجسس کا ایسا مرقع پیش کیا ہے کہ عقلِ انسانی حیران رہ جاتی ہے، قدرت نے انھیں دردمند دل عطا کیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ہر شخص ان کے کلام کو پڑھنے کے بعد محسوس کرنے لگتا ہے کہ اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کے دل کی ترجمانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے لہذا کوئی اقبال کو شاعر مشرق، کوئی قومی رہنما، کوئی حکیم الامت، کوئی فلسفی، کوئی شاعر اسلام اور کوئی اشتراکیت کا علمبردار سمجھتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری ہر مکتبہ فکر کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ اس لیے ہر مکتبہ فکر کے لوگ ان کو اپنا شاعر سمجھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے آفاقی ہونے کی دلیل ہے، چنانچہ زمانہ جیسے جیسے گزرتا جائے گا ان کی شاعری قبول عام کی سند حاصل کرتی جائے گی۔

فی الحال میرے پیش نظر ان کا اردو کلام ہے، اردو میں علامہ اقبال کے چار مجموعے بانگِ درا، ضربِ کلیم، بالِ جبریل اور ارمعانِ حجاز ہیں۔ یہ چاروں مجموعے فکری، ادبی، انقلابی اور عالمی نقطہ نظر سے آفاقی خوبیاں رکھتے ہیں۔ بانگِ درا ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ ریوی وہ مصنیف ہے جس کی بدولت ہندوستان کی اردو دنیا میں علامہ اقبال کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔ اس میں زیادہ تر نظمیں ہیں جنہیں علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام کے لیے کہتے تھے۔ وہ انجمن حمایت اسلام، لاہور کی نشستوں میں اپنی نظمیں اس نشستیں انداز میں پڑھتے تھے کہ سینے والوں پر رقت طاری ہو جاتی تھی ان کی قومی نظموں نے خوابیدہ قوم میں زندگی کی بیداری کی روح بھونک دی۔ ان کی نظموں میں ترانہ ہندی، ہمالہ، نالہ یتیم، شمع و شاعر، شکوہ، جواب شکوہ اور طلوع اسلام نے عوام و خواص میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ اس زمانے میں ان کی اکثر نظمیں

رسالہ "محزن" میں شائع ہوتی تھیں، اس کے علاوہ مختلف رسالوں میں ان کی نظمیں شائع ہو کر عوام سے داد حاصل کرتی تھیں اور رسالوں کے مدیر حضرات ان سے نظم کی اشاعت کے لیے فرمائش کیا کرتے تھے۔ ان کی قومی اور ملی نظموں نے لوگوں کے دلوں میں ایسی تاثیر پیدا کی کہ وہ شاعر مشرق اور حکیم الامت کہلانے لگے۔ بانگ درا میں ترانہ ہندی، ہندوستانی قومی بچوں کا گیت اور نیا شوالہ جیسی نظمیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اقبال ایک سچے محب وطن شاعر تھے۔ اس موقع پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو لوگ اقبال کو متعصب اور فرقہ پرست نہ سمجھتے ہیں ان کے دل ملک و ملت اور انسانیت کے درد سے خالی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی قدرت نے ایک درد مند دل اور روشن دماغ عطا کیا تھا ان کی شاعری "دلی فریخ" نہیں بلکہ انسانیت کے لیے "ادبی تبلیغ" ہے۔ ان کی شاعری پر کسی مخصوص برادری یا فرقے کی طرف داری کا لبیل نہیں چپکایا جاسکتا۔ اقبال متعصب شاعر ہوتے تو راجندر جی سوامی رام تیرتھ اور شیکسپیر پر نظم نہیں کہتے۔ ان کی وسیع النظری کی ایک جامع مثال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی مشہور تصنیف "برن جبریل" کا نام بالوہ کے مشہور اور قدیم حکمران ہری بھرتی کے چھٹے اشلوک سے اخذ کیا۔ انھوں نے مذکورہ اشلوک کا ترجمہ اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ سراسر آمد کا گمان ہوتا ہے :-

پھول کی تپتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جاگر

مرد نادوں پہ کلام نرم و نازک بے اثر

اقبال کو بعض تنگ نظر ناقدین فطری شاعر نہیں مانتے اور انھیں خطیب

مولوی اور دوسرے غیر ضروری ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ ایسے ناقدین اقبال جیسی

بین الاقوامی شخصیت کی نالافت کر کے مشہور ہونا چاہتے ہیں دراصل یہ ناقدین

نفس کے غلام ہیں۔ میں کچھ لوگوں کے نام گنواتا لیکن فی الحال گریز کر رہا ہوں اور اپنے



اس دعوے کے ثبوت میں کہ علامہ اقبال شاعرِ فطرت بھی تھے مثال کے لیے اس وقت دو نظم ”آرزو“ اور ”ماہِ نو“ کا ذکر کر رہا ہوں جو خالص نیچرل شاعری کی دلیل ہیں۔

”ماہِ نو“ کے ابتدائی بند کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کا اندازِ بیان کس قدر شگفتہ اور مترنم ہے اس میں ایسا بیباختہ پن پیدا ہو گیا ہے کہ بیک وقت موسیقی اور آہنگ دونوں کا لطف برقرار رہتا ہے اور کسی بھی پڑھنے والے پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وجد کرنے لگتا ہے۔

ٹوٹے کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل  
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل  
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب  
نشرِ قدرت نے کیا کھولی ہے نصیبِ آفتاب  
جرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی  
نیل کے بال میں یا پھلی ہے سیمِ خام کی

نظم ”آرزو“ کے یہ اشعار اس قدر نیچرل ہیں کہ ایسی مثال ساری اردو شاعری میں بمشکل ملے گی اشعار کی ہیئت، آہنگ اور موسیقی نے ایسا سماں باندھا ہے کہ خود فطرت ان کی قادرِ الکلامی پر نازاں نظر آتی ہے :-

صفا باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں  
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو  
ہو دلغریب ایسا کہسار کا نظارہ  
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو  
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہوسبزہ  
پھر پھر کے جھاڑبوں میں پانی چمک رہا ہو



پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی  
 جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو  
 ہندی لگائے سورج جب شام کی دہن کو  
 سُرخی لیے سنہری ہر بھول کی قبا ہو

”بانگ درا“ کا وہ کلام جنہیں اقبال نے سفر یورپ کے تجربوں کی روشنی میں ترتیب دیا ہے، وہ فکر و فن کی وسعتوں سے ہم آہنگ ہے، دراصل سفر یورپ نے ان کو آفاقی نظریہ دیا اور ان کی شاعری میں ایسی پختگی پیدا ہوئی کہ انھوں نے حیات و کائنات کا تعمیری لائحہ عمل پیش کیا اور اہل مشرق کو اہل مغرب کے مقابلے میں بیدار کیا۔

علامہ اقبال صحیح معنوں میں زندگی کے شاعر تھے ان کا نظریہ حیات اسلامی قدروں کا آئینہ دار ہے لیکن وہ تنگ نظر نہیں تھے انھوں نے دوسرے مذاہب اور نظریات کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا یہ ادبیات ہے کہ ان کے انکار کا اصل مآخذ قرآن کریم رہا۔ انھوں نے قرآن مقدس کی تعلیمات کو شاعرانہ اصطلاحوں کے ساتھ پیش کیا اور عالمی ادب میں یہ ثابت کیا کہ دنیا کی ظاہری مادی طاقتیں دائمی سکون نہیں دے سکتیں انھوں نے اپنے سحر آفریں کلام کے ذریعہ یہ واضح کیا کہ انسان روحانی قدروں کو اختیار کرے تو مادی طاقتوں پر غالب آسکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنے نظریات کی وضاحت کے لیے خودی، مرد مومن اور شاہین جیسی علامتوں کو فکر و فن کا جامہ پہنایا یا انھوں نے زندگی کا حاصل یہ بتایا کہ انسان مرد مومن بن جائے تو اس کی روح بیدار ہو سکتی ہے انھوں نے ”مرد مومن“ سے مراد خدا ترس انسان یا ہے۔ ”ضرب کلیم“ میں مرد مومن کی سچی تعریف اقبال نے یوں بیان کی ہے:



ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن  
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان  
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت  
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان  
انہوں نے ”بال جبریل“ میں مرد مومن کی عظمت و طاقت کو اس دلنشین  
انداز میں بیان کیا ہے کہ سلف صالحین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:  
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ  
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی  
”ضرب کلیم“ اور ”بال جبریل“ میں فرق یہ ہے کہ ضرب کلیم میں فلسفہ زیادہ  
ہے اور شاعری کم — اس کے برعکس ”بال جبریل“ میں فلسفہ اور شاعری دونوں  
کامیاب امتزاج ملتا ہے۔ ضرب کلیم میں انہوں نے چھوٹے چھوٹے عنوانات کے تحت اپنے  
گو ناگوں افکار کا اظہار کیا ہے اور ہر عنوان اپنے اندر ایک مکمل فلسفہ رکھتا ہے، فی الحال  
ضرب کلیم کا ایک بند پیش کر رہا ہوں جس سے یہ اندازہ ہو گا کہ ان کا ذہن معبود حقیقی کے  
پیغام کو پیش کرنے میں کس قدر متحرک تھا: —

یہ نغمہ فصل گل دلا رہا نہیں پابند  
بہار ہو کہ خزاں لا یولہ الا اللہ  
اگر چہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں  
مجھے ہے حکم ازاں لا یولہ الا اللہ

بال جبریل کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اقبال کا نظریہ آفاقی ہے  
انہوں نے اس مجموعہ کلام میں ایسا ابدی اور سرمدی پیغام پیش کیا ہے کہ اس کی روحانی  
لذتوں سے سیراب ہو کر انسان ”مرد مومن“ کی سرحد میں داخل ہو سکتا ہے جہاں عشق و مستی

کا سمندر ابلت نظر آئے گا۔ دراصل بال جبریل خدا اور بندہ کے درمیان عشق کا وہ اہتمام سمندر ہے کہ اس کی تہوں میں ایمان و یقین کی کڑی بکھری ہوئی ہیں ”بال جبریل“ میں اقبال نے عشقِ رسولؐ کا ایسا پاکیزہ اور روح پرور نقشہ کھینچا ہے کہ اس کی مثال کہیں شاذ و نادر ہی مل سکتی ہے۔ ان کے سارے کلام میں عشقِ رسولؐ کی لے پائی جاتی ہے، یہیں ہر وقت ان کا ایک شعر پیش کر رہا ہوں جسے پڑھنے کے بعد اندازہ ہو گا کہ وہ محسنِ انسانیت کی شان میں کس عقیدت سے شعر کہتے تھے، ایسا شعر صرف وہی کہہ سکتے تھے:

وہ دانائے سبیل ختمِ الرسل مولائے کل جس نے

غبارِ راہ کو بخشا فردِ غی وادیِ سینا

اس شعر سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے حسان بن ثابتؓ کی یاد تازہ کر دی

دراصل اقبال نے عشقِ رسولؐ میں گھو کر خودی کی بے بہاد دولت سے اپنا دامن بھر لیا تھا۔ وہ اپنے اس عشق کا اظہار کس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں، محسوس کرنے کی چیز ہے:-

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی،

کھینٹے ہیں غلاموں پر اسرارِ خداوندی

جب عشق سے انسان آدابِ خود آگاہی سیکھ لیتا ہے تو غلامی پر بھی اسرارِ خداوندی کے راز کھل جاتے ہیں اور عشق اتنا محکم ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی کے ریشے ریشے میں سرایت کر جاتا ہے اقبال نے اس حقیقت کو کتنی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے ملاحظہ کرنے کی چیز ہے:-

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق

شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

اقبال نے فلسفہٴ خودی کی بھرپور وضاحت بھی ”بال جبریل“ ہی میں کی ہے۔



انھوں نے خودی کی عظمت کا اظہار درج ذیل شعر میں اس انداز سے کیا ہے کہ انسان کی خودی در یہ معراج حاصل کر لیتی ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال نے خودی کی وضاحت کر کے خدا کی نظر میں انسان کو محترم بنا دیا ہے:

علامہ اقبال کی مشہور نظم ”مسجد قرطبہ“ اردو ادب میں شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے

ایسی پائے کی نظم آج تک کسی شاعر نے نہیں کہی۔ خود اقبال ایسی دوسری نظم سمجھ کر بھی نہ لکھ پائے۔ یہ نظم فکر و فن کے نقطہ نظر سے بالکل اچھوتی ہے اس میں ایسا الہامی انداز ہے کہ انسان کھو کر رہ جاتا ہے۔ اس نظم کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں:

”اس نظم کو جسے اردو نظموں کی مسجد قرطبہ کہیں تو بے محل نہ ہوگا، پڑھنے کے بعد

ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے نماز کی منزلت کو جس قدر اور جس طرح اقبال نے مسجد

قرطبہ کی تعبیر سے مسلم و متعین کیا۔ آج تک شاید ہی کسی ادب نے آثارِ عظیم کا یا ستثنائاً روضۃ

اقدس اور خانہ کعبہ کیا ہوگا، کبھی کبھی تو یہاں تک گمان ہونے لگتا ہے کہ روزِ ازل ابلیس

نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر کے جس طرح جلالتِ الہی کو معرضِ بحث میں لانے کا

اقدام کیا، اقبال نے مسجد قرطبہ میں مردِ مومن کے سجدے کی عظمت کی تعبیر کر کے اس کی

”تلافی کر دی ہو“

اس نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں اقبال نے مردِ مومن کی عظمت کو بڑے

تزک و احتشام کے ساتھ پیش کیا ہے:

۱۵ اقبال شخصیت اور شاعری ”رشید احمد صدیقی صفحہ ۱۲۸

تھ سے ہوا آشکار بندہ مومن کا راز  
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم  
ہاتھ ہے اللہ کا مردِ مسلمان کا ہاتھ  
خاک کی ونوری نہاد بندہ مولا صفات  
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل  
رزم دم گفتگو رزم دم جستجو  
نقطہ پر کار حق مرد خدا کا یقین  
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ  
اقبال نے تصوف میں سب سے زیادہ رومی کی پیروی کی ہے رومی کو وہ اپنا  
روحانی پیر تصور کرتے تھے، انھوں نے عارفِ خدا کا صحیح مقام متعین کیا ہے اس  
سلسلے میں ان کا ایک بندہ بطور نمونہ بالِ جبریل سے پیش کیا جاسکتا ہے:

دم عارف نسیم صبح دم ہے

اسی سے ریشہ معنی میں نم ہے

اگر کوئی شعیب آئے میسر

شبانہ سے کلیمی دو قدم ہے

اقبال کا آخری مجموعہ کلام ”ارمغانِ حجاز“ ہے اس میں نظم ”رباعی اور قطعات  
اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہیں، نظم ”ابلیس کی مجلسِ شوریٰ“ فکری اور فنی  
اعتبار سے وقیع ہے۔ فی الحال ارمغانِ حجاز سے ایک رباعی پیش کر رہا ہوں۔ دیکھا  
جلے تو کائنات کا ذرہ ذرہ نورِ الہی ہے معمور ہے اس خیال کا اظہار اقبال نے کس  
دل نشیں انداز میں کیا ہے:

خود دیکھے اگر دل کی نگہ سے جہاں روشن ہے نورِ لا الہ سے



فقط آک گردشِ شام و سحر ہے اگر دیکھیں فسروغِ مہر و مہر سے  
 اقبال کے اردو کلام میں وہ تمام شاعرانہ اور فلسفیانہ خوبیاں موجود ہیں  
 جن کی بدولت حیات و کائنات کا براہ راست مطالعہ کیا جاسکتا ہے،  
 اقبال دنیا کے وہ پہلے شاعر ہیں جو زندگی کے مسائل ہی بیان نہیں کرتے بلکہ  
 ان مسائل کا حل بھی بتاتے ہیں اور یہی ایک عظیم شاعر کی خصوصیت ہے۔ میں سمجھتا ہوں  
 کہ صرف اقبال کے اردو کلام کا مطالعہ کیا جائے جب بھی ان کی حیثیت کم نہیں ہوگی۔

## زبدۃ الحکمتہ

مصنفہ خاتم الحکماء مولانا عبدالحق خیر آبادی

منطق و فلسفہ میں اردو تصنیف ہے جسے مولانا محمد عبدالشاہد خاں  
 شردانی نے مرتب کر کے اپنے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کرایا  
 ہے۔

یہ کتاب امتحان مولوی منشی کمالیہ۔ پی بورڈ الہ آباد اور مختلف مدارس  
 عربیہ میں داخل ہے مبتدی اور منتهی طلبہ کے لیے اس کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔  
 سائز ۲۰x۳۰ کتابت و طباعت و کاغذ غنیمت، صفحات ۱۳۰۔  
 قیمت: ۴ روپے۔ ملنے کا یہ:

معتدزاویہ علمیہ۔ دفتر جمہور محمد علی روڈ، بالائے قلعہ، علی گڑھ یو۔ پی  
 مکتبہ برہان ندوۃ المصنفین، اردو بازار جامع مسجد  
 دہلی

## ۳۔ تسخیر ایشیا اور نعمہ ہائے الہیہ

جناب مولوی شہاب الدین صاحب ندوی ناظم فرقانہ اکیڈمی (شنگھائی)  
(آخری قسط کا بقیہ)

بیسویں صدی میں استعماریت کی نئی شکل | آج غیر قوموں پر سیاسی غلبہ یا استعماریت  
دنوا آہادیت (Colonialism) کا دور نہیں رہا۔ بلکہ اٹھارویں  
اور انیسویں صدی میں یورپین قوموں نے برق و بھاپ کو مسخر کر کے اور اپنی طاقت  
واققدار کے بل بوتے پر جن جن ایشیائی اور افریقی ممالک پر قبضہ کر لیا تھا، وہ بیسویں  
صدی میں، خود انہی قوموں کے وضع کردہ فاسفہ قومیت و وطنیت (Nation-  
alism) کے منطقی نتیجے کے طور پر ایک ایک کر کے سب کے سب  
آزاد ہوتے چلے گئے۔ اور ان مغتوح و مغلوب قوموں کے جذبہ آزادی کو دبانے  
اور کچلنے کے لیے ان کی قوت و طاقت اور شان و شوکت کچھ بھی کام نہ آ سکی مگر یہ  
عجیب بات ہے کہ وہ قومیں جو اقوام مغرب کے غلبے و تسلط سے سیاسی طور پر آزاد  
ہو گئیں؛ ذہنی، تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے ان اقوام کے تسلط سے آزاد نہ ہو سکیں  
کیونکہ تعلیم اور علوم و فنون نیز صنعت و ٹکنالوجی کے باب میں یہ قومیں بدستور پس ماندہ  
اور مغرب سے کوسوں دور ہیں۔ نتیجہ یہ کہ یہ اسی آزادی کے بارود گویا کہ اپنی تمدنی  
اور فوجی ضروریات کے باب میں عملاً انہی کی دست نگر اور انہی کی غلام بنی ہوئی ہیں۔  
اور یہ تمدنی غلامی اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک کہ یہ قومیں علوم و فنون میں

کمال حاصل کر کے صنعت و ملکنا لوجی میں ترقی نہیں کر لیتیں اور ہر حیثیت سے اپنے آپ کو خود کفیل نہیں بنا لیتیں۔

ایک حیثیت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تہذیبی و تمدنی غلامی دراصل سیاسی غلامی سے بھی بدتر ہے۔ بلکہ وہ نوآزاد ملکوں کے سیاسی عدم استحکام اور اندرونی خلفشار کی ایک علامت بنا ہوا ہے۔ کیونکہ غالب اور ترقی یافتہ قومیں اس قوت کو ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ اور اس حربے کی وجہ سے بڑی طاقتوں کو ان غیر ترقی یافتہ یا پس ماندہ ممالک کے اندرونی معاملات میں دخل پہنچنے اور اپنی من مانی شرائط کے منوانے کا بھی موقع مل جاتا ہے۔ اس طرح گویا کہ نوآزاد ملکوں کی سیاسی آزادی بڑی طاقتوں یا طاقتور قوموں کے پاس رہن رہتی ہے اور وہ وقت آنے پر جو چاہتی ہیں کر گزرتی ہیں۔ بلکہ اب تو کچھ ایسے تماشے ظاہر ہونے لگے ہیں کہ آزاد ممالک کی بھی خیر نظر نہیں آرہی ہے اور کھلم کھلا جارحانہ کارروائیاں شروع ہو چکی ہیں۔ جن میں سے ایک واضح مثال ماضی قریب میں فلسطین مرحوم کی تھی اور اب ایک تازہ مثال افغانستان کی، جو اپنی آزمائش کے بدترین دور سے گزر رہا ہے۔

اس طرح بڑی طاقتوں کی حریصانہ اور للچائی ہوئی نظریں آج مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک اور خصوصاً خلیجی ملکوں پر لگی ہوئی ہیں۔ اور وہ ان کے معاملات میں دخل بن کر ان پر قبضہ کر لینے کے لیے مختلف حیلوں اور بہانوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کیونکہ ان ممالک سے حاصل ہونے والی خام پیداوار (پٹرول) کی حیثیت اپنی صنعتی، تمدنی اور عسکری اہمیت کے اعتبار سے دنیا کی شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان حالات میں قصہ آدم اور اس کا فلسفہ ہم کو جھنجھوڑ رہا ہے اور یہ سبق



دے رہا ہے کہ ہم جتنی جلد ہو سکے مغرب کی — یا زیادہ صحیح معنوں میں ترقی یافتہ قوموں کی — اس بدترین تمدنی غلامی اور اُن کے طاسمی جال سے باہر نکلیں اور اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونا سیکھیں۔ مادی اعتبار سے قوت و طاقت حاصل کیے بغیر، ہم سیاسی استحکام کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اور مادی قوت و طاقت کا راز علوم و فنون اور سائنس و صنعت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے، ذہنی و فکری قوتوں کو بیدار کرنے اور انھیں پروان چڑھانے میں پوشیدہ ہے لہذا ملت اسلامیہ کو خود کفیل بنانے کی خاطر پوری سنجیدگی کے ساتھ اس معاملے میں غور کرنا اور عملی طریقے اختیار کرنا چاہیے تاکہ پندرہویں صدی اسلام کی صدی بن سکے اور دین اسلام کا بول بالا ہو۔

نوٹ: یہ مقالہ راقم سطور کی نئی کتاب ”اسلام کی نشاۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں“ کے شروع کے دو ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مجلس نشریات اسلام کراچی کے ماتحت زیر طبع ہے۔

## فہرست مراجع

- اس مقالے میں جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہیں :-
- ۱۔ قرآن مجید
  - ۲۔ تفسیر ابن کثیر، حافظ عماد الدین ابن کثیر، دارالاحیاء الکتاب العربیہ، مصر
  - ۳۔ تفسیر روح المعانی، شہاب الدین محمود آلوسی، دیوبند
  - ۴۔ تفسیر کبیر، محمد فخر الدین رازی، مطبع حسینہ و مطبع عامرہ، مصر
  - ۵۔ تفسیر کشاف، جلال الدین محمود زحشری، انتشارات آفتاب، تہران ۱۳۳۵ھ
  - ۶۔ احکام القرآن، ابوبکر احمد بن علی جصاص رازی، دارالکتاب العربی، بیروت

- ۷۔ تفسیر المنار، سید رشید رضا، دارالمعرفۃ بیروت،
- ۸۔ تفسیر بیضاوی، ابوالخیر عبداللہ بن عمر البیضاوی، کتب خانہ رحیمیہ دہلی، ۱۳۷۱ھ
- ۹۔ تفسیر الجواہر، شیخ طنطاوی جوہری، مصر، ۱۳۵۰ھ
- ۱۰۔ تفسیر جلدی، مولانا عبد الماجد دریابادی، طبع ثانی لکھنؤ۔
- ۱۱۔ تفسیر معارف القرآن، مولانا مفتی محمد شفیع، دہلی، ۱۳۷۱ھ
- ۱۲۔ المفردات فی غریب القرآن، ابوالقاسم حسین بن محمود راغب اصفہانی، دارالمعرفۃ بیروت۔

- ۱۳۔ القاموس المحیط، مجدالدین فیروز آبادی، مصر
- ۱۴۔ صحیح بخاری، امام محمد بن اسماعیل بخاری، بترتیب جدید، استنبول، ۱۹۷۹ء
- ۱۵۔ صحیح مسلم، امام مسلم بن حجاج نیشاپوری، دارالافتاء ریاض۔
- ۱۶۔ فتاویٰ ابن تیمیہ، امام تقی الدین احمد ابن تیمیہ،
- ۱۷۔ زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، حافظ شمس الدین ابن قیم جوزی، دارالافتاء ریاض
- ۱۸۔ الطب النبوی لابن القيم الجوزیہ، عبدالغنی عبدالخالق، مکتبۃ النہضۃ الحدیث، مکہ مکرمہ۔

- ۱۹۔ سیرت النبی جلد چہارم، علامہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ۔
- ۲۰۔ مذہب اور سائنس، مولانا عبدالباری ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام
- ۲۱۔ مذہب اور سائنس، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء
- ۲۲۔ نامعلوم انسان، مصنفہ الکسس کیرل، مترجمہ محمد یوسف کوکن عمری ایم۔ اے۔

مدراں یونیورسٹی، ۱۹۵۳ء

- ۲۳۔ خدا موجود ہے، مرتبہ جان کلور مونزما، مترجمہ عبدالحمید صدیقی، مقبول الیڈیٹری لاہور۔

- ۲۰۔ جدید معلومات سائنس، حصہ اول، آفتاب حسن، انجمن ترقی اردو ہند۔  
 ۲۱۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، مترجمہ سید نذیر بیگم، لاہور ۱۹۵۸ء  
 ۲۲۔ فکر اقبال، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء

- 27- The Encyclopedia of ignorance,  
 edited by Ronald Duncan, Pergamon  
 Press, Oxford, 1978.
28. — A class Book of Botany, by A. C.  
 Dutta, Oxford University Press,  
 Calcutta, 1978.
- 29— The Chemistry of life, by Steven  
 Rose, Pelican Books, Middlesex  
 England, 1977.
- 30 — Asimov's Guide to science,  
 Pelican Books, England 1978.
- 31 — Outlines of Zoology, by M. E.  
 Ayar, Madras, 1976.
- 32 — The Penguin Dictionary of  
 biology, Middlesex, England, 1979.
- 33— Botany for degree students, by  
 A. C. Dutta, Oxford University  
 Press, Calcutta, 1979.



- 34— Will to Doubt, by Bertrand Russel. (بحوالہ مذہب اور سائنس)
- 35— A Short History of science, by W. C. Darniers. (بحوالہ مذہب اور سائنس)

## وحی الہی

مؤلف مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے۔

وحی اور اس سے متعلقہ مباحث پر محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ کے ایک ایک پہلو پر ایسے دل پذیر و دل کش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سما جاتا ہے اور حقیقت وحی سے متعلق تمام خلیں صاف ہو جاتی ہیں۔ صفحات ۲۰۰

قیمت ۸/- مجلد ۱۳/۲

معتد

ملنے کا پتہ:

مکتبہ برہان، جامع مسجد، اردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۱۱

## ادبیات

مولانا محمد کفیل فاروقی

ہیں جلوہ گرِ قدس میں راج بھون را

تا عرش رسانید فلک نالہ من را

تا حشر بود خون ہمہ بر سر قابیل

بر مانده ہمت خود ما حشر آورد

دیوار و در خانہ من گرچہ زہم رخت

بہر قطرہ خول رونق تکفین فرود کرد

چہ پائی گل اندر چمن از خار ہا باشد

تیسار کرم چشم گہریار ندارد

سنبل چہ خورد پیچ پر اندام صنوبر

شد خندہ گل باعث تضحیک عنادل

دردیر و حرم نعرہ تکبیر بلند است

بے سود بود شکوہ بیداد ازاں بُت

دو در دل من داد بہا چرخ کہن را

در قتل من آورد عبت جیلہ و فن را

از خون دل و مغز سرم ز داغ دُغن را

حاشا بغبارش نخرم مشکِ ختن را

نقشِ بر طاووس بود داغِ کفن را

دائِم رسد آزار ہا پابند وطن را

از اشکِ رواں آبِ ہر گنگ و چمن را

خیاطِ ازل دوخت قبا سر و چین را

بیرون چمن برد صبا بوئے چمن را

غوغائے سگال کم نکند قدرِ سخن را

کفر است کئی تا صیہ فرسائی و تن را

صد مملکت معنی در اقلیم دل تست ہیں جلوہ گہ قدس میں راج بھون را

افسانہ منصور ز فاروقی پیر سید

کرد است فراموش کنوں دار و رسن را

## اسلام کا زرعی نظام

مولانا محمد تقی صاحب امینی

اسلام نے زراعت اور کاشتکاری کا کتنا مکمل نظام پیش کیا ہے۔ زمین کی تقسیم کے اصول، معاشیات میں زراعت کی حیثیت، خلافت راشدہ کے زمانے میں مشترکہ کھیتی کی صورتیں، ٹریکس کے قانون اور لگان کی وصولی میں کاشتکاروں کے لیے سہولتیں اور دوسرے اہم عنوانات کے تحت زرعی نظام پر بسیط بحث،

آخر میں تمام بحثوں کا ایک بصیرت افروز خلاصہ دیا گیا ہے۔

بڑی تقطیع، صفحات ۳۱۶، نیا ایڈیشن

عمدہ طباعت آفسٹ : مجلد عکسی - ۲۰/- روپے

غیر مجلد - ۱۵/- روپے

ملنے کا پتہ

مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۷



## تبصرے

فتاویٰ امجدیہ جلد اول از علامہ مفتی محمد امجد علی صاحب اعظمی - تقطیع کلاں،

۲۰۳۳۰ صفحات ۳۲۵ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد - / ۲۵ روپے

پتہ: دائرۃ المعارف الامجدیہ، قادری منزل - گھوسی ضلع اعظم گڑھ - یوپی

مولانا مفتی امجد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندو پاکستان کے علمی حلقوں میں بلکہ

عام و نیدار حلقوں میں بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، اس کتاب سے قبل مرحوم

کی مایہ ناز کتاب بہار شریعت جو مسائل فقہیہ کا گنجینہ ہے اور سترہ حصوں پر پھیلی ہوئی

ہے اپنی اہمیت و افادیت تسلیم کرا چکی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ

ہے جس کی پہلی جلد دائرۃ المعارف الامجدیہ کی کوششوں سے منظر عام پر آگئی ہے

امید ہے دوسری جلد بھی جلد چھپ جائے گی۔ ادارہ اس علمی خدمت پر قابل مبارک باد

ہے کہ فتاویٰ کے منتشر ذخیرے کو نہ صرف ضائع ہونے سے بچا لیا بلکہ اس کو قدر و اہمیت

کے ہاتھوں تک پہنچا دیا۔

آج صنف مرحوم بقیہ حیات ہوتے اور ہماری ان سطروں کو پڑھ سکتے تو ہم

کچھ مشورے پیش کرتے مثلاً ص ۱۱۹ و ص ۱۲۱ پر یہ مذہب وغیرہ کا لفظ

جس طبقے کے لیے بولا گیا ہے وہ علی الاطلاق درست نہیں۔ ص ۱۶۸ پر ہے کہ غیر مقلد

اگر صنف کے درمیان آجائے تو یہ قطع صنف ہے، یہ بے جا تشدد معلوم ہوتا ہے۔ اگر

غور سے دیکھیے تو جماعت اہل حدیث قریب قریب بھی مسائل میں امام احمدیہ امام شافعی کے مطابق ہے گو ان کی تقلید کے نام سے نہ ہو، اس لیے علامہ طحطاوی کے جس قول کی بناء پر یہ رائے قائم کی گئی ہے اس کے لحاظ سے بھی جماعت اہل حدیث اہل سنت سے خارج نہیں ہے، جبکہ خود طحطاوی متوفی ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۶ء) کا یہ تو بھی کسی حجت شرعی کا درجہ نہیں رکھتا۔ ص ۲۵۶ پر وہ گمراہ فرقے جن کی بنائی ہوئی مسجد شرعاً مسجد نہیں ہے ان کی فہرست بھی غور طلب ہے اور ص ۲۵۹ و ص ۲۶۲ پر توساری لاگ پیٹ ختم کر دی گئی ہے۔ ذرا سا ہمدردانہ اور بچکدار رویہ ان تمام مسائل کا بنیادی حل۔ ص ۱۳ و ص ۱۹ پر ہے کہ گھڑی کی چین جو کسی دعوات سے بنی ہوئی ہو اسے باندھ کر نماز پڑھی جائے تو نماز مکروہ ہوگی، ہمارے خیال میں محشی نے جو عدم کراہت کو ترجیح دی ہے اور درمختار اور مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم کے اقوال سے استدلال کیا ہے زیادہ دقیقہ رائے ہے اس لیے کہ کسی شے کے اصالت استعمال اور طبعاً استعمال سے احکام بدل جاتے ہیں۔ مگر محشی نے یہ رائے غالباً بالقصد صرف غریبان میں لکھی ہے کتابت میں ترکے بہت ہو گئے ہیں جو بعد میں حواشی پر لکھے گئے ہیں اور ایک جگہ (ص ۵۵) پر تو اتنا طویل ترکہ ہے یا کتابت کے دوران اضافہ کیا گیا ہے کہ وہ جلد بندی میں کٹ بھی گیا ہے۔

بہر حال ان چند توجہ طلب باتوں کے علاوہ مجموعی طور پر یہ بڑی خدمت ہے اور اس کی اشاعت پر دائرۃ المعارف، مبارکباد کا مستحق ہے، مزید خوشی اس بات سے ہے کہ حضرت مولانا امجد علی صاحب کی دیگر غیر مطبوعہ چیزوں کی اشاعت کا بھی پروگرام ہمیشہ نظر ہے، خاص طور پر معانی الآثار کے نصف اول کے حاشیہ عربی کی اشاعت جلد ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں تعارف کے دوران جو یہ کہا گیا ہے کہ طحطاوی جیسی کتاب پر اب تک کسی نے کوئی کام نہیں کیا یہ درست نہیں، علامہ عینی کی رد شرعی میں

جو غیر مطبوعہ ہیں، مولانا دھرم داسی احمد سورتی (مولانا امجد صاحبؒ کے استاذ مرحوم) کا عربی حاشیہ، کسی بار چھپ بھی چکا ہے، مولانا محمد یوسف صاحب کا ندعلوی مرحوم کی عربی شرح کی تین جلدیں چھپ چکی ہیں۔ محترم مولانا محمد عاشق الہی صاحب بلند شہر، رفقیم مدینہ منورہ، طحاوی کی شرت میں مشغول ہیں جس کی ایک جلد طبع ہو چکی ہے مگر اس کا علم ابھی ہندوستان کے علمی حلقوں کو کم ہے اور اس کتاب کی وہ خدمات ان کے علاوہ ہیں جو متقدمین نے کی ہیں اور کشف الظنون وغیرہ میں ان کا تذکرہ ہے ضرورت ہے کہ ان کے مخطوطات تلاش کر کے اشاعت کا بندوبست کیا جائے۔ دعا ہے کہ ادارہ جادہ مستقیم اور راہ اعتدال پر قائم رہتے ہوئے ترقی کرے اور نشر و اشاعت کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دے۔

محدثین کی قوت حفظ تاریخ کی روشنی میں: از محمد ابو بکر غازی پوری۔ تقطیع متوسط ۲۲x۲۹ صفحہ ۱۹۲، ثابت بہتر طباعت معمولی۔ قیمت - / ۱۵ روپے پتہ: المکتبۃ الاثریہ، قاسمی منزل، سید واڑہ، غازی پور۔ اتر پردیش

کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے، اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اگرچہ کتابت بھی خاصی تعداد میں پائی جاتی تھی مگر اس کا رواج کم تھا، رفتہ رفتہ اس کو ترقی ہوئی، اس سے قبل علوم اسلامیہ کی حفظ و بقا انسان کی قوت یادداشت پر ہی موقوف تھی آج ہم اس بے پناہ قوت حافظہ کا پورا تصور نہیں کر سکتے بلکہ یہ واقعات اگر حد تو اترا تک نہ ہوتے تو آج ان پر یقین کرنا مشکل تھا۔ فاضل مرتب نے ۵، محدثین کی قوت حافظہ کے خاص خاص واقعات مستند کتب تاریخ و طبقات سے جمع کر کے ایک مفید کوشش کی ہے کتاب کے شروع میں فاضل محترم جناب قاضی الہر مبارکپوری صاحب کا مقدمہ بھی سجائے خود ایک کام کی چیز ہے۔ قاضی صاحب نے جو زبان و بیان کی کچھ کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا ہے ہم بھی اس مشورے میں شرمک



ہیں، زبان و ترتیب کے سلسلے میں بھی دو ایک باتوں کی طرف توجہ دلانا مفید ہوگا، لفظ ”ترجمہ“ تذکرے اور سوانح کے معنی میں اردو میں مروج نہیں ہے، بلکہ ایک الگ معنی میں مستعمل ہے۔ تذکرے کے اخیر میں حوالے میں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ فلاں کتاب میں یہ حالات فلاں کے ترجمے میں ہیں جبکہ اسی کے حالات لکھے جا رہے ہیں، ہاں متعلقہ شخص کے حالات کسی دوسرے شخص کے حالات میں ضمناً آجائیں تو وہاں یہ وضاحت ضروری ہوتی ہے۔ محدثین کے تذکرے میں ابن سیدہ (ص ۱۲۳) بے محل نظر آتے۔

ان چند مشوروں سے کتاب کی اہمیت و افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، یہ تاریخی دلچسپی کا سامان ہونے کے علاوہ دفاع عن الحدیث کی بھی عمدہ کوشش ہے۔ خدا کرے کتاب مقبول خاص و عام ہو۔

۳۔ مجلتہ الجامعۃ السلفیہ (عربی) عدد خاص بموتمر الدعوة والتعليم (الجزء الاول والثانی) رئیس التحریر مقتدی حسن الازہری، تقطیع کلاں صفحات ۳۳۸، ٹائپ پر معیاری طباعت سالانہ قیمت ۲۸ روپے، پتہ: جامعہ سلفیہ بنارس۔

جامعہ سلفیہ بنارس اپنی گونا گون خدمات اور مختلف النوع کارناموں کی وجہ سے کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا ہے۔ ملک کے بالکل نو عمر عربی مدارس میں غالباً یہ سب سے کامیاب مدرسہ ہے۔ اس نے ۲۲، ۲۳، ۲۴ فروری ۱۹۸۱ء میں عظیم الشان مؤتمر دکانفرنس (بلائی جس میں ہندو بیرون ہند مکہ معظمہ، کویت اور دیگر عرب ممالک کے علماء و زعماء نے شرکت کی اور جو شریک نہ ہو سکے انھوں نے اپنے پیغامات بھیجے، کانفرنس بڑی کامیاب اور حوصلہ افزا رہی۔ یہ مجلہ جامعہ کا ترجمان ہے اور یہ شمارہ اس کا خاص نمبر ہے۔ جامعہ سلفیہ اور مجلہ کے مدیران قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس کے جملہ پروگراموں کو بڑے سلیقے سے مرتب و منضبط کر کے اس خاص نمبر میں محفوظ کر دیا، جو لوگ کانفرنس میں شریک ہو کر تمام پروگرام خود دیکھ اور سن چکے ہیں یہ

خاص اشارہ ان کے لیے بھی مفید ہے اور خاص طور پر ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو وہاں پہنچ نہیں سکے تھے، اس شمارے میں جماعت اہل حدیث کی علمی و اصلاحی کوششوں کی روداد اور اس کی مختصر تاریخ پر بھی روشنی پڑ گئی ہے۔

عربی تحریر بھی عمدہ ہے اور مضامین اور خیالات میں فراخ دلی اور وسعت ہے جو باعث مسرت و اطمینان ہے، بس ایک چیز ذرا کھٹکی کہ جن خدمات کو مسلمانان ہند کی خدمات کا عنوان دیا جانا زیادہ صحیح تھا وہاں جماعت اہل حدیث کی خدمات کا عنوان دیا گیا ہے، یہ درست ہے کہ مسلمانان ہند کی ہر نوع کی خدمات میں جماعت اہل حدیث کے افراد بھی شامل ہیں مگر کسی ایک اکالی کو عنوان جامع بنانے سے غلط فہمیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور باہمی قرب و یگانگت پر بھی اس کے ناپسندیدہ اثرات پڑتے ہیں۔ اس ایک بات کے علاوہ ”ایں خانہ ہمہ آفتاب است“ خدا کرے مستقبل میں ہم سب آپس میں اور زیادہ قریب ہو سکیں اور ایک دوسرے کی خدمات کو اور زیادہ فراخ دلی اور انصاف سے تسلیم کر سکیں بلکہ ایک قدم اور بہار اُن کسی کو بڑھتا دیکھ کر اندر کی گہرائیوں سے خوش ہونے لگے۔ اِذْ كُنْتُمْ اَحْدَاۗءَ قَالَفْ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاصْحَحْمُۥ بِمَنْجَمٰہِ اٰخَوَانَا : مجملہ کے شروع میں صرف ایک صفحہ میں کانفرنس کا اجمالی تعارف ضرور آنا چاہیے تھا اگر کس ادارے نے کس شہر میں کن مقاصد کے تحت یہ کانفرنس منعقد کی اور کتنے ممالک کے نمائندے اس میں شریک ہوئے

۳۔ الابیات المقدسہ : از تروڈ وورد عربی (تقطیع متوسط ۲۲۳ x ۱۸)

صفحات ۱۸۸۔ سادہ ہاتھ سے لکھ کر فولڈولی ہوئی طباعت : قیمت -/۱۵

پتہ : دارحافظہ لطباعتہ والنشر - ۱۳۔ میلاپورن اسٹریٹ۔ مدراس ۱۳۔

دنیا کی مختلف قوموں کی قدیم اساطیر کی طرح درادڑ قوم جو ہندوستان کی قدیم ترین قوم اور سب سے قدیم ہندوستانی تہذیب کی امین ہے کی یہ قدیم ترین

علمی و تاریخی یادگار ہے جس کا زمانہ دو سو سال قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ یہ ٹہل زبان کا منظوم کلام ہے جو ۳۳ فصول اور ۱۳۳۰ ابیات پر مشتمل ہے، اس میں زندگی کے مختلف حالات کے متعلق حکمت و نصیحت کی باتیں ہیں۔ اس کتاب کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں، اب ملک کے نامور فاضل و مصنف جناب مولانا محمد یوسف کوکن صاحب نے اس کو عربی زبان میں مستقل کیا ہے۔

دنیا کی بہت سی قدیم کتابوں کی طرح اس کتاب کے مصنف کے حالات بھی پردہ اخفا میں ہیں چند باتیں جو معلوم ہیں اور مترجم نے مقدمے میں ذکر کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے علم و فضل سے متاثر ہو کر ایک بڑے تاجر نے ان کو اپنے پاس بلا لیا تھا اور اپنے بیٹے کے لیے کچھ نصائح لکھنے کی فرمائش کی تھی اس پر یہ مجموعہ تیار ہوا تھا۔ اصل کتاب کا نام ہے ”تزوکرل“ جس کا لغوی ترجمہ ”الابیات المقدسہ“ ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے الکلمۃ الحکمت ضالۃ المومن فحیث وجدھا فھو احق بھاد ترمذی ابن ماجہ عن ابی ہریرۃ (یعنی دانائی کی بات مومن کی متاع گم شدہ ہے وہ اسے جہاں بھی ملے یہی اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ مولانا کوکن صاحب علمی حلقوں کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے وہ دانائی کی باتیں جو ٹہل کے نہاں خانے میں محفوظ تھیں عربی و انگریزی دانوں کے لیے سہل الحصول بنادیا۔)

## تعلیمی چہل حدیث

دینی تعلیمی بورڈ کے نگران اور جمیعۃ علماء ہند کے سابق ناظم مولوی وحید الدین فاضل کی مرتبہ: نہایت عمدہ اور اعلیٰ کاغذ پر فوٹو آفسٹ کے ذریعے بڑے سائز پر مطبوعہ، قابل قدر کتاب۔ قیمت - ۶ روپے



- ۱۹۵۳ء - حیات طبع محمد الحق محدث دہلوی۔ معلم و اعلیاء۔ اسلام کا نظام طلب و محنت۔  
تاریخ حبشیہ، تاریخ ملت جلد ہفتم
- ۱۹۵۵ء - اسلام کا رنگی نقشہ آریض اور بیت برون، تاریخ علم و فن، تاریخ ملت جلد ہفتم، اسلام کا رنگی نقشہ  
تذکرہ علماء و محدثین ہر حرکت میں
- ۱۹۵۶ء - ترجموں، شمس جلد ثالث، اسلام کا نظام حکومت و طبع جدید و جدید ترتیب، مدنی انواری  
سب سے معلومات، علم و رسم جلد ہفتم، سرین و راجل میت کریم کے، بی تعلقات
- ۱۹۵۷ء - لغات سفر، تاریخ و جغرافیہ، تاریخ ملت جلد ہفتم، اسلام کا رنگی نقشہ  
لغات الفرق، اسلام کا رنگی نقشہ، تاریخ ملت جلد ہفتم، اسلام کا رنگی نقشہ
- ۱۹۵۹ء - حدیث عمر، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب  
تفسیر شری، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب
- ۱۹۶۰ء - ۲۰۲۴ء - حضرت بریکر صدیق، سرور و غریب، سرور و غریب  
۱۹۶۱ء - تفسیر شری، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب
- ۱۹۶۲ء - تاریخ اسلام، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب
- ۱۹۶۳ء - تفسیر شری، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب
- ۱۹۶۴ء - تفسیر شری، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب
- ۱۹۶۵ء - تفسیر شری، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب
- ۱۹۶۶ء - تفسیر شری، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب
- ۱۹۶۷ء - تفسیر شری، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب
- ۱۹۶۸ء - تفسیر شری، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب
- ۱۹۶۹ء - تفسیر شری، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب
- ۱۹۷۰ء - تفسیر شری، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب
- ۱۹۷۱ء - تفسیر شری، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب
- ۱۹۷۲ء - تفسیر شری، سرور و غریب، سرور و غریب، سرور و غریب

اگست ۱۹۸۱ء

نَدْوۃ اَلدِّیْن دِلّی کَالِمی و دینی مآہنامہ

سُرگال

قیمت سالانہ : بیس روپے

مُرَتَّب  
سعد احمد کسرا بادی

# برہان

جلد نمبر ۸۷ شوال ۱۴۰۱ھ مطابق اگست ۱۹۸۱ء شماره نمبر ۲

نظرات  
سید احمد اکبر آبادی  
مقالات

- ۱۔ پیغمبر اسلام کے تعمیراتی معجزے
  - ۲۔ خدا پرستی اور ماویت کی جنگ
  - ۳۔ مسئلہ رویت ہلال جدید سائنسی تحقیق کی رکشائی میں
  - ۴۔ مولانا عزیز گل اسیر الما سے ایک ملاقات:
  - ۵۔ تبصرے
- پر فیسر محمد حسین انصاری، صدر شعبہ  
۵ سوال نمبر ۱۰۱۱ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ  
مولانا سید کاظم صاحب نقوی، ریڈر  
۱۹ شعبہ دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ  
از جناب ضیاء الدین لاہوری،  
۳۱ ایم۔ اے  
پر فیسر محمد اسلم، استاذ شعبہ تاریخ پنجاب  
۳۷ یونیورسٹی، لاہور:  
۵۵



# نظرات

پچھلے دنوں علی گڑھ اور دیوبند پر علی الترتیب جو نظرات قارئین کرام کی نظروں سے گزرے ہیں ان کو پڑھ کر متعدد حضرات نے خطوط لکھے ہیں، یوں تو ان خطوں میں مختلف باتیں ہیں جو ہر ایک نے اپنے نقطہ نظر سے لکھی ہیں، لیکن ایک سوال سب میں مشترک ہے، ایک فاضل مکتوب نگار کے نقطوں میں وہ سوال یہ ہے: مگر مولانا! یہ تو بتائیے، اس کی کیا وجہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج، یہی دو بنیادی اور اساسی ادارے تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کو دینی اور دنیوی اعتبار سے حیات نو دی اور ان کے لیے نشاۃ ثانیہ کا سر سامان کیا ان دونوں اداروں نے جو اکابر علم و ادب اور مشائخ ارشاد و ہدایت پیدا کیے وہ اپنی مثال آپ تھے، لیکن آج معاملہ برعکس ہے اور وہ نتائج پیدا نہیں ہو رہے ہیں، آخر یہ کیوں؟ اس میں شک نہیں کہ سوال فی نفسه اہم اور قابل توجہ ہے، ہم ذیل میں اس کا جواب عرض کرتے ہیں:

اصل یہ ہے کہ یہ دونوں ادارے اصلاحی معنی میں صرف دو تعلیم گاہیں نہ تھے، بلکہ ایک عظیم الشان اور انقلاب آفریں تحریک کے دو مظہر تھے، ان اداروں کے بانیوں اور ان کے ساتھیوں نے ۱۸۵۷ء کے نتیجے میں اسلام اور مسلمانوں کی تباہ کاری کا دردناک منظر خود اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اس لیے ان کے دلوں میں تڑپ تھی، خلوص اور عزم

تھا، ان سب چیزوں نے مل کر ایک جذبہ کی شکل اختیار کی اور اس جذبہ نے ایک تحریک کو جنم دیا۔ چونکہ جذبہ جو عمل کا اصل محرک ہوتا ہے بہت قوی تھا اس پر ان حضرات کے عمل میں بھی خلوص اور مقصدیت کا رنگ تھا، اس تحریک کا رخ انگریزوں کی حکومت اور اس سے پیدا شدہ خطرات اور اندیشوں کی طرف تھا۔ اس لیے ملک آزاد ہوا اور انگریزی حکومت ختم ہو گئی تو یہ تحریک جو اپنے مقصد میں بہم و جہ کا میاب رہی تھی خود بخود ختم ہو گئی اور اس بنا پر جو ادارے اس تحریک کی اساس پر قائم ہوئے تھے محض رسمی ادارے ہو کر رہ گئے، یعنی

رہ گئی رسم اذان روح بلالی نہ رہی

۱۔ علم کے بعد ملک میں اور ساتھ ہی تمام دنیا میں جو سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات پیدا ہوئے ان کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں میں ایک نئی تحریک پیدا ہو اور یوں نیا دھارے علی گڑھ اس نئی تحریک کا منظر ہوں، جدید حالات اذان کے تقاضوں کے پیش نظر علماء کو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ پہلے دارالعلوم قائم ہوا تھا برصغیر کے مسلمانوں کو لادینی اور گمراہی سے محفوظ رکھنے کے لیے، لیکن اب ضرورت ہے پوری دنیا کو اس ہلاکت و بربادی سے بچانے اور محفوظ رکھنے کی جو اس کی خدا ناشناسی کے باعث اس کے سر پر منڈلا رہی ہے علماء کو محسوس کرنا چاہیے تھا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمت للعالمین بنا کر کافری و انسانی کی طرف مبعوث فرمائے گئے ہیں اور مسلمانوں کو قرآن میں شہید ۱۷۱ للناس، کا لقب دیا گیا ہے تو بے شبہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان پر عائد کی ہوئی ذمہ داری ہے کہ وہ صرف اپنی اور اپنے ہم مذہبوں کی نہیں بلکہ ساری دنیا کی فکر کریں، سخت افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ آج اگر یہ جذبہ ہے تو عیسائیوں میں اور کمیونسٹوں میں ہے، چنانچہ ان کے تعلیمی ادارے اذان کا نظم و نسق اسی عالمی

تحریک کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ہے لیکن یہ جذبہ نہیں ہے تو ہمارے مسلمانوں اور ان کے علماء میں نہیں ہے۔

اسی طرح اربابِ علی گڑھ کو سوچنا چاہیے تھا کہ سرسید کی تحریک شکستہء میں ختم ہو گئی، آزادی کے بعد ملک میں ایک سیکولر جمہوری حکومت قائم ہوئی ہے، تقسیم کے نتیجہ میں تریوں عالی اور سپہاندگی کے اعتبار سے مسلمان پھر اسی مقام پر لوٹ گئے ہیں جہاں وہ سرسید کے زمانہ میں تھے، علاوہ ازیں یہ زمانہ سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی اور عروج کا ہے، دنیا میں اب وہی قوم زیادہ طاقتور مضبوط، خوشحال اور ترقی یافتہ ہو سکتی ہے جس نے سائنس اور ٹکنالوجی میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہوں، ان سب اندرونی اور بیرونی فیشل اور انٹر فیشل حالات کا تقاضا تھا کہ شکستہ کے بعد مسلمانوں میں پھر ایک تحریک (وہ تحریک جس کی بنیاد ایک جذبہ بے قرار پر ہو) پیدا ہوتی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اس تحریک جدید کا منظر ہوتی۔

بہر حال گزارش کا مقصد یہ ہے کہ دیوبند اور علی گڑھ آج جس اختلال و انتشار اندو سے دوچار ہیں اس کی دیر ہمارے نزدیک یہ ہے کہ یہ دونوں ادارے جس عظیم انقلاب آفریں تحریک کے ناکندے تھے وہ تو ختم ہو گئی اور اس کے بجائے جو ایک نئی تحریک دیوبند اور علی گڑھ میں پیدا ہونی چاہیے تھی وہ پیدا نہیں ہوئی اس بنا پر یہ ادارے ان پودوں کی طرح ہو گئے جن پر موسم کی رعایت سے کاٹ چھانٹ یا آب رسانی کا کوئی عمل نہ کیا گیا ہو اور ہر موسم میں انھیں ایک ہی حالت پر رکھا گیا ہو۔

ایک طبیب حاذق کا فرض ہے کہ وہ ایک نسخہ پر ہی قناعت نہ کرے بلکہ مریض کی حالت میں جو تغیر تبدیل پیدا ہوتے رہے اسی کی رعایت سے وہ اپنے نسخہ میں بھی اول بدل کرتا رہے۔



# پیغمبر اسلام کے تعمیراتی معجزے

پروفیسر محمد یسین انصاری صدر شعبہ رسول انجینئرنگ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

”اصل مضمون انگریزی میں تھا۔ ہماری درخواست پر محمد کرم خان صاحب لکچرار انجینئرنگ کالج مسلم یونیورسٹی نے اس کا ترجمہ کیا ہے، برہان دونوں حضرات کا شکر گزار ہے۔ (برہان)

تاریخ شاہد ہے کہ ماضی میں مسلمانوں نے مختلف علوم و فنون، صنعت و حرفت، فلسفہ اور سائنس کی غیر معمولی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی۔ ایک تعمیراتی کے میدان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے نہ صرف ایک اچھوتے طرز تعمیر کی بنیاد ڈالی اور نئی اشیائے تعمیر دریافت اور استعمالات کیں بلکہ نئے اصول تعمیر بھی وضع کیے۔ گو کہ عظیم اسلامی عمارات کے بارے میں فنون لطیفہ کے نقطہ نظر سے داور اور معقول تحریری مواد ذخیرہ کی حد تک موجود ہے لیکن بد قسمتی سے ابھی تک فن تعمیر ساخت کو ذہن میں رکھتے ہوئے مسلمانوں کے ان تعمیری شاہکاروں کے طرز تعمیر، اصول تعمیر فن اور اسلوب تعمیر کی طرف خاص خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ پیش نظر مقالے میں مقالہ نگار نے محققین کی توجہ اسلامی فن ساخت اور اصول تعمیر کے اہم لیکن نظر انداز شدہ پہلوؤں کی طرف مبذول کرتے ہوئے اس مطالعے کی اہمیت

دافادیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس ذیل میں مقالہ نگار کی رائے میں ابتدا میں اور بجا طور پر مسیح نبویؑ اور غزوہ خندق کی خندق کے تعمیری پہلوؤں کا جائزہ لینا بہتر اور مناسب ہوگا۔ مذکورہ دونوں منصوبوں کا تجزیہ آج سے چودہ سو سال پیشتر کے پس منظر میں کرنے سے یہ امر پائیدار ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ یقیناً بغیر اسلام ان کے رفقاء کا رخ اور پیروؤں کو تائید یزدی اور نصرت خداوندی حاصل تھی۔

آغا خاں وقف کے پروگرام کے تحت ہارورڈ یونیورسٹی اداہیم آئی ٹی میں مسلم فن تعمیر و ساخت پر حال میں جو تحقیق و تدوین کا کام شروع کیا گیا ہے اس میں اسلامی فن تعمیر کے اصولوں کا تکنیکی اور فنی نقطہ نظر سے مطالعہ فن تعمیر میں گراں قدر اضافے کا موجب ہوگا۔ درحقیقت اسلام اور اسلامی ثقافت لازم و ملزوم اور ایک دوسرے کا لاینفک جز ہیں اور دین کا خیال آتے ہی اسلامی ثقافت کا تصور بھی ذہن میں پیدا ہوتا قدرتی امر ہے۔ روزانہ کا استعمالی سامان مثلاً پانی کا بلوریں ترا بہ شمشیر و سناں مساجد و مدارس۔ پل اور سرائے، تالاب اور نہریں غرض کہ بقول ذوق فیض کے کل اسباب اسلامی ثقافت کا مظہر ہیں۔ چونکہ اسلامی نقطہ نظر سے دین کے مقابلے میں قوم کا کوئی تصور اور حیثیت ہی نہیں ہے اس لیے یہ عظیم عمارات اور رفاہ عام کے تمام کارنامے مذہب سے بلا واسطہ متعلق و منسلک ہیں۔ میرے خیال میں مورخین، فن تعمیر کے ماہروں اور مہندسین کی امداد سے، اسلامی عمارات کی ساخت کی تفصیل، تعمیر کے اصولوں اور تکنیکی پہلوؤں کو نمایاں اور بہتر طریقہ سے پیش کر سکتے ہیں اور یقیناً اس مشترکہ کوشش سے معلومات کا بیش بہا خزانہ حاصل ہو سکتا ہے۔

اسلامی تعمیرات کو مندرجہ ذیل ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مذہبی اداہے :

اس ذیل میں مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں اور مقبرے شامل کیے جاسکتے ہیں۔ یہ عمارات اپنے دورِ تعمیر کے لحاظ سے وقتی اسلامی طرز فکر کی نشاندہی کر سکتی ہیں۔

۲۔ تعمیرات برائے رفاہ عام :

شفا خانے، کارواں سرائے، باغات، نہریں، پل، عوام کے تحفظ کے لیے بنائی گئی شہر بنائیاں اور رفاہ عامہ کی دیگر تعمیرات اس ذیل میں شامل ہیں۔

۳۔ رہائشی تعمیرات۔

محلات شاہی، قلعے اور حکومت سے متعلق دیگر عہدہ داروں مثلاً وزراء، ججوں، افسران و فوج اور محظوظوں کی رہائش گاہیں۔

اسلامی طرز عمارت (Islamic Architecture) مختلف دوروں میں مندرجہ ذیل نام دیے گئے۔

- ۱۔ عربی طرز: چونکہ اس کو ابتداء میں عربوں نے رائج کیا۔
- ۲۔ اسلامی: مسلم یا محمدی طرز۔ چونکہ مسلمانوں نے اولاً اس طرز تعمیر کو اختیار کیا۔
- ۳۔ سارسینک طرز: یہ یونانی لفظ عرب کے بدوی قبائلیوں کے لیے صلیبی مجاہدوں اور رومنوں نے استعمال کیا اور متعلقہ طرز کو سارسینک طرز تعمیر کہا۔
- ۴۔ مور طرز: شمالی افریقہ کے مسلمانوں کو مور کہا جاتا ہے۔
- ۵۔ ترکی طرز: جو ابتداء میں سلجوقیوں نے اور بعدہ عثمانی ترکوں نے اختیار کیا۔
- ۶۔ مغل طرز: وسط ایشیا سے ہندوستان میں وارد ہونے والے مغل حکمرانوں سے منسوب ہے۔

اسلامی طرز تعمیر کے لیے چاہے کوئی سا بھی لفظ استعمال کیا جائے یہ امر مسلمہ و مصدقہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک نئے اور منفرد طرز تعمیر کا آغاز کیا جو یقینی طور پر بازنطینی، رومن، عیسائی اور ساسانی طرز ہائے تعمیر سے قطعی مختلف اور اچھوتا ہے۔ بنی عباس اور



ہنی اُمّیہ کے عہد میں وقتی اور دینی ضروریات کے تحت اس میں اصلاحات بھی ہوئیں اور اضافے بھی لیکن ساتھ ساتھ، اسلامی تعلیمات کے عین مطابق یہ خیال بھی رکھا گیا کہ مفتوح اقوام کے فنون لطیفہ اور طرز کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

اندلس کے محلات الحمراء و مدینۃ الزہراء۔ مراکش اور رباط کے آثار قدیمہ۔ قاہرہ کے پرشکوہ ایوان۔ سلطنتیں اور مہرہوں صدق میں عثمانی۔ صفوی اور مغل حکمرانوں کی تعمیر کردہ مساجد اور دیگر عمارات۔ اصفہان کی مسجد شاہی۔ استنبول کی پربلال عبادت گاہیں۔ دہلی کی جامع شاہجہانی اور آگرہ کا تاج محل عرب کے ایک بوریہ نشین کے ظلاموں کے دور اقتدار کی زندہ یاد گاریں ہیں اور یقیناً فن تعمیر کی شاہراہ پر سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

### عربوں کی علمی جستجو

”نیل کے ساحل سے لے کر تاجک کاشتگر“ تمام اسلامی عمارات ایک مخصوص طرز تعمیر اصول ہائے تعمیر اور تکنیک کی نشاندہی کرتی ہیں۔ تکنیکی اور تعمیری نقطہ نگاہ سے ان عمارات کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں:

۱۔ دیواروں کا درمیانی فاصلہ (Span) فاصلہ ۱۵۶ فٹ وسیع اور ۱۲۵ فٹ سے زائد بلند گنبد۔

۲۔ محرابیں۔ مینارا اور قوسین۔

۳۔ پویند کاری۔

۴۔ آرائشی حروف و الفاظ

۵۔ پیتوں۔ پھولوں اور مینا کاری سے عمارتوں کی آرائش و زیبائش

۶۔ آرائشی صیقل شدہ چمکدار مائلیں

۷۔ باغات اور فوارے۔

یہاں یہ تذکرہ کرنا مناسب نہ ہوگا کہ فی زمانہ اتنی ترقی اور جدید آلات و وسائل کے باوجود ایک سو پچاس فٹ سے زائد وسیع (Span) تعمیر فی نقطہ نگاہ سے خاصی اہمیت رکھتی ہے اور اسی سے ایک سو پچاس فٹ سے زائد وسعت (Span) کی تعمیرات کا کارنامہ انجام دینے والے ماہرین فن کی خدا اعتمادی اور خود اعتمادی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بلاشبہ ان عظیم عمارات کی اساس مسلمانوں کا علمی ذوق جستجو اور غیر متزلزل قوت عمل قرار دی جاسکتی ہے چونکہ مسلمانوں کے لیے مکمل ضابطہ حیات قرآن حکیم صریح و واضح الفاظ میں مسلمانوں کو فاضلوں اور دشواریوں سے بے نیاز ہو کر علم کے حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے اور خود ارشاد نبویؐ ہے :-

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَكُلُّهُ كَانَ بِالصَّيْنِ۔

ابتدائے اسلام سے ہی پیشوائے اسلام کے احکامات کے مطابق علم دوستی اور علم پروری مسلمانوں کا شیوہ رہا ہے اور اس علم پروری اور عالم نوازی کی وجہ سے ہی بہت سے یونانی علوم و فنون سے عربوں کو مستفید ہونے کا موقع ملا اور مسلمانوں کی تحقیقی جستجو اس حد تک بڑھ گئی کہ جب ان کو یونانی کتابوں کے عربی تراجم سے تشفی نہ ہوئی تو انھوں نے اصل یونانی کتب سے رجوع کیا۔

### کارہائے نمایاں

یوں تو شرعی احکامات کے مطابق خلیفہ اسلام کا فرض اولین مفتوحہ ممالک میں تبلیغ اسلام کے لیے مساجد اور مدارس کا قیام ہے اور اس پر عمل بھی کیا جاتا رہا ہے لیکن اس کے علاوہ دمشق۔ بغداد۔ غرناطہ۔ قاہرہ۔ سمرقند اور قرطبہ میں دینی مدارس کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کے اعلیٰ تعلیمی مراکز بھی مسلمانوں نے قائم کیے۔

نمونے کے طور پر اسپین میں اسلامی حکومت کے دارالسلطنت قرطبہ، جسے اس

زمانے میں سچا طور پر اُمّ الحکماء۔ سراج الاندلس اور دارالاسلام کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا، اس کے اعداد و شمار کے مطالعے سے عرب کے صحرائیوں کے عروج و کمال فن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

قرطبہ سے متعلق اہم اعداد و شمار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

طول و عرض	۲۳ میل x ۴ میل
کل آبادی	۱۰۱ x ۱۰۴ نفر
مکانات مع ۸۰۰۰۰ دوکانات	۱۰۵ x ۲۰۶
شفا خانے	۵۰
مساجد و حمام و محلات	۳۰۰۰
عوامی دارالمطالعے	۷۰

خلیفہ الحکم ثانی کے کتب خانے میں کتابوں کی تعداد

مذکورہ کتب خانے میں ہر ستوں کی تعداد باعتبار علوم و فنون

ان اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ قرطبہ میں ہر پانچ افراد کے لیے ایک مکان ہر بی ہزار

(۲۰۰۰۰) افراد کے لیے ایک شفا خانہ، ہر ۳۳۳ افراد کے لیے ایک مسجد اور ۶۶ x ۱

کتابیں فی نفر میسر تھیں۔ ہمارے زمانہ میں پانچ افراد کے لیے ایک مکان معیاری تصور کیا

جاتا ہے۔ اسی طرح سے اگر بغداد سے متعلق تفصیلات کا جائزہ لیا جائے تو یہ امر پائے

تصدیق کو پہنچ جاتا ہے کہ اس دور میں مسلمان ترقی کے بام عروج تک پہنچ چکے تھے مثلاً

خلیفہ منصور عباسی کے عہد حکومت میں بھی ہر پانچ افراد پر ایک مکان کا اوسط تھا بیارو

کے لیے شفا خانوں اور حکومت سے لائسنس یافتہ اطباء کا نہایت معقول انتظام تھا۔

اس وقت اقوام یورپ کی حالت علمی اعتبار سے کیا تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے

کہ جب کہ حجاز کے امی نبیؐ کا حکم ان غلام ”خلیفۃ المسلمین“ ایک عظیم ذاتی لائبریری کا



مالک تھا اسی کا ہم عصر ایک فرانسیسی حکمران باوجود اپنی تمام تر کوششوں کے اپنی شاہی لائبریری کے لیے ۹۰۰ سے زائد کتابیں فراہم نہ کر سکا اور مذکورہ کتب خانے میں مذہبی کتب کی تعداد صرف ایک الماری پر مشتمل تھی۔

### طریقہ حصول تعلیم

اس زمانے میں اکتسابِ علم کے دو اسلوب مروج تھے

۱۔ عربی اسلوب: جس کی اساس آزادانہ استفسار، تجرباتی و تحقیقی مشاہدہ اور متعلقہ نتائج پر مبنی تھی۔

۲۔ دوسرا اسلوب: جس کی کتابوں میں موجود عالموں کی آراء کو ہی بنیادی اور حرف آخر تصور کیا جاتا تھا۔

نتیجہ کے طور پر پہلا اسلوب تعلیم مسلمانوں میں متعدد سائنس دانوں، ماہرینِ کیمیا، اطباء، ماہرینِ ریاضی، ہندسین اور دیگر علوم و فنون کے بہت سے ماہرین کے وجود کا باعث ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی تحقیقی جبلت اور استفسار کی قدیمی عادت کے باعث محض تین چار صدیوں میں تعلیم و تحقیق کے میدان میں عرب یونانیوں کے مقابلے پر انہیں زیادہ آگے نکل گئے جبکہ یونانی اس میدان میں مدت طویل اور عرصہ قدیم سے سست رہے اور سرگرم عمل تھے۔

### نبوی فن تعمیر

اس ضمن میں رسولِ درو کی دو اہم تعمیرات کو بھی طور پر موضوع بحث بنایا جاسکتا ہے:

اولاً: مسجد نبوی کی تعمیر

ثانیاً: شہرہ خندوں میں خندق کی کھدائی

### اولاً مسجد نبوی

مسجد نبوی مدینہ منورہ میں رنی رہ عمارت ہے جو مسجد قبا کے بعد اسلامی طرز تعمیر و

ساخت کا اول ترین نمونہ ہے۔ مذکورہ مسجد کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی تعمیر پیغمبر اسلام کی ذاتی نگرانی میں کی گئی اور خود شہنشاہ دو عالم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے اس کی تعمیر میں بہ نفس نفیس حصہ لیا۔

### تفصیلات:

- ۱۔ پیمائش۔ اول ۷۰ ذراع x ۶۰ ذراع (۱۰۰ فیٹ x ۹۰ فیٹ) بعد ذراع مربع
  - ۲۔ سن تعمیر۔ ۱۰ھ ہجری
  - ۳۔ بنیاد۔ ۳ ذراع (۳ م ۴ فیٹ) گہری سطح زمین سے ۳ ذراع گہرائی تک پتھروں سے بنائی گئی۔
  - ۴۔ چھت۔ کھجور کے پتوں کے پٹاؤ سے بنائی گئی جن کو کھجور کے تنوں کے ستونوں پر قائم کیا گیا۔
  - ۵۔ فرش۔ مٹی کے پلاستر سے بنایا گیا۔
  - ۶۔ حادی دیوار۔ دھوپ میں خشک شدہ، خشک ہائے خام سے ۷ ذراع (۱۰ فیٹ) اونچی چار دیواری تعمیر کی گئی۔
  - ۷۔ مدت تعمیر۔ ابتدائے تعمیر سے تکمیل تک کل سات ماہ
- یہ مبارک و مسعود تعمیر بغیر کسی ظاہری نمود اور شان و شوکت کے ہادی برحقؐ کی ذاتی زندگی کی طرح اسلامی سادگی کا مکمل نمونہ تھی۔ ساتھ ہی میں شاہجہان آباد اور غرناطہ، قرطبہ و بغداد، دمشق اور قاہرہ، اصفہان و سمرقند کے معماروں کے آقائے نامدار نے چند حجرے اہیات المومنینؑ کے لیے کھجور کی پتیوں اور چٹائی سے تعمیر فرمائے۔ یہ طرز تعمیر فخر الانبیاء شہنشاہ دو جہاں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی سادہ زندگی اور توکل علی اللہ کا ضرب المثال نمونہ اور مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

ثانیاً: غزوہ خندق

یہ معرکہ حق و باطل رمضان المبارک ۵ شہ مج میں ۶ تا ۲۷ دسمبر پیش آیا۔  
مجاہدین اسلام کی تعداد تین ہزار تھی جبکہ لشکر مشرکین بارہ ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ اس  
غزوہ میں ۶ مجاہدین اسلام نے جام شہادت نوش کیا اور مخالفین کے ۸ افراد ہلاک  
ہوئے۔ محمد حمید اللہ صاحب کی تحقیقات کے مطابق خندق کی ماخذی پیمائشی  
تفصیلات حسب ذیل ہیں:

۳۶۵ میل

لمبائی

۳۰ فٹ

چوڑائی

۱۵ فٹ

گہرائی

۲۱ روز

دست تکمیل

۳۰۰۰

مزدوروں (مجاہدین) کی تعداد

مختلف ماخذوں سے حاصل شدہ معلومات کی بنا پر اور تکنیکی نقطہ نظر سے  
فرض کرتے ہوئے کہ خندق کی زمین جزوی طور پر پتھر، مٹی اور جزوی طور پر سخت مٹی  
پر مشتمل تھی خندق کا جائزہ موجودہ مروجہ پیمانوں کے مطابق لیا جاسکتا ہے۔  
بالغرض

اگر یہ کام انسانی محنت کے ذریعہ کیا جائے تو

کھودی جانے والی مٹی کی کل مقدار = ۳۰۸۰۰۰ مکعب گز

روزانہ کھودی جانے والی مٹی کی کل مقدار = ۶۶۶ و ۱۳ مکعب گز

فی نفر روزانہ کھودی جانے والی مٹی کی کل مقدار = ۹ و ۳ مکعب گز

موجودہ معیار کے مطابق روزانہ ایک آدمی کے ذریعہ کی گئی کھدائی اور مٹی کو باہر  
نکالنے کے کام کا تجربہ یہ حسب ذیل ہے:



روزانہ فی نفر معمولی مٹی میں کھدائی کی مقدار = ۳۴ م ۶ م ۳ مکعب گز

روزانہ فی نفر سخت مٹی میں کھدائی کی مقدار = مندرجہ بالا سے کافی کم

۳۴ م ۶ م ۳ مکعب گز فی روز فی نفر کی دس سے مطلوبہ افراد کی تعداد = ۳۴ م ۶ م ۳ / ۱۳۲۶۶

= ۳۰۰۰ نفر

جبکہ صحابہ کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔

۲۱ روز میں ۳۴ م ۶ م ۳ مکعب گز فی نفر فی روز کی دس سے ۳۰۰۰ نفروں کے ذریعہ

کی گئی کھدائی = ۳۰۰۰ مکعب گز، مذکورہ بالا کام کے لیے درکار ضروری ٹوکریوں کی

تعداد = مزدوروں کی تعداد  $\times \frac{1}{4}$  + ٹوٹ پھوٹ = ۱۰۰۰ + ۲۰۰۰ = ۳۰۰۰۔ مذکورہ

بالا کام کے لیے درکار ضروری پھاڑوں اور سیالچوں کی تعداد = مزدوروں کی تعداد

$\times \frac{1}{4}$  + ۱۰ فیصد ٹوٹ پھوٹ و مرمت = ۲۰۰۰ + ۲۰۰

توضیحات :

مندرجہ بالا تخمینہ میں مذکورہ کھدائی میں ۱۰۰ فیٹ (Lead) اور ۵ فیٹ،

(Lifting) زرخ کی گئی ہے۔ اگرچہ قوی امکانات اس بات کے ہیں کہ موقع پر صورت حال

اس سے سخت تر اور دشوار رہی ہوگی۔ یہ امر بھی نوٹ میں رکھنا ہوگا کہ سرزمین حجاز کی دھوپ

میں بالخصوص روزہ کی وجہ سے انسانی قوت کار میں کس قدر کمی واقع ہو سکتی ہے۔

نتیجہ کے طور پر یہ امر قابل غور ہے کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر نبی کریم صلی اللہ

علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کو حاصل شدہ دنیاوی وسائل کس قدر محدود تھے اور ان

حالات کے پیش نظر یہ امر مسلمہ ہے کہ بغیر امداد غیبی کے، صرف انسانی محنت سے یہ

کارنامہ ممکن نہ تھا، جو کہ یقینی طور پر پیغمبر اسلام اور فرزندانِ توحید کو حاصل تھی اس لیے

فتح غزوہ خندق سرکارِ دو عالم کے اہم معجزات میں سے ہے۔

علاوہ ازیں عام حالات میں گہائی کھدائی کرتے وقت پتھر ملی زمین کی غیر

موجودگی میں کھدے ہونے سے حصے کی عمودی دیواروں کو گرنے سے روکنے کے لیے پار باندھی جاتی ہے اس لیے یہ مفروضہ بھی غلط ثابت ہو سکتا ہے کہ موقع کی زمین جزوی طور پر سخت مٹی اور جزوی طور پر نرم مٹی پر مشتمل تھی چونکہ اگر کوئی پار نہیں باندھی گئی تو قوی امکان اس بات کا ہے کہ خندق کی زمین مکمل طور پر پتھری تھی۔

اگر متعلقہ علاقہ کی زمینی ساخت اور مٹی کے *Angle of repose* پر مزید تحقیقی کام کیا جائے تو اس سے مسلمانوں کو تائید ایزدی اور نصرت الہی کے حاصل ہونے کے مزید شواہد مہیا ہو سکتے ہیں۔

بصورت دیگر۔ اگر یہی کھدائی مشینوں کے ذریعہ کی جاتی اور کھدی ہوئی مٹی کو موقع پر ہی جمع کر دیا جاتا تو یہ فرض کرتے ہوئے کہ

کھودنے والی مشین کی صلاحیت کار = ۷ مکعب گز فی گھنٹہ فی بالٹی

کھودنے والی مشین کی مدت کار = ۲۰ گھنٹہ فی دن

کھودنے والی مشین میں فی گھنٹہ بالٹیوں کی تعداد = ۳۰

کھودنے والی مشین کے گھومنے کا نادیہ = ۱۲۰ ڈگری

$0.543 = \text{Job Management factor}$

کیفیت ارضی = سخت پتھری

روزانہ کھدائی کی مقدار = ۱۳۵ مکعب گز

نتیجہ :

فی گھنٹہ کھدائی کی مقدار =  $7 \times 0.543 \times 30 = 135$  مکعب گز

فی روز کھدائی کی مقدار =  $135 \times 20 = 2700$  مکعب گز

۷ مکعب گز فی بالٹی صلاحیت کار والی مشینوں کی درکار تعداد =  $2700 / 2 = 1350$  یعنی ۶ عدد

ٹوٹ پھوٹ اور تبدیلی کے پیش نظر مشینوں کی درکار تعداد = ۸ عدد

(80 % Availability factor)

اس طرح سے ہر تین فلائنگ پرایک کھدائی مشین (Drag line) استعمال کی جاسکتی ہے۔

علاوہ ازیں اگر ۲۵ مکعب گزی مٹی باہر لانے والی مشین (Bolton

Dumper) جس کا (Job Management factor) ۰.۶۳ ہے۔

فرض کیا گیا ہے مٹی کو باہر لانے کے لیے استعمال کیا جائے تو ۷ مکعب گزی گھنٹہ کھدائی کرنے والی مشین میں بالیٹوں کی تعداد ۳۰ کے بجائے ۲۵ کی جاسکتی ہے۔

اس لیے

روزانہ کھدائی کی مقدار  $= ۷ \times ۰.۶۳ \times ۲۰ \times ۲۵ = ۲۲۳۰$  مکعب گز

کھدائی مشینوں کی درکار تعداد  $= ۲۲۳۰ / ۱۳۶۶۶ = ۸.۱$  یعنی ۹ عدد

Dumper کی صلاحیت کار  $= ۳۵ \times ۰.۶۳ = ۲۲.۵$  مکعب گز

فی گھنٹہ ۶ چکر کرنے والی مٹی نکالنے کی دو مشینوں کی صلاحیت کار  $= ۲۲.۵ \times ۲ \times ۶ = ۲۶۷$  مکعب گز۔

مٹی نکالنے والی مشینوں کی درکار تعداد  $= ۷ \times ۲ / ۰.۵۸ = ۱۴.۵$  یعنی ۱۸ عدد۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک مسطح کرنے والی مشین ایک Grader اور ایک پانی چھڑکنے والی مشین بھی درکار ہوگی۔

تیسری صورت میں

چودہ مکعب گزی خود کار کھدائی مشین کا استعمال مکمل خشک زمین میں فرض کرتے

ہوئے کل درکار وقت

خندق سے نکلنے کا وقفہ  $= ۰.۲۵$  منٹ

مٹی ڈالنے کی جگہ مٹی ڈال کر لوٹنے کا وقفہ  $= ۰.۷۵$  منٹ



خندق میں کھدائی کی جگہ پہنچنے اور انتظار کا وقفہ = ۲۵ - منٹ

مٹی بھر کر مٹی ڈالنے کی جگہ تک پہنچنے کا وقفہ = ۵ - منٹ

کل درکار وقت = ۲۵ + ۵ = ۳۰ منٹ یعنی ۱ منٹ

فی گھنٹہ مشین کے چکروں کی تعداد =  $\frac{۳۳}{۲} = ۱۶.۵$  تقریباً

فی گھنٹہ کھدائی کی مقدار =  $۱۶.۵ \times ۱۳ \times ۲ = ۵۳$  مکعب گز

روزانہ ۲۰ گھنٹہ کام ہونے پر کھدائی کی مقدار =  $۵۳ \times ۲۰ = ۱۰۶۰$  مکعب گز

خود کار مشینوں کی کل کھدائی کے لیے درکار تعداد =  $\frac{۱۰۶۰}{۱۳ \times ۲} = ۴۰.۷۷$  یعنی ۴۱

۱۸ عدد

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل بھاری مشینیں کھدی ہوئی مٹی کو پھیلانے اور مشین کے آنے جانے کے راستے کو صحیح و درست رکھنے کے لیے درکار ہوں گی۔

Digger ۲ عدد

Grader ایک عدد

Water Sprinkler ایک عدد

کھدائی کی فی زمانہ موثر جہز در یعنی ۱۰ مکعب فیٹ فی امریکی ڈالر کے حساب سے خندق کی کھدائی کے لیے ۶۰۰ + ۱۸ + ۱۸ امریکی ڈالر درکار ہوں گے۔

نتائج :

اسلامی فن تعمیر کی تفصیلات اور تاریخ کے سلسلے میں کافی مواد موجود ہے جس کی افادیت اور اہمیت مؤرخین اور مہندسوں کے لیے مسلم ہے۔

ایم آئی ٹی اور جامعہ ملر ورڈ میں جاری آغا خاں پروگرام کا مقصد اسلامی فن تعمیر آرٹ اور فن آباد کاری کی تحقیق و تدریس کو ترقی دینا ہے اس پروگرام کے تحت فن تعمیر و ساخت کے مؤرخین و محققین و عینق کے سلسلے میں درکار اخذوں اور دیگر حوالہ جات

اور تفصیلات کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی جائیں گی۔

مذکورہ پروگرام کو مزید جامع اور مفاد پرستانہ بنانے کے لیے اس میں مندرجہ ذیل میدانوں میں بھی کام شروع کرنا مناسب ہوگا۔

۱۔ اسلامی طرز تعمیر کے نئی اصول

۲۔ تعمیری تکنیک

۳۔ اشیائے تعمیر

۴۔ تاریخی عمارتوں کو امتداد زمانہ سے محفوظ رکھنے کے ذرائع۔

۵۔ فنون لطیفہ و دیگر حرفتوں کا احیاء و تجدید اور متعلقہ فنکاروں اور اہل حرفہ کی سرپرستی  
پیش نظر مقالے کا مقصد صرف اُن نتائج کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے جو اس اہم مطالعے اور تحقیق سے حاصل ہو سکتے ہیں مثلاً خندق کی کھدائی کی تحقیق و تکنیکی مطالعے سے فتح غزوہ خندق اور خندق کی کھدائی میں امداد فیسی کے حصول کے شواہد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ و اوصیاءہ وسلم کے معجزے کے ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔ مقالہ نگار نے خیر و برکت کے نقطہ نظر سے مسجد نبویؐ کو اس تحقیقی کام کے نقطہ آغاز کی حیثیت دی ہے، چوں کہ

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے

رومی فنا ہوا جیشی کو دوام ہے

# خدائپرستی اور مادیت کی جنگ

مولانا سید کاظم صاحب نقوی، ریڈر شعبہ دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ  
(قسط دوم)

مسلمات کی عمارتیں ڈھا گئی تھیں | زمین و آسمان کی پیدائش کے بارے میں بطلیوس (Betli-mous) کا نظریہ پندرہ سو برس تک علمی دنیا پر حکومت کرتا رہا۔ توریت اور انجیل کی طرح علمی مرکزوں میں باقاعدہ اس کی تدریس کی جاتی اور تعلیم دی جاتی تھی۔ وہ اہل علم کے دماغوں میں اس طرح پیوست ہو گیا تھا کہ بہت سی آیات قرآنیہ کو مفسرین نے اس نظر پر پرایمان لانے کی بنا پر اسی کے مطابق بتا دیا۔ لیکن جب یورپ کی علمی تحریک (Renaissance) شروع ہوئی تو چار مشہور سائنسدانوں کے ہاتھوں اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں۔

پولینڈ کے کوپرنیکس (Copernicus) نے مرکزیت زمین کی رو کی اور ثابت کیا کہ تمام سیارات کا مرکز سورج ہے۔

جرمنی کے کپلر (Kepler) نے ثابت کیا کہ ہر سیارہ سورج کے گرد گھومنے میں ایک بیضوی شکل کا دائرہ بناتا ہے۔ وہ جتنا سورج سے نزدیک ہوا اتنا ہی زیادہ تیزی سے اس کے گرد گھومتا ہے۔

گیلیلیو (Galileo) نے ایک دوربین بنا کر آسمانوں کے رازوں سے پردہ سرکایا۔ بہت سے ایسے ستارے دیکھ لیے جو اب تک نہیں دیکھے گئے تھے۔ انھوں نے



بتایا کہ کہکشاں (Constellation) حقیقت میں ڈھیر بھر ستاروں کے یکجا ہو جانے کا نام ہے۔

نیوٹن (Newton) نے ثابت کیا کہ لاکھوں منظوماتِ شمسیہ کہکشاؤں میں اس وسیع اور برق و برقِ نفا میں لٹکے ہوئے ہیں۔ ان میں دو قسم کی طاقتیں پائی جاتی ہیں جو ان کے وجود اور بقا کی ضامن ہیں۔ ایک مرکز کی طرف جذب ہونے کی قوت اور دوسرے اس سے بھاگنے کی قوت۔

بہت سی مانی ہوئی باتوں میں ان تبدیلیوں کا قہری نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے سائنسدان ایسے امور کے بارے میں شک کرنے لگے جو ایک نسل سے دوسری نسل کو میراث میں ملتے رہے تھے۔ ان کے دماغوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح بہت سے موروثی نظریات کا بے بنیاد ہونا واضح ہو گیا۔ آسمانی کُرے پادر ہوا ہو گئے۔ اربعہ عناصر کہہ سانی بن گئے تو افلاک کا تصور مفسحہ خیز ہو گیا تو کیا پتہ کہ اسی طرح ہمارے تمام نظریات اور عقائد کی نوعیت ہو۔ جبکہ ہمارے بزرگوں سے ایسی باتوں میں چوک ہو گئی جن کا احساس اور مشاہدے سے تعلق ہے تو ایسے مسائل کی بابت فیصلہ کرنے میں ان سے دھوکہ کھانے کا زیادہ احتمال ہے جو احساس اور تجربے کے دائرے سے باہر ہیں۔ اس طرح نیچر کی چار دیواری سے باہر مسائل کے متعلق شروع شروع شک کیا جانے لگا اور رفتہ رفتہ اسی نے اتحاد اور انکار تک پہنچا دیا۔ آہستہ آہستہ مادیت کا رنگ بعض لوگوں کے ذہنوں پر چڑھ گیا۔

پرانے خیالات اور عقائد کی بابت سائنسدانوں کے غور کرنے بھی بدلتی کا اضافہ کرنے میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ کچھ حقیقتوں سے آگاہ ہو کر ایسا خیال کرنے لگے کہ تمام موجودات کے اسرار و رموز انھیں معلوم ہو گئے ہیں۔ اب کوئی بات پردے میں نہیں رہ گئی ہے۔ تمام راز فاش ہو چکے ہیں۔ مجہولات معلومات کا بھیس بدل چکے ہیں۔ عالم وجود کا طلسم اب طلسم نہیں رہ گیا ہے۔ کائنات میں ساری چہل پہل کا واحد سبب یہی مارہ

اور نیچر ہے۔ ان کے علاوہ نہ کچھ ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔

ظاہر ہے کہ غرور حقیقت اور عقل کے درمیان ایک زیر دست دیوا ہے۔ وہ انسان کے دماغ کو حقیقتوں تک نہیں پہنچنے دیتا۔ ایک حقیقت جو شخص کا فرض ہے کہ اس کے معلومات کا دائرہ خواہ کتنا ہی وسیع ہو جائے اس کا دماغ خواہ کتنی ہی بلند پروازی کرنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود اسے اس عظیم الشان کائنات کے سامنے اپنی ذات اور اپنے ذہن کو بہت زیادہ حقیر سمجھنا چاہیے۔ اسے یقین رکھنا چاہیے کہ تمام علمی دشواریوں پر قابو پاتا اس کے بس سے باہر ہے۔ بے شک اس علمی غرور کی عمر زیادہ طویلانی نہیں ہوئی۔ کچھ عرصے کے بعد انسان کی آنکھیں کھل گئیں اب وہ جو جو علم و تحقیق کے میدان میں آگے بڑھتا رہا وہ اُسے اپنی جہالت کا زیادہ احساس ہوتا گیا جس کا اس نے برابر اقرار کیا۔ ہمیں برابر یہ نظر آ رہا ہے کہ ایک طرف انسان کے علم و اطلاع کی سطح بلند ہو رہی ہے اور دوسری طرف موجوداتِ عالم کے اسرار و رموز کے بارے میں انسان کی حیرانی بڑھ رہی ہے۔

بیسویں صدی کا یورپ انیسویں صدی کے مادہ پرست یورپ سے بہت مختلف ہے۔ پچھلی صدی میں علم و عقل کو پوجنے کے لیے جو پر شکوہ، عظیم الشان، جلال و جبروت سے بھرپور عبارت گاہیں سائنس نے بنائی تھیں وہ اب یکے بعد دیگرے ویران ہو رہی ہیں۔ وہاں کی بھیر ٹکم مڑتی جا رہی ہے۔ اب وہ زمانے لگ گئے جب سائنسدان محسوسات کے سوا ہر چیز کے انکار کو اپنے لیے سرمایہٴ افتخار سمجھتے تھے۔ یہ روشن خیالی اور وسیع النظری کی نشانی تھی۔

سب سے زیادہ اہم اور قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ اس صدی کے شروع میں موجدین اور محققین کی طرف سے وعدے کیے گئے تھے۔ خوشخبریاں دی گئی تھیں کہ سائنس، صنعت اور سرمایہ داری زندگی کی تمام مشکلات کو دور کر دے گی۔ انسانیت

کی تمام پریشانیاں رفع ہو جائیں گی۔ جہالت کی جگہ علم، کمزوری کی جگہ توانائی، غربت کی جگہ خوشحالی، تکلیف کی جگہ آسائش ملے گی۔ لیکن ایسا کا غلط ہونا سب کے سامنے آگیا ہے۔ انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ ہر قسم کی پریشانیوں نے ہر طرف سے اس کو گھیر لیا ہے۔ راہ چارہ و تدبیر تقریباً مسدود ہو گئی ہے۔

اخلاقی لپستی | صحیح اور بالکل صحیح کہ یورپ نے صنعت کے میدان میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ راحت و آسائش کے سامانوں کو انتہائی عام اور فراوان کر دیا۔ ہر طرح کے علمی اور صنعتی انقلاب کی بنیادی شرط صحیح راہنمائی ہے جس سے یورپ محروم تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاقی تنزل کا رے اور طاعون کی طرح پورے یورپ پر چھا گیا۔ غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ صنعت کے میدان میں انسان کا آگے بڑھنا غلط تھا۔ بہتر یہ تھا کہ انسان اخلاقی لپستی سے بچنے کی خاطر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا۔ اسے ہر طرح کی ایجاد سے پرہیز کرنا چاہیے تھا۔ ہمارا مقصود یہ ہے کہ صنعت دودھاری تلوار کے مانند ہے۔ اس سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانے کے لیے راہ بری اور راہنمائی کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ انسانی زندگی کے ماحول کو گندہ بنا دے گی۔ اخلاقی اقدار کو روند ڈالے گی۔

سینما اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ انسان کی سطح ذہن کو اونچا کیا جاسکتا ہے۔ لوگوں کو عمومی طور پر خوش اطوار اور خوش اخلاق۔ نیک چلن بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن ان دونوں چیزوں کو آج کل مذکورہ امور کے بالکل مخالف اور متضاد مقاصد کے پورا کرنے کا آلہ کار بنالیا گیا ہے۔ نوجوانوں کے درمیان جرائم کی تعداد کا اضافہ اور اخلاقی انحطاط کا پھیل جانا اسی سینما اور ٹیلی ویژن کا فیض ہے۔

مادی علوم میں انسان کی ترقی نے، راحت و آسائش کے سامان کی بہتات نے، عیاشی اور بدکاری کے لیے لوگوں کی آزادی نے، خشکی، تری اور مہرائی راستوں کے



کھل جانے سے ہوس رانی کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کر دیے ہیں۔ اگرچہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایسے ماحول میں خدا شناسی اور خدا پرستی کی روح ایسی طاقتور ہو کہ صرف یہی نہیں کہ انفرادی طور پر کسی شخص کے رفتار و گفتار کو قابو میں رکھے بلکہ دوسروں کی بھی اصلاح کا سبب قرار پا جائے۔ لیکن ہماری گفتگو ایسے اگے و آگے معمول اشخاص کے لحاظ سے نہیں ہے۔ ہم نے عام معمولی لوگوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک بات کہی ہے۔

ایسے ماحول میں کسی عام نوجوان سے برا اخلاقی اور بد چلنی کے علاوہ کسی دوسری چیز کی امید نہیں ہے۔ ایسے ناسازگار ماحول میں نقطہ ہی نہیں کہ خدا پرستی اور خدا شناسی کے پھلنے پھولنے کی کوئی توقع نہیں ہے بلکہ لوگوں کی بد اطواری اور بد اخلاقی رفتہ رفتہ ان کے دل و دماغ کو بھی متاثر کرتی ہے۔ مورد ثی عقائد اور خیالات کو معیت و تابور کر دیتی ہے۔

انبیاء۔ اولیاء و صوفیاء اور ائمہ کے مسلک کی پیروی۔ وجود خدا کا عقیدہ ایک صحیح و سالم بیج کے مانند ہے جو نشو و نما کے لیے ہموار اور سازگار مناسب زمین چاہتا ہے۔ ایسا گندہ ماحول وجود خدا کے عقیدے کے پھلنے پھولنے کے قابل نہیں ہے جس کے در و دیوار سے معصیت، گناہ، بدکاری اور ہوس رانی ٹپک رہی ہو۔ جہاں کے لوگ سر سے پیر تک نافرمانی اور گناہ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ جس طرح انسان کے پاکیزہ خیالات اس کے عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح مستقل ہوس رانیاں۔ دائمی بدکاری انسان کے افکار و خیالات میں تبدیلی پیدا کر دیتی اور انہیں کھینچ جان کر اس ماحول کے مطابق بنا دیتی ہیں جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے۔

حقیقی اور صحیح خدا پرستی اخلاقی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ ہے۔ اسی لیے دکھائی دیتا ہے کہ سچے خدا پرست لوگ اخلاقی حیثیت سے بلند ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بہت

ادگندہ ماحول اخلاقی پاکیزگی اور نفسانی طہارت کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اس قسم کے ماحول میں عام طور پر لوگ انہی کے رسم و رواج پر چلتے ہیں۔ ان کا کام ہوتا ہے اس چند روزہ زندگی کو غنیمت سمجھتے ہوئے خوب مزے اڑانا۔ بہتر سے بہتر کھانا۔ بہتر سے بہتر پہننا۔ بہتر سے بہتر جگہ رہنا۔ بہتر سے بہتر طریقوں پر اپنی جنسی پیاس بجھانا۔ بالآخر یہ عملی گندگی۔ اخلاقی مادیت انسان کے دل و دماغ کو متاثر بناتی اور جلد یا بدیر انہیں اس کی رفتار اور کردار کے مطابق بنا لیتی ہے۔ عملی حیثیت سے مادیت آہستہ آہستہ عقیدے کے لحاظ سے مادیت پر ختم ہوتی ہے۔

جس طرح ہمارے بہت سے کاموں کا سرچشمہ ہمارے صفات و عادات اور افتاد طبع ہوا کرتی ہے اسی طرح بہت سے نفسیات اور ہمارے باطن کی گہرائی میں اترے ہوئے صفات کا سبب کسی کام کا بار بار دہرانا ہوتا ہے۔ جو لوگ برا بگناہ کرتے رہتے، جھوٹ بولتے رہتے۔ لوگوں کی برائیاں کر کے قرآن کریم کے بقول اپنے مردہ بھائیوں کا گوشت کھاتے رہتے۔ مستقل طور پر دوسروں کے حقوق پامال کرتے رہتے۔ پہلی دفعہ ان کاموں کے کرنے سے ان کی روح۔ ان کے دل و دماغ کے صفحہ پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ لیکن جب کسی وجہ سے قانونِ الہی کی خلاف ورزی کرتے رہے خواہ جان بوجھ کر اور خواہ نادانستہ طور پر تو رفتہ رفتہ ان کی روح، ان کا دل۔ ان کا نفس جو بھی تعبیر مناسب ہو کیجیے گندہ ہو جاتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ سر سے پیر تک گناہ کا پتلا بن جاتے ہیں۔ اب یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی کے ساتھ بیٹھیں اور لوگوں کی برائی نہ کریں۔ کسی کی کوئی بات بیان کریں اور جھوٹ نہ بولیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کے وجود میں جیپی ہوئی کوئی ایسی طاقت متاثر ہوگئی ہے جو انسان کے تمام کاموں کا سرچشمہ ہے۔

یورپ اخلاقی بستیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ یورپ بدکاری اور عیاشی سے ڈھکا ہوا ہے۔

اس کا ماحول ہرگز خدا پرستی اور مذہبی عقائد کی نشوونما کے لیے مناسب نہیں ہے۔ وہاں مذہبیت کے مظاہرات کیونکر ہو رہے ہیں؟ دوسری عمارتوں کے ساتھ کلیسا بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مخصوص اوقات میں وہاں چہل پہل بھی ہوتی ہے لوگوں کی زبانوں پر سوکھی اور بیجان دعاؤں کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ خاص خاص دفتروں میں لوگ جا کر اپنے میاں بیوی بن جانے کی رپوٹ بھی درج کراتے ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ انکی زندگی میں کہیں مذہب کا نام و نشان نہیں ہے۔ وہاں کے گندے ماحول میں اس سے زیادہ مذہبیت ہرگز نہیں پائی جاسکتی۔

یورپ کے مسیحی حلقے جتنی بھی کوشش کریں یہ غیر ممکن ہے کہ اخلاقی اور عملی مادیت کو ذہنی اور اعتقادی مادیت سے الگ رکھا جائے۔ وہ ہرگز اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے کہ وہ کوئی ایسی ترکیب کریں کہ عملی طور پر لوگ مطلب پرست اور مادیت کے پرستار ہوں لیکن روحانی۔ ذہنی اور اعتقادی طور پر خدا پرست ہوں۔ کیونکہ بالآخر ان دونوں میں کوئی ایک دوسرے کو ہرا دے گا۔ یا روح کی اصلاح ہو جائے گی۔ اخلاقی مادیت خدائی اخلاق سے تبدیل ہو جائے گی اور یا اخلاقی مادیت انسان کی روح اور اس کے دل و دماغ کو متاثر کر کے خدا پرستی کے عقیدے کو مادہ پرستی کے عقیدے سے بدل دے گی۔ مغربی ممالک میں ترازو کا دوسرا پلہ بھاری ثابت ہو رہا ہے۔ وہاں کے لوگ اب صرف خاندانی لحاظ سے۔ جزائی اعتبار سے عیسائی رہ گئے ہیں۔ عملی اور نظریاتی طور سے ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے۔

کیا عقیدے اور عمل میں جدائی ممکن ہے؟ | دماغوں میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ انسان کے عقائد اور اس کے اعمال کے درمیان جدائی ہو سکتی ہے یہ ممکن ہے کہ کسی شخص نے غور و خوض کر کے کچھ نظریات قائم کیے ہوں اور وہ اپنی جگہ ثابت اور برقرار بھی رہیں۔ لیکن اس کے اعمال اس کے مطابق نہ ہوں۔



یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ایمان اور عقیدہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جو انسان کے دماغ کے کسی کونے میں پڑا ہے اور اس کا اس کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ البتہ بعض عقائد اسی قسم کے ہیں کہ جن کا کوئی تعلق انسان کے اخلاق اور اعمال سے نہیں ہے۔ مثلاً ریاضی کے معلومات اور اطلاعات لیکن بعض عقیدے اس طرح کے ہیں کہ جو انسان کی پوری زندگی پر چھل جاتے ہیں۔ ہر چیز ان کے قبضے میں آجاتی ہے۔ بے شک عقیدے سے مراد یقین یا کم از کم اطمینان و ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اور عقیدہ اپنے ساتھ کچھ دوسرے افکار کو بھی لاتا ہے انسان جب خدا کو مان لیتا ہے انفرادی طور سے یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اس کی حکمت و دانش کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو پیدا کرنے کی کوئی غرض ہو۔ اس نے بغیر کسی مقصد کا لحاظ کیے کائنات کو نہیں پیدا کیا ہے۔ جبکہ ایسا ہے تو اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے انسان کے ذمہ کچھ فرائض ضرور قرار دیے ہیں۔ اس کے کام موصول پر کچھ ذمہ داریاں ضرور ڈالی ہیں۔

اس طرح کا مقدس عقیدہ ایسے گندے ماحول میں ہرگز چب نہیں سکتا۔ جہاں کے لوگ ہر طرح کے کام کرنے کے لیے آزاد ہوں۔ جو اپنے ادھر کسی قسم کی پابندی کے قائل نہ ہوں۔ آخر میں اس عقیدے کا تابود ہونا یقینی ہے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ انسان اپنے عقیدے سے دستبردار نہ ہو اور ماحول کو بدل کر اس میں انقلاب لا کے اس کو اپنا ماحول اور مدگار بنالے۔

صرف ایمان کی بات نہیں۔ تمام اخلاقی صفات اور انسانی فضائل کی یہی صورت ہے۔ مضافت شجاعت۔ عدالت۔ خیر خواہی ہر شخص کے اندر نہیں کھلتی پھولتی ہے عیاشراف اور بدکارا شخص میں پست اخلاق و اوصاف کی نشوونما ہوتی ہے۔

کسی قوم سے اس کے بلند انسانی صفات کو چھین لینے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس کی نوجوان نسل کو عیاش اور بدکار بنادیا جائے۔ تاریخ عالم بتاتی ہے کہ بہت سی

قوموں کو ان کے دشمنوں نے اسی طرح کمزور کر دیا۔

نثر میلے سائنسدان | یہ بات بھی نظر میں رکھنے کے قابل ہے کہ بہت سے مادہ پرست جو بواسطہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن نام رکھنے کے لحاظ سے خدا پرستوں سے الگ ہیں۔

ایسا ہمیں بہت زیادہ نظر آتا ہے کہ جب سائنسدانوں کو اپنے تحقیقات کے دوران کوئی نئی چیز ملتی ہے تو یہ لوگ بڑے انہماک کے ساتھ اس کے فوائد اور نتائج کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی اس تلاش میں کافی مدت لگ جاتی ہے۔ یہ لوگ عملی طور پر ہر چیز کے فوائد اور نتائج کی کھوج کرتے اور جب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتے چین سے نہیں بیٹھتے ہیں۔

یہ کوشش اور جستجو باقی ہے کہ وہ تمام موجودات کے لیے غرض اور مقصد کے قائل ہیں۔ اگرچہ وہ زبان سے اقرار نہیں کرتے ہیں۔ مگر ان کا عمل بتاتا ہے کہ موجودات عالم کی پیدائش بے مقصد و غرض نہیں ہے۔ دنیا کی ہر چیز کے وجود کا ایک فائدہ اور مقصد ضرور ہے جس کے چہرے سے علم کی ترقی آئندہ پردہ سرکائے گی۔

سائنسدان کبھی یوں کہتے ہیں کہ نیچر نے فلاں خشتے کو فلاں مقصد کے لیے بنایا ہے۔ اس فلاں چیز سے بچاؤ کے واسطے فلاں اقدام کیا ہے۔ فطرت نے یہ عضو اس جاندار کو فلاں مقصد کے پیش نظر دیا ہے۔ خدا صہ یہ کہ انھوں نے نیچر کو باشعور۔ صاحب عقل۔ عالم۔ قادر۔ سب کچھ قرار دے دیا ہے۔

یہ اور ان کے مثل جملہ ان کی باتوں میں بہت زیادہ ہیں۔ ان کے اور خدا پرستوں کے اقوال کے درمیان فرق صرف خدا اور نیچر کے نام کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ اندھے بہرے، ارادہ اور شعور سے محروم نیچر اسباب ہرگز ان الفاظ کے حقدار اور سزاوار نہیں ہیں۔

یہ وہی بات ہے کہ جو ہر شخص کے دل و دماغ میں راسخ ہے کہ اس وسیع دنیائے

رنگ و بو میں ہر چیز کسی نہ کسی غرض اور مقصد کے ماتحت بنائی گئی ہے۔ یہ ہمہ گیر وسیع۔  
گہرے اغراض و مقاصد بتاتے ہیں کہ کسی غیر معمولی صاحب علم و قدرت نے ان موجودات کو  
خلق کیا ہے۔

یہ اہم نکتہ راہ نمایان اسلام کے کلمات و ارشادات میں بھی موجود ہے۔ ان کی طرف  
سے ایسے لوگوں کو جواب دیا گیا کہ جو تمام موجودات کا سرچشمہ نیچر کو قرار دیتے ہیں کہ اگر  
نیچر سے مراد ایسا وجود ہے جو مادے (مادہ) سے محروم ہو تو یہ اس نظم عالم کے ساتھ  
سازگار نہیں ہے اور اگر نیچر سے مراد کوئی یا شعور ذات ہے تو صرف اس کے اور خدا کے  
درمیان فرق نام کے لحاظ سے ہے (توحید مفصل)

اسلام سے بے خبری | مادہ پرستوں کے منکر خدا ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ صحیح  
مذہبی عقائد سے بے خبر ہیں خصوصاً مذہب اسلام ان کے سامنے ابھی تک نہیں آیا ہے۔  
اکثر مادہ پرست مغربی ممالک میں پیدا ہوئے یا ادیان و مذاہب کے متعلق ان کے معلومات  
کا ماخذ مغربی اہل قلم ہیں۔ بد قسمتی سے یہ اشخاص بھی جن کے اقوال پر دوسروں نے بھروسہ  
کیا تمام مذاہب سے عموماً اللہ مذہب اسلام سے خصوصاً ناواقف تھے۔ ان لوگوں میں سے  
فقط مستشرقین جو مشرقی مذاہب کے متعلق تحقیق کے لیے آمادہ ہوئے تھے۔ اصول  
مذاہب سے مختصر طور پر واقفیت رکھتے تھے۔ لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ بعض  
مستشرقین نے عمداً مخصوص اسباب اور مقاصد کے ماتحت بعض واقعات میں تحریف  
کرتے ہوئے انہیں دوسری صورت سے پیش کیا ہے۔

سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ مشرقی تعلیم یافتہ۔ روشن خیال حضرات کا  
ایک طبقہ ادیان و مذاہب کے خلاق اپنے فیصلوں میں یا مغربی مادہ پرستوں کے نظریات  
کی حمایت میں عام طور پر انہی مستشرقین کے اقوال کو بطور سند پیش کرتا ہے۔ یہی بات اس کے  
بہت سے کمزور اعتراضات کا سرچشمہ بنی ہے۔ یقیناً اس سے ہر ایسے باخبر شخص کو تعجب



ہوگا جو مذاہب و ادیان کی حقیقت سے واقف ہے مثلاً مانیٹسکو (Montesquieu) جنہیں بعض اہل قلم نے اٹھارویں صدی عیسوی کے فرانسیسی انشا پردازوں میں سب سے ممتاز قرار دیا ہے، اپنی کتاب کے سولہویں باب کی دوسری فصل میں ”پریڈو“ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مہم نے پانچ سال کی عمر میں خدیجہؑ سے عقد کیا اور آٹھ برس کے سن میں ان سے ہم بستری کی!“ (روح القوانين)

مانیٹسکو (Montesquieu) نے یہ بات اپنے اس دعوے کے ثبوت میں لکھی ہے کہ ایسے ملکوں میں جنسی جذبات زیادہ شدید ہیں جہاں زیادہ گرمی ہوتی ہے۔ اسی بنا پر رط کے جلدی مانع ہو جاتے ہیں۔

اس پانچ اور آٹھ سال سے یا پیغمبر اسلامؐ کا سن مراد ہے اور یا جناب خدیجہؑ کا، بہر حال مقصود جو بھی ہو یہ ایسی بات ہے جس پر ہر شخص ہنسے گا۔

”روح القوانين“ کے فارسی مترجم نے اس بات کو انتہائی تا واقعیت کا نتیجہ قرار دینے کے بعد لکھا ہے کہ:

”خیال ہوتا ہے کہ ”پریڈو“ نے چاہا ہے کہ آب و ہوا کے تاثرات میں مبالغہ کرتے ہوئے ایک غیر معمولی عام نظام وجود کے خلاف واقعہ نقل کرے۔ ورنہ جو شخص پیغمبر اسلامؐ کے واقعات زندگی سے مختصر طور پر بھی واقفیت رکھتا ہو۔ وہ اس اظہار کے غلط ہونے کا یقین کرے گا۔“ مانیٹسکو (Montesquieu) کے ایسا لکھ دینے کے بعد ہر شخص سمجھ لے گا کہ ادیان و مذاہب کے بارے میں عموماً اور مذاہب اسلام کے متعلق خصوصاً مستشرقین کے معلومات کس حد تک ہیں۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی اہللاعات پیغمبر اسلامؐ کے نہایت واضح اور نمایاں حالات زندگی کی بابت اتنے ناقص اور غلط ہوں وہ کیوں کر مذہبی اصول عقائد اور دینی حقائق و معارف کی بابت فیصلہ کر سکتے ہیں؟!

دوسری مثال ہالینڈ کے مشہور اہل قلم ”دان لوں“ کی ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے آثار قلمی کا ۲۹ زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کی کتاب داستان بشر اپنے وقت میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب تھی۔ انھوں نے اپنی اسی کتاب میں جناب رسالتاً اور ان کے آئین کے متعلق لکھا ہے کہ ”ابوبکرؓ کے بعد ان کے جانشین عمر ہوئے“ اس کے بعد ان کے فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ انھوں نے اسلامی سلطنت کا سب سے پہلا پایہ تخت دمشق کو قرار دیا۔ عمر کے بعد خلافت علی کو ملی! ہم سب کو مسلمانوں کے بچوں تک کو معلوم ہے کہ نہ حضرت عمر کے بعد حضرت علی خلیفہ رسولؐ منتخب ہوئے اور نہ خلیفہ دوم نے دمشق کو اسلامی سلطنت کا پایہ تخت قرار دیا۔

مشرقی امور: خصوصاً ادیان و مذاہب کے متعلق مستشرقین اور مغربی مؤرخین کی نادانیت کے یہ چند نمونے تھے جنہیں پیش کیا گیا۔ اس سے مغربی سائنسدانوں کی بے اطلاعی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جن کا عموماً ان مسائل سے کوئی ربط نہیں ہے۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم سرے سے ادیان و مذاہب کے بارے میں مغربی دانشمندوں کے معلومات بالکل منکر ہیں۔ ہمارا صرف مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کے اطلاعات اتنے اہم اور مستند نہیں ہیں کہ انہیں بعض اعتراضات کی بنیاد بنالیا جائے۔

شاید نیچرل سائنس (Natural Sciences) کے سلسلے میں ان لوگوں کی غیر معمولی ترقی ہمارے بعض تعلیم یافتہ، روشن خیال اشخاص کو اس اقرار سے روکتی ہے کہ ادیان و مذاہب کی بابت ان کی معلومات ناقص ہیں لیکن اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ کسی شخص کا کسی شعبے میں ماہر ہونا اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا کہ دوسرے شعبوں میں بھی اس کے نظریات صحیح ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک بہترین ریاضی داں ہونے کے باوجود کسی دوا کے معمولی فارمولے اور اس کے اثر سے نادانف ہو۔ اسی طرح ایک بہترین ڈاکٹر ذواضعاف اقل کے ایک انتہائی آسان اور واضح سوال نہ لگا سکتا ہو۔

# مسئلہ رویت ہلالِ جدید سائنسی تحقیق کی روشنی میں

از جناب ضیاء الدین لاہوری ایم۔ اے

ہمارے ہاں علماء اسلام کو اکثر اس بات کا ملزم گردانا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ سائنسدان انسان کو چاند پر بھیجنے میں کامیاب ہو چکے ہیں، وہ ابھی تک نیا چاند دیکھ جانے کا مسئلہ طے نہیں کر سکے۔ لوگوں کے خیال میں برصغیر کے علماء کرام دقیقانوسی خیالات کی بنا پر جدید علوم سے استفادہ نہیں کرتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہاں قمری تاریخیں عرب ممالک کے مقابلے میں، جہاں رویت ہلال کے بارے میں کبھی اختلاف نہیں ہوا، ہمیشہ ایک یا دو روز پیچھے چلتی ہیں جو اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ ہم اس معاملہ میں غلطی پر ہیں۔ اس قسم کے الزامات نہ صرف عام لوگوں کی طرف سے بلکہ تعلیم یافتہ افراد کی جانب سے بھی عائد کیے جاتے ہیں۔ اس مفروضے کی بنیاد پر بہت سے مقالات اور رسائل تحریر کیے جا چکے ہیں کہ سائنس کی زبردست ترقی کے اس دور میں ماہرین علوم فلکیات رویت ہلال کی بالکل درست پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر یہ واقعی ممکن ہے تو ہم خواہ مخواہ بے یقینی کی کیفیت سے دو چار رہنا کیوں پسند کرتے ہیں! میں نے معلومات حاصل کرنے کی غرض سے اپنے قیام لندن کے دوران میں یونیورسٹی آف لندن آبزرویٹری اور رائل گرین وچ آبزرویٹری سے اس مسئلہ پر خط و کتابت کی۔ میں نے ان سے استفسار کیا کہ کیا علوم فلکیات کے ماہرین کوئی ایسا معیار قائم کرنے کے قابل ہو چکے ہیں جس سے



آئندہ رویت ہلال کی یقینی پیش گوئی کی جاسکے؟ میں نے ان سے وضاحت چاہی کہ اس سلسلہ میں چاند کی عمر، غروب آفتاب اور غروب قمر میں فرق اور مشاہدہ کرنے والے کی سطح سمندر سے بلندی کو کہاں تک دخل ہے؟ اس کے جواب میں یونیورسٹی آف لندن آبزرویٹری شعبہ فزکس اور علوم فلکیات کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے ۱۱ جولائی ۱۹۸۱ء کو مجھے جو جواب بھیجا اس کے متعلق حصہ کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

..... آپ کے دوسرے استفسار سے متعلق، کہ آیا آبزرویٹری سائنسدان کوئی ایسا معیار قائم کرنے کے اہل ہو چکے ہیں جس سے آپ نیا چاند نمودار ہونے والی شام کی یقینی پیش گوئی کر سکیں، مجھے افسوس ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس خاص مسئلہ پر عدلیہ سعودی عرب کے اراکین کے ساتھ میرے طویل مذاکرات ہوئے اور معلوم ہوا کہ اس سلسلہ میں پیش کی جانے والی کوئی بھی تجویز یقینی طور پر قرآن مجید کے تقاضوں سے تقریباً متصادم ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ حقیقت رویت ہلال کے متعلق کوئی بھی مفروضہ قائم نہیں کیا جاسکتا، ایک خاص زاویے کا تعین کیا جاسکتا ہے مگر یہ بھی ہمیشہ محض ایک اتفاق ہوگا کہ خصوصی تیز بصارت کا حامل کوئی فرد خاص غیر متغیر اور صاف مطلع میں چاند کے اپنے (Statutory) مقام پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے دیکھنے کے قابل ہو سکے۔ ان نکات میں سے، جن کا ذکر آپ نے کیا ہے، اصل مسئلہ کا لازماً کسی سے بھی تعلق نہیں بلکہ محض اس بات سے ہے کہ چاند سورج سے کس قدر فاصلے پر ہو جو جھٹپٹے میں آسمان پر دکھائی دے سکے۔ جزوی طور پر اس کا انحصار چاند کی سورج سے دوری اور دوسرے تغیر پذیر عناصر پر ہے جیسا کہ فضا میں شفاق پن اور موازنہ (Contrast) اور مشاہدہ کرنے والے کی نظر کی تیزی۔ قرآن مجید

کسی ایسے طریق کار کا، جو چاند کے سورج سے ایک مخصوص فاصلے پر مبنی ہو خصوصاً مزاحم دکھائی دیتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہنا پڑتا ہے کہ میرے خیال میں کوئی ایسا سائنسی طریقہ نہیں ہے جس سے کہ اس موقع پر اسلام کے تقاضے پورے کیے جاسکیں۔

رائل گزین وچ آبزروٹری انگلستان کی سائنس ریسرچ کونسل فلکیاتی معلومات پر وقتاً فوقتاً تحقیقاتی پرچے جاری کرتی ہے۔ رویت ہلال کے مسئلہ پر نومبر ۱۹۷۴ء میں ان کی آخری معلوماتی شیٹ نمبر ۶ شائع کی گئی جس کا ترجمہ درج ذیل ہے :

” ہر ماہ نئے چاند کے پہلی مرتبہ نظر آنے والی تاریخوں کے متعلق پیش گوئی کرنا ممکن نہیں کیونکہ ایسے کوئی قابل اعتماد اور مکمل طور پر مستند مشاہدات موجود نہیں ہوتے جنہیں ان شرائط کو متعین کرنے میں استعمال کیا جاسکے جو چاند کے اول بار نظر آ جانے کے لیے کافی ہوں۔ پیش گوئی کی سادہ

ترین بنیاد یہ ہے کہ متعلقہ جگہ پر چاند غروب آفتاب کے وقت (ایک خاص عمر سے) جو فلکیاتی نئے چاند کے وقت سے شمار کی جائے (زیادہ ہو۔

تاہم بہتر یہ ہے کہ عمر کی بجائے اس وقت چاند کا سورج سے حقیقی زاویائی فاصلہ (*Elongation*) استعمال کیا جائے۔ نیا چاند اس وقت تک دکھائی دینے کے قابل نہیں ہوتا جب تک کہ سورج، افق سے نیچے نہ ہو۔

لہذا چھٹ پٹے کے دوران میں چاند کے ارتقاع کو حساب میں رکھنا زیادہ مناسب ہے۔ نیا چاند نظر آنے کے اتفاقات کا قدرے انحصار چاند کے زمین سے فاصلے پر ہے۔ یہ اتفاقات اس وقت سب سے زیادہ ہوں گے جب چاند

قریب ترین (یعنی *Perigee* پر) ہو گا۔ مقامی کیفیات خاص کر مشاہدہ کرنے والے کی سطح سمندر سے بندی اور گرد و پیش کے ماحول کی خصوصیت،

اہمیت کی حامل ہیں اور جب آسمان ابرا آلود نہ ہو تو بھی فضا کے شفاف پن میں ایک دن سے دوسرے دن قابل ذکر تغیرات ہو سکتے ہیں۔ مشاہدہ کرنے والے کی نظر کی تیزی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ زمین پر طولی بلد اور عرض بلد دونوں کے ساتھ فلکیاتی کیفیات میں قابل ذکر تغیرات ہوتے ہیں اور اگر موسمی کیفیات ہر جگہ اچھی بھی ہوں تو رویت ہلال کی تاریخیں جگہ بہ جگہ مختلف ہوں گی، لہذا پیش گوئیاں صرف محدود علاقوں کے لیے کارآمد ہو سکتی ہیں۔“

”عام کیفیات کے تحت چاند پہلی مرتبہ اس وقت تک دکھائی نہیں دیتا جب تک کہ اس کی عمر تیس گھنٹوں سے زائد نہ ہو، لیکن چند ایسی معتبر مثالیں بھی موجود ہیں جن میں چاند بہت اچھی کیفیات کے باعث اس وقت دکھایا گیا جب اس کی عمر صرف تیس گھنٹے تھی۔ تین درجے جھکاؤ (Depression) کی صورت میں جب تک کہ چاند کا ارتفاع پانچ درجے سے اوپر آدیا نی فاصلہ (Elongation) دس درجے سے بڑھ نہ جائے، اس کا نظر آنا بعید از قیاس ہے۔“

”چونکہ یہ امر واضح ہے کہ رویت ہلال کے متعلق کوئی بھی پیش گوئی غیر یقینی ہوتی ہے، اس بات کا طے کرنا ضروری ہے کہ آیا قبل از وقت کسی ایسی پیش گوئی کو ترجیح دی جائے جس کے حق میں، اگرچہ کیفیات اچھی ثابت ہوں، ثبوت پیش نہ کیے جاسکیں یا بعد میں کوئی ایسی پیش گوئی کی جائے جو گزشتہ روز کے مشاہدے کو بے اثر بنا سکے سادہ سا اصول جس کا یہ دفتر عموماً مشورہ دیتا ہے، کہ متعلقہ جگہ پر غروب آفتاب کے وقت چاند کی عمر تقریباً تیس گھنٹے یا زیادہ ہونی چاہیے، مؤخر الذکر قسم ہے لیکن یہ اصول



وسلی اور بالائی عرض البلدیں قابل اعتبار نہیں ہے۔“

ماہرینِ علوم کی ان کے متعلقہ شعبہ کے مسائل پر آراءِ سندھانی جاتی ہیں، مندرجہ بالا تحقیقات موجودہ دور تک رویتِ ہلال سے متعلق ماہرینِ علومِ فلکیات کی صحتی سندھ ہیں۔ جو ان مفروضوں کو غلط ثابت کر رہی ہیں کہ اس مسئلے پر باقاعدہ پیش گوئی ممکن ہے جب مفروضے ہی غلط ثابت ہو گئے تو ان کی بنیاد پر پیش کیے جانے والے مقالات اور رسائل کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔

عرب ممالک میں نئے چاند کا ہونا رویتِ ہلال کے اعتبار سے قرار نہیں دیا جاتا۔ ان کے نئے چاند کی بنیاد اس کی فلکیاتی توضیح ہے گویا کہ ان کا چاند اسی شام ہو جاتا ہے جس روز چاند کی عمر شروع ہوتی ہے یعنی جب چاند اور سورج کا درمیانی فاصلہ صفر درجے ہوتا ہے۔ ماہرینِ فلکیات کے مطابق نئے چاند کا نظر آنا اسی شام ممکن ہے جب اس کی عمر تقریباً تیس گھنٹے ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں، جہاں رویتِ ہلال کا اعلان شرعی طود پر چاند دیکھے جانے کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، قمری تاریخیں وہاں کی رائج تاریخوں سے ہمیشہ پیچھے چلتی ہیں۔ مندرجہ ذیل مثال اس اختلاف کو واضح کرے گی کہ ہمارے اور ان کے درمیان کبھی ایک روز اور کبھی دو روز کا فرق کیوں کر ہوتا ہے۔

مثال :

نئے چاند کی عمر شروع ہونے کے اوقات کی دو صورتیں فرض کیجئے :

پہلی صورت - بدھ ۱۰ بجے صبح

دوسری صورت - بدھ ۴ بجے شام

دونوں صورتوں میں سعودی عرب میں پہلی تاریخ جمرات ہوگی۔

حیدرآباد میں پہلی صورت میں بدھ کو بوتنت غروب آفتاب ۶ بجے شام فرض کر لیجئے

چاند کی عمر صرف ۸ گھنٹے ہوگی اس لیے چاند نظر نہیں آسکے گا۔ اگلے روز یعنی جمرات کی

شام کو اس کی عمر  $۸ + ۲۴ = ۳۲$  گھنٹے ہو جائے گی لہذا چاند نظر آئے گا اور پہلی تاریخ جمعہ کو ہوگی، اس طرح ہمارا سعودی عرب کی تاریخوں سے ایک دن کا اختلاف ہوگا۔

دوسری صورت میں بڑھ کی شام کو حیدرآباد میں غروب آفتاب کے وقت چاند کی عمر صرف ۲ گھنٹے ہوگی اس لیے چاند کسی صورت نظر نہیں آ سکے گا، اگلے روز جمعرات کی شام کو اس کی عمر  $۲ + ۲۴ = ۲۶$  گھنٹے ہو جائے گی۔ تیس گھنٹے سے کم عمر کے باعث اس روز بھی چاند کے نظر آنے کا زیادہ امکان نہیں۔ اس سے اگلے روز جمعہ کی شام کو اس کی عمر  $۲۶ + ۲۴ = ۵۰$  گھنٹے ہو جائے گی اس لیے چاند ضرور نظر آئے گا، لہذا اس سے اگلا روز یعنی ہفتہ چاند کی پہلی تاریخ ہوگی، اس طرح ہمارا سعودی عرب کی تاریخوں سے دو دن کا فرق ہوگا۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ کون صحیح ہے اور کون غلط، اس کی شرعی توضیح کرنے کے مجاز صرف علمائے کرام ہیں۔ مجھے صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ فلکیات نئے چاند اور مشاہدہ کے نئے چاند میں کبھی یکسانیت نہ ہونے کی بنا پر اگر اول الذکر صورت کو درست مانا جائے تو لامی نہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس سے پیشتر چونکہ رویت ہلال ہمیشہ مؤخر الذکر صورت کی بنیاد پر قرار دی جاتی رہی ہے اس لیے چودہ سو سال تک تمام عیدین اور رمضان المبارک کے آغاز اور اختتام غلط ایام میں منعقد ہوتے رہے۔

# مولانا عزیز گل اسیر مالٹا سے ایک ملاقات

پروفیسر محمد اسلم، استاذ شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۲۳ جون ۱۹۸۱ء میری ایک دیرینہ آندہ کی تکمیل کا دن تھا۔ مدتوں سے میرے دل میں مولانا عزیز گل، اسیر مالٹا سے ملنے کی تمنا تھی اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے تاریخ مذکورہ بالا کو میری یہ دیرینہ آندہ پوری کر دی موصوف کے ساتھ ملاقات کا سبب یوں بنا کہ ۲۶ جون کو شعبہ تاریخ، جامعہ پنجاب کے چالیس طلبہ و طالبات کا ایک گروپ میری قیادت میں سابق ریاست سوات کے دورہ پر روانہ ہوا۔ میرا یہ ارادہ تھا کہ میں سخاکوٹ کے مقام پر چند گھنٹوں کے لیے رک جاؤں اور طالب علم میرے رفیق کار قمر عباس کی قیادت میں سوات کے صدر مقام منگورہ چلے جائیں۔ میں مولانا عزیز گل سے ملی کر منگورہ میں اپنے ساتھیوں سے جا ملوں گا۔ اتفاق سے نوشہرہ پہنچتے پہنچتے ہماری ٹرین ساٹ گھنٹے لیٹ ہو گئی اور ہم نماز مغرب کے وقت نوشہرہ پہنچے۔ ٹرین لیٹ ہو جانے کی وجہ سے مولانا عزیز گل سے ملاقات کا پروگرام عارضی طور پر منسوخ کرنا پڑا۔

سوات میں قیام کے دوران میں میں نے موصوف کے بارے میں استفسار شروع کیا۔

۱۔ نوشہرہ، لاہور کو پشاور سے ملانے والی سڑک اور ریلوے لائن پاک ایک اہم جنکشن ہے۔ وہاں سے پشاور صرف ۳۳ کلومیٹر دور ہے۔



اتفاقاً ایک روز میں شالا مار ہوٹل مَدین کے منیجر کے دفتر میں اخبار لینے گیا تو دیوار پر ایک کیلنڈر لٹکتا ہوا نظر آیا جس پر اقوال محمود کے عنوان سے مفتی محمود مرحوم کے اقوال درج تھے۔ میں نے منیجر صاحب سے، جو بڑے متدین اور بارش بزرگ تھے، کہا کہ وہ ہمارے ہم مسلک معلوم ہوتے ہیں، کیا وہ مولانا عزیز گل کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ اتفاق سے آج ہی مفتی محمود مرحوم کے پرائیوٹ سکرٹری مولانا فضل ربی مردان سے مدین پہنچے ہیں، ان سے موصوف کے بارے میں معلومات مل سکتی ہیں۔ میں نماز عصر کے بعد مولانا فضل ربی کی قیام گاہ پر پہنچا تو وہ بڑے تپاک سے ملے۔ انھوں نے میرے استفسار پر بتایا کہ ان کی بھی بڑے عرصہ سے مولانا عزیز گل سے ملنے کی آرزو ہے لیکن وہ ان کے گاؤں کا نام نہیں جانتے، انھیں صرف اتنی خبر ہے کہ موصوف سخاکوٹ کے قریب کسی گاؤں میں رہتے ہیں۔ میں مولانا فضل ربی کے مکان سے بڑا مایوس ہو کر واپس لوٹا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ میں نماز مغرب سے فارغ ہو کر اپنے کمرہ میں آکر لیٹ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ ہوٹل کے منیجر صاحب میرے کمرہ میں آئے اور کہنے لگے کہ سخاکوٹ کے ایک بہت بڑے تاجراور ٹھیکہ دار صاحبزادہ اشمد جان ان کے دفتر میں بیٹھے ہیں، ان کا تعلق چونکہ عمر زئی کے مشائخ کے خاندان سے ہے، اس لیے ان سے مطلوبہ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ میں منیجر صاحب کے توسط سے صاحبزادہ صاحب سے ملا تو انھوں نے بتایا کہ ان کے بھائی صاحبزادہ خالد جان سخاکوٹ میں رہتے ہیں، اور وہ ایک بڑی مارکیٹ کے مالک ہیں۔ میں اگر ان سے ملوں تو وہ مجھے مولانا عزیز گل سے ملا دیں گے۔ اگر کسی وجہ سے ان کے ساتھ ملاقات نہ ہو سکے تو میں مولانا عزیز گل کے

لے مدین ایک اچھا خاصہ قصبہ ہے۔ وہاں کئی اچھے ہوٹل اور تین مساجد ہیں۔ مدین کی تمام آبادی دیوبندی مسلک پر کاربند ہے۔

فرزند ارجمند میاں عبدالرؤف کو تلاش کر دیں۔ میاں صاحب کی سنا کوٹ میں ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ میں احمد جان سے مل کر خوشی خوشی اپنے کمرہ میں آیا اور مولانا سے ملنے کا پتہ گرام بنانے لگا۔

میں نے قمر عباس سے مل کر یہ پتہ گرام بنایا کہ میں ۲۴ جون کو مدین سے واپسی پر علی الصبح سنا کوٹ روانہ ہو جاؤں اور قمر صاحب اپنے گروپ کے ساتھ دن کے بارہ بجے مدین سے روانہ ہوں اور میں سنا کوٹ کے بس اسٹینڈ پر ان کا انتظار کروں گا۔ پتہ گرام کے مطابق میں مدین سے صبح ساڑھے سات بجے دیگن میں سوار ہوا اور تقریباً سوا گھنٹے میں منگورہ پہنچ گیا۔ منگورہ سے مجھے پشاور جانے والی بس مل گئی اور میں بٹخیلہ اور مالاکنڈ ہوتا ہوا اپنے گیارہ بجے سنا کوٹ پہنچ گیا۔ یہ مقام آزاد قبائلی علاقے میں *Settled Area* کے بارڈر پر واقع ہے۔ اس لیے وہاں غیر ملکی سامان اور اسلحہ کھلے بندوں فروخت ہوتا ہے۔

سنا کوٹ پہنچ کر معلوم ہوا کہ صاحبزادہ خالد جان کسی کاروباری سلسلہ میں مردان جا چکے ہیں اس لیے میں میاں عبدالرؤف کی تلاش میں نکلا۔ پوچھتے پوچھتے جب میں ان کی دکان پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ افریقہ سے کوئی جہان آگئے تھے وہ انھیں لے کر گاؤں چلے گئے ہیں۔ میں نے دکان پر موجود ایک درزی سے کہا کہ میں مولانا عزیز گل سے ملنا چاہتا ہوں اس لیے وہ میرے لیے گاؤں تک پہنچنے کا انتظام کر دے۔ اس نے ایک تلنگے والے سے بات کی اور وہ بیس روپے میں مجھے وہاں تک لے جانے اور واپس سنا کوٹ لانے پر رضامند ہو گیا۔ یہ آزاد قبائل کے دیہی علاقے میں میرا پہلا سفر تھا۔

سنا کوٹ سے مولانا عزیز گل کے گاؤں سے زے تک ساڑھے تین میل کا فاصلہ ہے اور ایک کچی سڑک وہاں تک جاتی ہے۔ ایک میل تک نہر کے کنارے کنارے چلتے ہیں بعد ازاں پتھر ملا راستہ شروع ہو جاتا ہے جو کافی تکلیف دہ ہے۔ میں تلنگے میں ہچکولے کھاتا

ہوا سے رکنے کی طرف جا رہا تھا اور میری زبان پر بار بار یہ مصرع آتا:

دشت پڑتا ہے میاں عشق میں گھر سے پہلے

یہ پورا علاقہ بڑا زرخیز ہے اور سڑک کے دونوں جانب دور دور تک تمباکو،  
ایکھ اور مکئی کے کھیت نظر آتے ہیں۔ تمباکو اور گنا اس علاقے کی خاص پیداوار  
ہیں۔ یہاں سفید رنگ کی مکئی پیدا ہوتی ہے جو بہت میٹھی ہوتی ہے، قیام پاکستان  
سے قبل یہ علاقہ بڑا ہی پس ماندہ تھا اور غلام کا معیار زندگی کسی حال میں بھی بھر  
اور دھات کے زمانے میں رہنے والے لوگوں سے مختلف نہ تھا۔ قیام پاکستان کے  
بعد درگئی کے مقام پر دریائے سوات کا پانی روک کر بن بجلی پیدا کی گئی اور اس  
علاقے کے ایک ایک گاؤں میں بجلی پہنچ گئی۔ اب گھر گھر میں پنکھے اور کولر چل رہے  
ہیں۔ دریائے سوات کی ایک نہر اس علاقے کو سیراب کرتی ہے۔ یہاں کی زمین اتنی  
زرخیز ہے کہ وہ سونا اگھتی ہے۔ بہترین قسم کا درجیہ تمباکو، جس سے اعلیٰ برانڈ کے  
سگریٹ بنتے ہیں، یہاں کاشت کیا جاتا ہے۔

سے رکنے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو ۱۹۲۶ء میں آباد ہوا۔ اس میں کل ۳۳  
گھر ہیں اور کوئی ڈیڑھ صد کے قریب نفوس وہاں رہائش پذیر ہیں۔ مولانا عزیز  
گل کا مکان گاؤں میں سب سے نمایاں ہے۔ سنا ہے کہ اس کا نقشہ ان کی انگریز اہلیہ  
نے تیار کیا تھا۔ گھر سے پچاس ساٹھ میٹر کے فاصلہ پر مولانا کا ڈیرہ یعنی مردانہ  
نشست گاہ ہے اور اس سے متصل ایک مسجد ہے۔ گاؤں میں بجلی موجود ہے اور مولانا کے  
ڈیرہ میں کولر اور پنکھے چل رہے تھے۔

جب میں ان کے ڈیرہ پر پہنچا تو برآمدے میں دو تین نوجوان کھڑے تھے۔ میں نے  
اپنی آمد کا مقصد بتایا تو ایک نوجوان مجھے ایک بڑے دالان میں لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ  
دستر خوان بچھا ہوا ہے اور چند حضرات پر تکلف کھانا تناول کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی



عیساں عبدالرؤف اٹھے اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو فرمانے لگے کہ وہ بینات (کراچی) میں میرے مقابین پڑھ چکے ہیں اس لیے مزید تعارف کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے مجھے بھی کھانے میں شریک کر لیا۔

کھانے میں افغانی طرز پر پکا ہوا پلاؤ تھا، جس میں کشمش اور چھوٹے بھی ڈالے گئے تھے۔ اس کے علاوہ مرغ کا سالن، اٹرے والا کسٹرڈ، خمیری روٹیاں اور دہی بھی دسترخوان پر موجود تھے۔ مجھے سفر میں ہونے کی وجہ سے کئی روز سے اچھا کھانا کھانے کو نہ ملا تھا، اس لیے اس روز خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ جَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ پلاؤ اس قدر لذیذ تھا کہ میں نے اور کسی چیز کو چھوا تک نہیں۔ حرف بنشاش کے فاضل مصنف نذیر احمد شیخ نے ایسے ہی مزیدار پلاؤ کو دیکھ کر کہا تھا:

جہاں بھی پلاؤ بگھا مارا گیا ہے      زمیں سے فلک تک بھپا مارا گیا ہے  
اسی غم میں شیطان مارا گیا ہے      کہ مومن پہ یہ کیا اتا مارا گیا ہے  
حاضرین مجلس میں سے مولانا سید محمد یوسف بنوری مرحوم کے فرزند نواز محمد مولانا محمد  
بنوری، مرحوم کے داماد مولانا محمد طاہر (مجلس علمی کراچی والے) مولانا احمد صاحب،  
راولپنڈی کے ایک خطیب مولوی سعید الرحمن، جو بسطۃ فی العلم والجسم کی عملی

لہ صحیح لفظ بنوڑی ہے۔ مولانا مرحوم نے اسے معرب کر کے بنوڑی اور پھر البنوڑی بنالیا تھا۔ بنوڑی یا چورہ (نزد انبالہ) سے شمال مشرق میں نو میل کے فاصلہ پر ایک تاریخی قصبہ ہے۔ مولانا مرحوم کے جد امجد حضرت آدم بنوڑیؒ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے خلیفہ اعظم تھے۔ تاریخ پاک و ہند میں خاندان سادات کے بانی خضر خان کے والد داد دادا بھی بنوڑ کے رہنے والے تھے۔ ان کے مزار بھی وہیں ہیں۔

تفسیر پیش کر رہے تھے، اور مولانا اسماعیل بہام جی (جنوبی افریقہ والے) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں دیوبندی حلقے میں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کی وجہ سے اتنا مشہور ہوں کہ میاں صاحب کو مہانوں کے ساتھ میرے تعارف کی ضرورت پیش نہ آئی اور میرا نام سنتے ہی سب نے اہلاً و سہلاً کہتے ہوئے مجھے بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میاں عبدالرؤف نے مولانا عزیز گل سے میرا تعارف کر دیا۔ مولانا محمد طاسین نے بھی چند جملے ادا فرمائے۔ مولانا کے ہاتھ دھلانے کے لیے مولانا محمد طاسین ایک برتن اٹھالائے اور مولوی سعید الرحمن پانی کا لوٹا لے آئے۔ ان دونوں نے ہاتھ دھلانے کے لیے بڑا اصرار کیا لیکن موصوف کسی طرح بھی رضامند نہ ہوئے۔ مولانا چھڑی کے سہارے دالان سے باہر تشریف لائے اور برآمدے میں جا کر ہاتھ دھوئے اور کھلی ہوئی۔

دالان میں متعدد چارپائیاں موجود تھیں جن پر گاؤں کے بڑے ستے تھے۔ مولانا ایک چارپائی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ میں ان کے بالمقابل ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میری دائیں جانب مولانا محمد طاسین اور بائیں جانب میاں عبدالرؤف بیٹھ گئے۔ مولانا کے بائیں طرف ایک چارپائی پڑی تھی، اس پر مولانا اسماعیل بہام جی بیٹھ گئے اور ایک دوسری چارپائی پر مولوی سعید الدین نے قبضہ جما لیا۔ اب گفتگو کا آغاز ہوا۔

مولانا عزیز گل نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا ”آپ تو مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی جیسے بزرگوں کے ساتھ نشست دبر خواست رکھنے والے ہیں، اتنے سمجھدار ہو کر یہاں کیوں آئے؟“ میں نے عرض کیا ”حضرت آپ کی نسبت حضرت شیخ الہندؒ سے بڑی قوی ہے، اس لیے دل میں آپ کی زیارت کی بڑی خواہش تھی۔“ اس پر انھوں نے بڑے انکسار کے ساتھ فرمایا ”بھائی! میں ایک عامی ہوں۔ مجھ میں کوئی بزرگی نہیں ہے۔“

پتہ نہیں لوگ کیوں آجاتے ہیں۔ میں نے بہت سے بیروں کو دیکھا ہے۔ وہ بزرگ بن کر مصیبت میں پھنس گئے۔ میں مولانا کی باتیں نقل کرنا چاہتا تھا لیکن مولوی سعید الرحمن نے اشارے سے منع کر دیا کیونکہ موصوف اپنے بارے میں کچھ لکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔

علامہ کرام کی جماعت مجھ سے تین گھنٹے پہلے سے رے پہنچی تھی اس لیے انھیں مولانا کے ساتھ گفتگو کا کافی موقع مل گیا تھا۔ تاہم وہ ان کی زبان سے مزید باتیں سننے کے متمنی تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں زیادہ سے زیادہ سوال پوچھوں۔

میں نے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کے بارے میں جواب دینے سے گریز کرتے ہیں اور پرانے اظہار کی طرح صدی نسخے اپنے ساتھ ہی قبر میں لے جانا چاہتے ہیں۔ میری بات سن کر مولانا مسکرائے اور فرمایا ”اب تمھیں شکایت نہیں ہوگی، لیکن اسے کہیں چھاپ نہ دینا۔“ قدرے توقف کے بعد ارشاد فرمایا ”وعدہ کریں کہ ان باتوں کو شائع نہیں کریں گے۔ میری باتیں بکواس ہوتی ہیں اور میں بکواس خوب کر لیتا ہوں۔“ میں نے عرض کیا ”حضرت! ہمارے لیے تو یہ ملفوظات ہیں۔“ میری بات سن کر مولانا نے فرمایا ”مجھ میں بزرگوں والی کوئی بات نہیں ہے، البتہ میں نے بزرگوں کو دیکھا ضرور ہے۔“ یہ معنی منٹ کے سکوت کے بعد ارشاد ہوا ”تم تاریخ داں ہوتا رہ گئے ہو۔“ میں نے عرض کیا ”حضرت! آپ تاریخ سازی میں صرف تاریخ لکھتا ہوں۔“ مولانا نے فرمایا ”اسی لیے میں تم سے ڈرتا ہوں۔ تم بڑوں کے ساتھ بیٹھتے ہو۔ یہ مولوی ہیں۔ میں ان کو کچھ نہیں سمجھتا۔ تم پروفیسر ہو۔ فوٹو لے لیتے ہو اور لکھتے ہو۔“

میرے استفسار پر انھوں نے فرمایا کہ ایک بار حضرت شیخ الہندؒ نے انھیں حاجی صاحب ترنگزئی کے نام ایک اہم پیغام دے کر بھیجا۔ حاجی صاحب ان دنوں قبائلیوں کا نگرینا۔ حاجی صاحب کا اصل نام فضل وا حد تھا۔ موصوف انگریزی عملداری سے ہجرت کر کے آزاد قبائلی علاقے میں جلیے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ (باقی صفحہ ۴۸۶)



کے خلاف جہاد پر آمادہ کر رہے تھے ابد ہشت نگری کے کسی گاؤں میں روپوش تھے۔ مولانا عزیز گل حضرت شیخ الہندؒ کا عطا کردہ سوٹا ہاتھ میں تھامے، حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ (دعین ممکن ہے کہ اس سوٹے میں حاجی صاحب کے نام کوئی خفیہ پیغام بند ہو۔) مولانا نے حاجی صاحب سے کہا کہ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا ہے کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کر دیں۔ حاجی صاحب نے روپے کی کمی کا عذر پیش کیا تو مولانا نے شیخ الہندؒ کی طرف سے انھیں یہ جواب دیا کہ اس کام کے لیے پیسہ نہیں ملے گا۔ بس وہ جہاد شروع کریں۔ حاجی صاحب نے ان کی بات سن کر فرمایا کہ وہ حضرت شیخ الہندؒ کی بات سمجھ گئے ہیں۔ مولانا محمد طاسین نے اس سوٹے کی بابت پوچھا تو مولانا نے فرمایا ”پتہ نہیں کہاں گیا“ مولانا کا حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ جو خصوصی تعلق ہے اس کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس تبرک کو یونہی ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔ یہیں سے اس شبہ کو تقویت ملتی ہے کہ اس سوٹے کے اندر ضرور کوئی خفیہ پیغام بند ہوگا۔

مولانا عزیز گل، حضرت شیخ الہندؒ کے جاں نثار خادم کی حیثیت سے سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ حتیٰ کہ مالٹا کی اسیری کے دوران میں بھی انھوں نے اپنے مخدوم کا ساتھ نہ چھوڑا۔ حضرت شیخ الہندؒ جب جہاز تشریف لے گئے تو بحری جہاز میں سکند کلاس میں اپنے لیے اور مولانا کے لیے دو برتھر ریزرو کروائیں۔ مولانا چاہتے تھے کہ وہ عرشہ جہاز پر سفر کریں لیکن مخدوم نہ مانے اور اپنے ساتھ سکند کلاس میں سفر کرنے پر اصرار فرمایا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جن دنوں موصوف مالٹا میں نظر بند تھے تو وہاں جنگی قیدیوں کے کئی کیمپ تھے۔ ان قیدیوں میں کئی نامور ترک حریف اور یورپ کے شاہی خاندانوں کے افراد بھی شامل

(حاشیہ بقیہ ص ۳۳) حاجی صاحب نے انگریزوں کے خلاف کئی معرکوں میں حصہ لیا۔ موصوف ”تحریک ریشمی رومال“ کے ایک اہم ستون تھے۔

تھے ترک فوجی آفیسر حضرت شیخ الہندؒ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے جب ان کے صاحب  
السیجن حکیم نصرت حسین فوت ہوئے تو جیل کے حکام نے کہا کہ وہ ایک ایسے مرض میں مبتلا  
رہ کر فوت ہوئے ہیں کہ ان کی میت دفن کرنے کی بجائے جلانی جائے گی حضرت شیخ الہندؒ  
نے اس پر سخت احتجاج کیا اور جب دوسرے کمیپوں میں یہ خبر پہنچی تو وہاں بھی ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔  
انگریز آفیسر زادر ڈاکٹر زمیت کو غسل دینا بھی خطرہ سے خالی نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم حضرت  
شیخ الہندؒ کے اصرار پر میت کو غسل دینے کی بجائے تیمم کر دیا گیا اور میت کو تابوت میں  
بند کر کے کسی مقامی قبرستان میں بڑی گہرائی پر دفن کر دیا۔

حاضرین میں سے کسی نے دریافت کیا کہ مالٹا میں نظر بندی کے دوران میں انگریز  
انہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں دیا کرتے تھے۔ مولانا نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے  
موقع کی رعایت سے عرض کیا کہ آزادی کے بعد کسی شخص نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری  
سے پوچھا کہ وہ انگریزوں کے عہد میں سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے، اب  
کیوں سیاست کو خیر ممنوعہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ شاہ جی نے بڑے معصومانہ انداز میں جواب دیا،  
میاں! ہم کس سے لڑیں اب تو دشمن بھی شریف نہیں رہا، "میری بات سن کر مولانا اور  
حاضرین مجلس مسکرانے لگے۔

میں نے عرض کیا کہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی فرد واحد حضرت شیخ الہندؒ  
کا جانشین نہیں ہوا۔ علم تفسیر میں ان کے جانشین مولانا خبیر احمد عثمانی ہوئے اور علم حدیث  
میں مولانا انور شاہ کشمیری، اسی طرح سیاست میں ان کے جانشین مولانا عبید اللہ سندھی  
ہوئے اور ان کا زہر و درع مولانا حسین احمد مدنی کے حصہ میں آیا۔ میں نے مولانا عزیز  
سے اس کی تصدیق چاہی تو انہوں نے فرمایا "یہ شاعری ہے" میں اب بھی یہ سمجھتا ہوں  
کہ میری رائے غلط نہیں ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ ایک بار دیوبند کی عید گاہ میں سیاسی نوعیت کا جلسہ ہو رہا تھا کہ

ایک دم بارش شروع ہو گئی اور جلے میں بھگدڑ مچ گئی۔ موصوف ان دنوں جوان تھے اور ان کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔ انھوں نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا: ”بڑے افسوس کی بات ہے کہ انگورہ میں ترک گولیاں کھار رہے ہیں اور تم بارش کے قطروں سے ڈر کر بھاگ رہے ہو۔ جہاں کہیں بھی ہو، بیٹھ جاؤ، مولانا فرماتے ہیں کہ ان کی یہ ڈانٹ کام کر گئی اور اس کے بعد کوئی شخص اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔“

دوران گفتگو مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی مرحوم کا نام آیا تو مولانا نے فرمایا ”حفظ الرحمن بھاگ دوڑ والے بزرگ تھے۔ خوب تھے مفتی عتیق الرحمن ہمارے ساتھی ہیں“ میں نے عرض کیا کہ ان دنوں موصوف نقرس کے مریض ہیں۔ اس پر مولانا نے دعائیہ کلمات سے انھیں یاد فرمایا۔

میں نے مولانا سے حضرت گنگوہیؒ سے ملاقات کے بارے میں سوال کیا، تو انھوں نے فرمایا: ”میں نے انھیں نہیں دیکھا“ جب میں نے حضرت تھانویؒ کے بارے میں ایسا ہی سوال کیا تو فرمانے لگے ”انھیں خوب دیکھا ہے“

میں نے ان سے سسے رٹے کے معنی پوچھے تو فرمایا کہ پشتو زبان میں سسے رٹے تحفہ میں دی گئی زمین کو کہتے ہیں۔ یہ گاؤں انگریزی عملداری میں قبائلی علاقے کی سرحد پر واقع تھا اور یہاں آئے دن پٹھانوں میں جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ کسی عالم دین نے فریقین میں صلح کر دادی تو انھوں نے بفر سیٹ قائم کرنے کی غرض سے تھوڑی سی زمین اس ٹالسٹ کو دے دی۔

مولانا نے فرمایا کہ عالمی جنگ سے قبل دیوبند میں ہندو کمزور تھے اور مقامی کانگریس کمیٹی بھی بڑی کمزور تھی۔ اس لیے ہم لوگ کانگریس کے لیے کام کیا کرتے تھے۔ جنگ کا زمانہ تھا کہ انھیں کسی طرح پیشگی اطلاع مل گئی کہ پولیس کانگریس کے دفتر پر چھا پہ مارنے والی ہے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے دفتر کا تمام ریکارڈ غائب کر دیا۔



گفتگو کے دوران میں مولانا عزیز گیل دیوبند میں اپنے پرانے ساتھیوں کا بار بار ذکر کرتے رہے۔ انہوں نے مولانا محمد میاں انصاری کا ذکر بڑی محبت کے ساتھ کیا اور دیوبند میں مولانا مدنی کی گرفتاری کا وہ مشہور واقعہ سنایا جو ان کے سوانح میں درج ہے۔ میں نے دیوبند کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر حضرت شیخ الہندؒ کے ایک نامور مرید مولانا مصطفیٰ حسن علوی کے ساتھ اپنی ملاقات کا ذکر کیا تو میری باتیں سن کر مولانا کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

میں نے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے ایک حدیث تبرکاً سنا دیجیے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا ”نظر کام نہیں کرتی۔ کتاب بھی پاس نہیں ہے۔“ بہر حال موصوف میری بات ٹال گئے لیکن کچھ دیر بعد دورانِ گفتگو ایک حدیث کا ترجمہ سنا دیا۔ اس پر مولانا محمد طاہرین نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا ”دیکھیے حضرت نے حدیث کا ترجمہ آپ کو سنا دیا ہے۔“

مولانا عبید اللہ سندھی کا ذکر چھڑا تو مولانا نے فرمایا کہ دیوبند میں ایک زمانے میں ان سے ملنا اور ان کے ساتھ کسی بھی قسم کا رابطہ رکھنا، بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں مولانا عزیز گیل ان سے ملتے رہے اور یہ بات دفترِ اہتمام والوں کی نظروں میں کھٹکتی تھی لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے پاس ادب کی وجہ سے وہ ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے۔ مولانا نے فرمایا ”دفترِ اہتمام والے اس وقت بھی مجھ سے ناراض تھے اور اب بھی ہیں۔“ مولانا نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ مولانا سندھی، حضرت شیخ الہندؒ کے جاں نثار اور بڑے بڑے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ سیاست میں سندھی کی پرواز بڑی اونچی ہے اور وہ نیچے نہیں آتے۔“ مولانا نے فرمایا کہ سندھی سیاست میں مشہور ہو گئے ہیں۔ موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ ان میں ایک بڑا نقص تھا کہ وہ ہر شخص پر اعتماد کر لیتے تھے اور اسے اپنا راز دان بنا لیتے تھے۔ اسی وجہ سے تحریک کا

راز فاش ہو گیا اور حضرت شیخ الہندؒ امدان کے رفقاء گرفتار ہوئے۔  
 سے رہے میں میری آمد سے قبل مولانا عریگل اپنے مہانوں کو بتا چکے تھے کہ  
 ان کا سال ولادت ۱۳۱۵ھ ہے۔ میاں عبدالرؤف نے مجھے بتایا کہ ان کا تعلق  
 کا کا خیل قبیلہ سے ہے۔ سے رہے ان کا وطن نہیں ہے یہ گاؤں ۱۹۲۶ء  
 میں آباد ہوا تھا اور مولانا ۱۹۲۵ء میں مدھی کے نقل مکان کر کے یہاں آباد ہو گئے۔  
 ان کی انگریز اہلیہ نے یہاں آنے سے قبل اپنی ضرورت کے مطابق مکان کا نقشہ تیار کیا۔  
 سادہ پتھروں سے بنا ہوا یہ مکان اس نیک بخت خاتون کے عزم اور سادگی کا آئینہ دار  
 ہے یہ موصوفہ ۱۹۳۶ء میں مولانا عریگل کے عقد میں ادیس برس کی ازدواجی زندگی  
 گزار کر ۱۳ مارچ ۱۹۶۶ء کی درمیانی شب کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔  
 مولانا عریگل کی تعلیم کا آغاز جیٹی مندری کے پرائمری اسکول سے ہوا۔ یہ گاؤں  
 اٹک سے چھ سات میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ موصوفہ ابتدائی سے لکھنے پڑھنے  
 میں بڑے تیز تھے اس لیے پرائمری کا امتحان بڑے اچھے نمبروں میں پاس کیا اور وظیفہ یاب  
 ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار مولانا شاہد گیل انگریزوں کے جانی دشمن تھے بدیں وجہ  
 انگریزوں نے انھیں درگئی میں نظر بند کر دیا تھا۔ جب انھیں ان کے وطنہ پانے کی  
 لہ میم صاحبہ مرحومہ کے پاس میں مولانا مفتی سیاح الدین کا کا خیل کا ایک پرمغز مضمون  
 ماہنامہ المئی اکوڑہ خٹک میں قسط وار چھپتا رہا ہے۔ وہ بڑی عابدہ ذراہدہ خاتون تھیں  
 اور اسلام کے لیے انھوں نے بڑی قربانی دی تھی۔  
 ۱۵ مولانا اسعد مدنی نے تحریک شیخ الہندؒ پر اپنے پیش لفظ میں نکاح کا سال  
 ۱۹۴۵ء لکھا ہے، جو صحیح نہیں۔  
 ۱۶ مولانا سید محمد میاں نے ان کا نام شہید گیل لکھا ہے، جو صحیح نہیں۔ اسی طرح انھوں نے درگئی کو  
 درگائی بنا دیا ہے۔ تحریک شیخ الہندؒ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۲۵۳۔

اطلاع ملی تو انہوں نے ان سے کہا کہ اگر انگریزوں سے وظیفہ لیا یا سرکاری اسکول میں تعلیم جاری رکھی تو وہ انہیں گولی مار دیں گے۔ والد بزرگوار کی دیکھائی کی خاطر انہوں نے سرکاری اسکول کو خیر باد کہا۔

اتفاق سے مولانا عزیز گل کے ایک چچا خاصے والد تھے اور انہوں نے اپنے فرزند کی تعلیم کا گھڑ پیا انتظام کر رکھا تھا۔ جو استاد ان کے ابن عم کو پڑھانے آتا اس سے موصوف بھی سبق لینے لگے۔ اُن کے مقابلہ میں ان کا ابن عم پڑھائی میں بڑا کمزور تھا اور استاد کی محنت کے باوجود وہ بے ذوق ہی رہا۔ ایک دن ان کے چچا نے اپنے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ اس پند رکش صرف کر رہا ہے اس کے باوجود وہ پڑھائی میں دیکھی نہیں لیتا۔ چچا کو اپنے مال و دولت پر بڑا گھمبڑ تھا اور اس نے ڈانٹ ڈپٹ کے دوران میں کئی بار دولت کے ضیاع کا ذکر کیا۔ مولانا عزیز گل کو چچائی یہ بات پسند نہ آئی اور انہیں روپے پیسے سے نفرت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے اس رذریعہ کو چھوڑ دیا کہ وہ حصول زر کی بجائے حصول تعلیم پر زیادہ توجہ دیں گے۔

مولانا عزیز گل و کلاً علی اللہ گھر سے نکلے اور پانی پت پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے ایک مسجد میں قیام کیا۔ اتفاق سے اس مسجد کا امام سچان تھا۔ اس لیے وہ بڑی مدت سے پیش آیا۔ چند روز بعد امام صاحب نے ان سے کہا کہ وہ مسجد میں امامت کے فرائض سنبھال لیں کیونکہ وہ اب کسی دوسری جگہ جانا چاہتا ہے۔ انہوں نے امام صاحب کی پیش کش ٹھکرا دی۔

ان کی طرح مسجد میں اور بھی کئی نوجوان مقیم تھے۔ ایک رات جب انہوں نے یہ سمجھا کہ مولانا عزیز گل سو گئے ہیں تو باہم صلاح و مشورہ کے بعد انہوں نے دیوبند جانے کا فیصلہ کیا۔ مولانا عزیز گل ان کی باتیں بڑے غور سے سنتے رہے اور اگلی صبح ان سے کبھی پہلے دیوبند روانہ ہو گئے۔

دیوبند آکر مولانا عزیز گل درس نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھنے لگے۔ کافی دنوں تک



ان کا تعارف حضرت شیخ الہندؒ اور دوسرے اکابرین کے ساتھ نہیں ہوا۔ ایک بار سوات کے مشہور عالم اور نامور مجاہد سدا کے ملا حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر اجمیر ہوتے ہوئے دیوبند آئے یہ دیوبند کے پٹھان طلبہ نے ان کے قیام کا بند دست کیا۔ ایک روز ملا صاحب نے مولانا عزیز گل سے کہا کہ وہ حضرت شیخ الہندؒ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ ان کا پیغام حضرت تک پہنچا دیں۔ مولانا عزیز گل حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ سرحد کے ایک نامور عالم دین اور نڈر مجاہد سدا کے ملا ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا ”ان سے جا کر کہو کہ وہ رات کا کھانا میرے ساتھ تناول فرمائیں۔ اور تم بھی ان کے ساتھ آنا“ مولانا عزیز گل نے برجستہ کہا ”اگر آپ نہ بھی کہتے تو بھی میں ضرور آتا“ حضرت شیخ الہندؒ کو ان کی یہ جرات پسند آگئی اور یہیں سے ان کا تعلق حضرت کے ساتھ قائم ہوا۔

ایک بار مولانا نے حضرت سے درخواست کی کہ موصوف انھیں مرید کر لیں حضرت طالب علموں سے بیعت نہیں لیتے تھے کیونکہ ذکر و شغل سے پڑھائی میں حرج ہوتا تھا ان کے اصرار پر حضرت نے فرمایا ”پہلے استخارہ کر کے دیکھ لو کہ تمہیں کہاں سے فیض ملے گا“ انھوں نے کہا ”حضرت میں استخارہ و استخارہ کچھ نہیں جانتا، بس مجھے بیعت کر لیجیے“ چنانچہ ان کے اصرار پر حضرت شیخ الہندؒ نے ان سے بیعت لے لی۔

مولانا عزیز گل نے دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ مفتی عزیز الرحمن عثمانی،

---

۱۵ مولوی محمد علی کنٹیب نے انھیں سوات کا بااثر رہنما تسلیم کیا ہے۔ مشاہدات کابل و یاغستان، مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی، ص ۵۰) حضرت شیخ الہندؒ ان جیسے مجاہدین کے ذریعے آزاد قبائل کو انگریزوں کے خلاف صف آرا کرتا جاتے تھے،

مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مرتضیٰ حسن چانم پوری اور میاں اصغر حسین دیوبندی جیسے علمائے کرام کے حضور زانوئے تلمذتہ کیا۔ ان بزرگوں کے علاوہ موصوف کسی اور کو خاطر میں نہیں لاتے۔ دوران گفتگو انھوں نے کئی بار فرمایا: ”باقی حضرات پر تو میں نے حکومت کی ہے“

مولانا عزیز گل کی پہلی شادی حضرت شیخ الہندؒ کی بھانجی کی صاحبزادی کے ساتھ ہوئی۔ ان کے فرزند میاں عبدالرؤف کی مادری زبان اردو ہے اور انھیں پشتو سے کہیں زیادہ اردو پر عبور ہے۔

مولانا عزیز گل نے کچھ عرصہ راندر، نواکھالی اور رڑکی کے دینی مدارس میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے لیکن انھیں یہ شغل راس نہ آیا۔ ایم صاحبہ کے ساتھ شادی کے بعد انھوں نے رڑکی میں سوختنی لکڑی کا کاروبار شروع کیا اور ۱۹۴۵ء میں سے رستے چلے آئے۔ یہاں آکر موصوف بالکل ہی گوشہ نشین ہو گئے، گاؤں میں تھوڑی سی زمین ان کی ملک ہے جس سے ان کی گذر بسر ہو جاتی ہے۔ ان کے فرزند ارجمند میاں عبدالرؤف نے خود کو ان کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کے لیے دین و دنیا جو کچھ بھی ہے، والد بزرگوار کی ذات ہے۔ میاں عبدالرؤف کی روایت ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں صوبہ سرحد کے بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں عوام کی رائے دریافت کرنے کے لیے استصواب ہوا تو ایک روز ایک مسلم لنگی مولانا کے پاس آیا اور کہنے لگا ”آپ قرآن کو دو ٹوڑیں گے یا گیتا کو“ اس کی بات سن کر مولانا خفا ہوئے اور بڑے تلخ لہجہ میں اس سے کہنے لگے ”قرآن کو گیتا کے مقابلے میں رکھنا، قرآن کی توہین ہے۔“ اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ پروپاگنڈہ کے لیے کوئی معقول طریق اختیار کیا جائے۔

سے رستے ایک معمولی سا گاؤں ہے اس لیے وہاں نماز جمعہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے

قرب وجوار میں بھی کہیں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی تھی اس لیے یہاں آنے کے بعد موصوف کا کئی عرصہ تک نماز ظہر ادا کرتے رہے، جب سخاکوٹ میں کاروباری مرکز قائم ہوا تو وہاں نماز جمعہ ہونے لگی۔ مولانا پیرانہ سالی کے باوجود نماز جمعہ کے لیے سخاکوٹ جانے لگے۔ اب کچھ عرصہ سے کمزوری کی بنا پر وہاں جانا چھوڑ دیا ہے اور گھر پر ہی ظہر کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ میاں عبدالرؤف نے مجھے بتایا کہ اب وہ مسجد تک بھی چل کر نہیں جاسکتے، اس لیے عموماً گھر پر ہی نماز ادا کر لیتے ہیں۔

اس پیرانہ سالی کے باوجود مولانا صبح تین بجے اُٹھ جاتے ہیں اور باقاعدگی کے ساتھ تہجد کے نوافل ادا کرتے ہیں۔ جب تک میم صاحبہ زندہ رہیں، موصوف تہجد کے فارغ ہو کر چائے نوش فرمایا کرتے تھے۔ اہلیہ کی وفات کے بعد اس معمول میں فرق آگیا۔ نماز فجر کے بعد موصوف سات بجے تک ورد و وظائف میں مشغول رہتے ہیں۔ ناشتہ کے بعد حاضرین میں سے کسی صاحب سے کوئی کتاب پڑھوا کر سنتے ہیں۔ اس کے بعد دوپہر تک آرام کرتے ہیں۔

مولانا کی صاحبزادی قرآن پاک حفظ کر رہی ہیں، مولانا ان کے ساتھ خود بھی ظہر تا عصر قرآن یاد کرتے ہیں۔ اس دوران میں موصوف کسی سے بات نہیں کرتے۔ نماز عصر کے بعد چائے کا درد چلتا ہے اور پھر ورد و وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ نماز مغرب کے بعد حالات حاضرہ سے واقف رہنے کے لیے ریڈیو سے خبریں سنتے ہیں۔ میاں عبدالرؤف نے مجھے بتایا کہ مولانا رات کو بی بی سی لندن سے اردو میں نشر ہونے والی خبریں بڑی باقاعدگی کے ساتھ سنتے ہیں۔

مولانا عزیز گل کا قد لمبا ہے اور پیرانہ سالی کے باوجود کمر میں کوئی خم نہیں آیا۔ اب بھی ان کی جال میں ایک وقار نظر آتا ہے۔ موصوف سفید کرتہ اور شلوار زیب تن کرتے ہیں اور سفید رنگ کی گول ٹوپی سر پر رکھتے ہیں۔ ان کا رنگ افغانوں کی



طرح سرخ و سپید ہے۔ نورانی چہرے پر سفید گول ڈاڑھی بڑی بھلی دکھائی دیتی ہے۔  
 بایں آنکھ کی بینائی آپریشن کے بعد لوٹ آئی ہے لیکن دائیں آنکھ کی بینائی  
 درست نہیں۔ انھوں نے کبھی چشمہ استعمال نہیں کیا۔ ان کے منہ میں ابھی تک کسی  
 دانت باقی ہیں۔ میں نے میاں صاحب سے دانتوں کے متعلق دریافت کیا تو  
 انھوں نے بتایا کہ وہ اصلی ہیں کیوں کہ انھیں تصنع سے نفرت ہے، اس لیے مصنوعی  
 دانت اور چشمہ نہیں لگاتے۔ انھوں نے اپنے فرزند کو یہ وصیت کی ہے کہ ان کی تجھیز  
 و تکفین میں نمائش نہ کریں۔ ان کی یہ بھی آرزو ہے کہ وہ گننامی کے عالم میں سفر کے  
 دوران میں فوت ہوں تاکہ ان کے جنازہ پر زیادہ مجمع نہ ہو۔

ان کی یادداشت میں سنہ ۱۹۷۰ کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کا ذہن ایک نوجوان کے ذہن  
 کی طرح کام کرتا ہے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ اتر پردیش میں گزرا ہے اس لیے موصوف  
 بڑی روانی کے ساتھ اردو میں بات چیت کرتے ہیں۔ ان کے لب و لہجہ میں ”پٹھانیت“  
 کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

جب حاضرین نے مولانا عریضی سے بادل نا خواستہ رخصت چاہی تو انھوں نے  
 خاص طور پر مجھے مخاطب کر کے فرمایا ”پھر نہ آئیں“ میں نے عرض کیا ”حضرت حلوائی  
 کی رکان سے مکھی نہیں ہٹتی“ مولانا نے فرمایا ”اتنی دور سے آتے ہو، یہاں آکر  
 پھٹتے تو نہیں“؟ میں نے عرض کیا ”یہ تو میری زندگی کا ایک یادگار دن ہے۔“  
 خداوند قدوس نے میری ایک دیرینہ آرزو پوری کر دی ہے۔ آپ سے مل کر تو میری  
 سند لقا مستند ہو گئی ہے۔

مجھے رخصت کرتے وقت مولانا نے فرمایا ”سعید احمد اور عتیق الرحمن کو میرا  
 سلام کہیں۔ یہ دونوں بڑے لوگ ہیں“ قدرے توقف کے بعد فرمایا ”وعدہ کر د  
 کرو کہ لکھو گے نہیں“ میں نے اس پر سکوت اختیار فرمایا۔

میرے ساتھ دوسرے ہمانوں نے بھی دالپسی کی اجازت چاہی تو مولانا نے سب کے ساتھ معافہ کیا اور چھڑی کے سہارے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے اس وقت مجھے کچھ یوں محسوس ہوا کہ ہمارے سامنے ایک عام انسان کی بجائے پوری صدی کی تاریخ کا ریکارڈ چل رہا ہے۔

دوسرے ہمان دو کاروں میں سے رستے آئے تھے اس لیے ایک کار میں میرے لیے بھی گنجائش نکل آئی۔ میں نے ٹانگہ والے کو کرایہ دے کر رخصت کر دیا اور ان حضرات کی معیت میں سنا کوٹ پہنچ گیا۔ ظہر کی نماز ایک زیر تعمیر مسجد میں ادا کر کے میاں عبدالرؤف کی دکان پر چلا آیا اور طلبہ کی آمد تک تقریباً ایک گھنٹہ ان کے پاس بیٹھنے اور مولانا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔

اگر میاں عبدالرؤف توجہ دیں تو وہ اپنے والد بزرگوار کے ملفوظات جمع کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہو گا۔

## تفسیر ابن کثیر کامل

مکتبہ فیض القرآن دیوبند نے اس کتاب کو شائع کیا ہے۔ آج کل یہ کتاب مکتبہ برہان میں ملتی ہے تاؤڈریجے غیر مجلد قیمت: 250/- مینجر مکتبہ برہان دہلی۔

# تبصرے

منار صدرا از مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی، تقطیع متوسط ضخامت ۲۷۸ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ، قیمت مجلد 35 روپے : ندوۃ المصنفین، اردو بازار، دہلی۔

یا خیر اصحاب کو معلوم ہے کہ مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کے مقبول و مشہور مقرر ہیں۔ کیونکہ ایک ریڈیو تقریر کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ مانگ پر آواز کے فطری اور موزوں ہونے کے علاوہ تقریر کی زبان ہلکی پھلکی اور شگفتہ و دلچسپ ہو۔ مواد اور معلومات کے اعتبار سے عبارت قل و دل کی مصداق ہو اور طرز ادا میں بیباختگی اور بے تکلفی کا انداز ہو، اور مفتی صاحب میں یہ تمام اوصاف و کمالات جو حسن و تحریر و تقریر کے جوہر ذاتی ہیں خدا داد ہیں، اس بنا پر گزشتہ تیس برس کی مدت میں موصوف کی سینکڑوں تقریریں ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہو کر لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے لیے فردوسِ گوش بن چکی ہیں، یہ تقریریں منتشر تھیں، ڈاکٹر عنوان حشری جو خود اردو کے مشہور ادیب، نقاد اور شاعر ہیں اور مفتی صاحب کے بڑے عقیدت مند ہیں ان کو خیال پیدا ہوا تو جن تقریروں کے مسودات دستیاب ہو سکے ان کو موضوع دار حسن سلیقہ سے مع ایک دلچسپ اور مفید مقدمہ کے مرتب کر کے تقریروں کی افادیت عام کر دی۔ یہ تقریریں



جو گنتی میں ۴۱ ہیں، نہایت متنوع اور مختلف موضوعات پر ہیں، سیرت النبی، عید الفطر، عید قربان، شبِ برات اور حج پر کسی کسی تقریریں ہیں، لیکن موضوع گفتگو ہر ایک کا الگ، اور اگر کہیں موضوع بھی ایک ہو گیا ہے تو طرزِ ادا اور مواد کے تنوع نے تقریروں کے اندر بھی تنوع پیدا کر دیا ہے، علاوہ ازیں اس مجموعہ کی بعض تقریریں جو اسلام کے قانون وراثت، کیا مسلم پرسنل لا میں تبدیلی ضروری ہے؟ عرب و ہند کے تعلقات ”ہندوستان اور سیکولرزم“ نقشبندی سلسلہ تصوف، اور بعض اہم اکابر طریقت و تصوف پر ہیں بجائے خود نہایت اہم، مفید اور معلومات افزا ہیں، غرض کہ اس کتاب میں اسلامیات کے سلسلہ کے مختلف اور متنوع موضوعات پر بڑا اچھا اور قیمتی مواد جمع ہو گیا۔ اور زبان و بیان نہایت شگفتہ اور ادبی ہے، اس لیے اس کتاب کا مطالعہ درحقیقت ہم فرما دہم ثواب کا مصداق ہو گا۔

فصول فی الشعر العربی فی العهد النبوی : (عربی) از ڈاکٹر ای۔ کے احمد سکٹی، ریڈر شعبہ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالا۔ تقطیع خورد، ضخامت ۱۵۰ صفحات، ٹائپ جلی اور روشن، قیمت - 25/-، پتہ : مکتبہ الہدیٰ مسجد بازار، کالی کٹ، کیرالا۔

ہر کلام کی طرح شعری دو قسم کا ہوتا ہے، ایک ممدوح اور دوسرا مذموم، یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں شعری دونوں صفات کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس سے یہ ثابت ہوا کہ اچھا شعر بہر حال محمود ہے، اس موضوع پر مدلل اور مفصل بحث کرنے کے بعد لائق مؤلف نے یہ دکھایا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپؐ نے بعض مواقع پر پورے یا ادھورے شعر پڑھے اور بعض شعرا کے اشعار کی تحسین بھی فرمائی، پھر صحابہ میں تو کثرت سے ایسے حضرات تھے جو خود شاعر بھی تھے اور نقاد بھی، مستشرقین کا عام پرہیزگندہ ہے کہ چونکہ اسلام کو شعر سے عداوت اور بغض ہے

اس لیے اسلام کے بعد عربی شعر و شاعری پر انحطاط طاری ہو گیا۔ ڈاکٹر احمد کٹی نے اس کا جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام نے شعر کو کمزور کرنے کے بجائے اس کے اسلوب اور آہنگ میں انقلاب عظیم پیدا کر کے اسے کچھ سے کچھ بنادیا ہے، غرض کہ یہ پوری بحث نہایت دلچسپ اور معلومات افزا ہے، جو کچھ لکھا ہے تحقیق اور حوالہ سے لکھا ہے، عربی زبان کے اساتذہ اور طلباء کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

محاسن الشعر، البحر، والثانی : از مولوی محمد اجمل ایوب الاصلاحی الندوی، تقطیع خورد صفحات ۱۲۲ صفحات، کاغذ بہتر، طائپ باریک، قیمت درج نہیں : پتہ : مکتبۃ الاصلاح، سرگئے میر۔ اعظم گڑھ۔

لائق مرتب نے درستہ الاصلاح، سرانمیر اعظم گڑھ کے تحتانی درجوں کے لیے ایک خاص نقطہ نظر کے ماتحت عربی اشعار کا ایک مختصر انتخاب محاسن الشعر، البحر، والاؤل کے نام سے دو تین برس پہلے شائع کیا تھا وہ پسند کیا گیا اور مقبول ہوا، زیر تبصرہ کتاب اسی کا جزو ثانی ہے، اس کتاب میں ایک سو تیرہ (۱۱۳) انتخابات شعرائے قدیم۔ (عہد جاہلیت و مخضرین) کے خاص خاص عنوانات کے ماتحت درج کیے گئے ہیں، یہ سب عنوانات وہ ہیں جن سے عہد قدیم کے شعراء کے عقائد، اعمال و افعال اور اخلاق و عادات اور حسن و سوائی میں وہ رہتے تھے اس کے عواذ رسمیه پر روشنی پڑتی ہے، حواشی میں مختصر اہر شاعر کے سوانح اور شکل الفاظ کے معانی بھی درج کیے گئے ہیں، اور اگر کوئی بات ادب میں مختلف قیہ ہے تو اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے، مثلاً صفحہ ۳ پر "لا تدریک لہ" کے زیر عنوان جو اشعار درج ہیں ان کو زیرین عمرو بن نفیل کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن حاشیہ میں تصریح کر دی ہے کہ یہ نسبت مشتبہ ہے، ان وجوہ کی بنا پر یہ انتخاب اخلاقی، تاریخی اور ادبی حیثیت سے

بہترین انتخاب ہے، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے علاوہ مدارس کو بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے، البتہ شروع میں ۲۵ صفحات کا مقدمہ بے ضرورت ہے۔۔۔ طویل ہو گیا ہے اسے مختصر ہونا چاہیے تھا۔

یاد وطن : از ڈاکٹر عبد المجید شمس عظیم آبادی، تقطیع خورد، ضخامت ۱۲۶ صفحات کتابت و طباعت متوسط قیمت مجلد -/10 پتہ : سائنٹیفک پبلشرز، مجید والا، پٹنہ - 8 00006

ڈاکٹر عبد المجید صاحب شمس اردو زبان کے مشہور صاحب طرز اور صاحب فکر شاعر ہیں، آپ کی دو مثنویاں "حیات و کائنات" اور "جلوہ صدرنگ" اس سے پہلے شائع ہو کر باب علم و ادب سے جدت و ندرت اسلوب و خیال کے باعث خراج تحسین و آفرین وصول کر چکی ہیں، اب یہ تیسری مثنوی ہے جو منظر عام پر آئی ہے یہ بھی ایک بڑی عجیب و غریب اور غالباً اپنے خاص رنگ اور نوعیت کے باعث اردو زبان کی پہلی مثنوی ہے شمس عظیم آبادی صاحب پٹنہ کے مضافات میں ایک معمولی مگر شرفار سے آباد گاؤں شاہو سبکیہ میں پیدا ہوئے، یہیں پلے بڑھے، جوان ہوئے، اعلیٰ تعلیم حاصل کی، ہندوستان اور اس سے باہر بڑے بڑے عہدوں پر رہے، ملکوں ملکوں گھومے، زمانہ کا سرد و گرم سب کا مزہ چکھا، زندگی کے نشیب و فراز اور انقلابات روزگار کے تماشے دیکھے۔ ان کی زندگی میں جو انقلابات آئے ان کا گاؤں بھی ان سے محفوظ نہیں رہا۔ اس مثنوی میں شاعر نے گاؤں کی ایک ایک خصوصیت اور اس کی ماضی و حال کی سرگزشت کا ایک ایک جز اس قدرت زبان اور چابکدستی سے بیان کیا ہے کہ گاؤں کی تصویر آنکھوں میں پھر نے لگتی ہے، کتاب کے آخر میں یہ طور ضمیمہ کے حضرت شاہ فضل اللہ بخاری کے خاندان کا جس کے ایک فرد خود لائق مصنف ہیں ایک شجرہ بھی درج کر دیا گیا ہے، یہ شجرہ اگرچہ ناقص ہے تاہم تاریخ کے طلباء کے لیے



قابل قدر ہے۔ امید ہے کہ سابقہ دو مثنویوں کی طرح یہ تیسری مثنوی بھی اردو زبان و ادب کے حلقہ میں مقبول ہوگی۔

آوارگانِ عشق : از ڈاکٹر عبادت بریلوی، تقطیع خورد، ضخامت ۱۱۴ صفحات

کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد/20 پتہ : ادارہ ادب و تنقید، لاہور

ڈاکٹر عبادت صاحب بریلوی اس سے پہلے ایک کتاب ”رہ تور دان شوق“ کے نام سے شائع کر چکے ہیں جس میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق اور جگر مراد آبادی کی شخصیتوں کی مرقع نگاری اپنی ذاتی ملاقات اور واقفیت کی روشنی میں کی تھی، اب یہ اسی سلسلہ کی دوسری کتاب ہے، اس میں برصغیر کے پانچ ممتاز ادیب اور شاعر: مجاز، میراجی، ناصر کاظمی، محمد حسن عسکری اور صوفی غلام مصطفیٰ اہلم کی شخصیتوں کی مرقع کشی کی گئی ہے، مرقع نگاری کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں ایک بے لوث اور عمیق قوتِ مشاہدہ اور دوسرے بے تکلف اور رواں دواں پیرایہ بیان لائق مصنف جو اردو زبان کے مشہور ادیب، نقاد اور غالباً سب سے زیادہ کثیر التصانیف مصنف ہیں ان میں یہ دونوں وصف بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں اس لیے یہ مرقعہ دلچسپ بھی ہیں اور معلومات افزا بھی، ایک جگہ عبادت صاحب نے معلوم نہیں یہ کیسے لکھ دیا، ”وہ یہ روایتی انداز کے خوبصورت لہجے اور سنہری کامدار جوئے منگواتے تھے، انھیں بے تکلفی کے ساتھ زیب تن کرتے تھے“ (ص ۱۱۰) کیونکہ جو تا زیب پاکیا جاتا ہے نہ کہ زیب تن“

پاجا سراجِ زندگی : از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تقطیع متوسط ضخامت دو دو صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد - 13 - پتہ : مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ،

یہ کتاب مولانا کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو آپ نے وقتاً فوقتاً دارالعلوم

معدۃ العلماء یا اور بعض مدارس کے طلباء کو مخاطب بنا کر کی ہیں۔ ان تقریروں میں مولانا نے جس سوز و درد و اندر و دگر ب مگر ساتھ ہی دقت و وسعت فکر و نظر کے ساتھ مدارس عربیہ کی اہمیت، ان کے تقاضے، تاریخ میں ان کی شاندار خدمات، موجودہ زمانہ میں ان کی ذمہ داریاں، وغیرہ ایسے مسائل و مباحث پر گفتگو کی ہے وہ ”از دل خیزد و بر دل ریزد“ کے بمصداق نہایت مؤثر، سبق آموز اور موافقت آفریں ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر مدرسہ کا ہر طالب علم ان تقریروں کو توجہ اور رغبت سے پڑھے اور ان سے مستفید ہو۔

باقیات — ایک جہان : مرتب : مولوی حافظ طہیر احمد باقوی راہی فدائی۔  
سائز ۲۰x۲۶ صفحات ۲۷۲ جلد قیمت ۱۵ روپے۔ ناشر ادارہ صغیر انجمن  
ترقی اردو باقیات صالحات ویلور (تامل ناڈو)

جنوبی ہند میں مدارس اسلامیہ متعدد مقامات پر ملی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں ویلور کا مشہور و قدیم مدرسہ باقیات صالحات سرفہرست ہے۔ اس کی دینی و تعلیمی خدمات اسلامیان ہند کی تاریخ کا روشن ترین باب ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی مدرسہ، اس کے بانی، اساتذہ کرام اور فضلا و مدرسہ میں سے بعض اہم شخصیات کے تذکار پر مشتمل ہے۔ مضامین عام طور پر دلچسپ، عام فہم اور معلومات افزا ہیں، اور زیادہ تر مدرسہ مذکور کے ترجمان مجلہ صغیر سے لے کر شامل کتاب کیے گئے ہیں۔ ترتیب مضامین میں کسی خاص پہلو کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ فہرست کا نہ ہونا اس کتاب کی بڑی خامی ہے۔ بزرگان دین اور علماء کرام کے سوا گرامی کے ساتھ القاب و آداب کے جو کوہ گراں عجب مذاق نے رائج کیے تھے، ان کی جھلکیاں اس کتاب میں بھی نمایاں ہیں۔ کسی بھی بزرگ یا ولی اللہ سے محبت و عقیدت کا یہ تقاضا ہرگز نہیں کہ ہم غلو کی حدوں کو پار کر جائیں۔ ایسے القاب ہیں سے ”اعلیٰ حضرت“ کے لقب میں تو یوں بھی ”بوسے بریلویت“

آتی ہے یا اس سے زوال یافتہ جاگیر دارانہ نظام کی المناک یاد تازہ ہوتی ہے۔ مدارس عربیہ کے طلباء کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہر حال مفید ہوگا۔ (ف۔ ع)  
 ڈاکٹر اقبال سے ادب کے ساتھ : مصنف ڈاکٹر توری سائرز ۲۰x۳۰ صفحات  
 ۸۰ قیمت ۳ روپے۔ ناشر: سر کوٹھراپی سینٹر، اشوک مارکیٹ سدی عنبر بازار حیدرآباد (آندھرا)

ڈاکٹر توری صاحب "سر کوٹھراپی" (یعنی علاج بغیر دوا) کے ڈاکٹر ہیں اور جب انہیں اپنے پیشہ سے فرصت ہو تو بقول خود ان کا محبوب مشغلہ شعر و شاعری ہے، لیکن ستم ظریفی زمانہ دیکھیے کہ بے شمار رباعیاں، غزلیں اور قصیدے لکھنے کے باوجود تا حال ان کی رباعیات کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں آسکا یا اب ان کی یہ ایک زیر نظر تصنیف شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا نام عجیب ہے تو اس کے مندرجات عجیب تر اور مقصد عجیب ترین شعر گوئی جب "مشغلہ" بن جائے تو شاید یہی نتائج سامنے آتے ہیں۔  
 ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال، میر انیس، دبیر، خسرو، امجد غالب، داغ، مولانا روم، سرمد، خیام اور نظیری وغیرہ کے مختلف اشعار کا جواب اشعار میں دینے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس سعی کو انھوں نے فن شاعری میں "صنف محکیات" کا نام دیا ہے۔ اس طرح وہ ایک نئی صنف کے موجد بھی بن گئے ہیں۔ اللہ ہم زور فرمادے۔

بے شبہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے انکار نظم کرنے پر پوری قدرت حاصل ہے، لیکن موصوف نے اپنی اس تصنیف میں مذکورہ بالا اشعار کے اشعار کا جو جواب دیا ہے اسے "درود لا دوا" کے مقابل "علاج بے دوا" ہی کہا جاسکتا ہے اور انہی الفاظ پر حد تبصرہ تمام شد۔

(ف۔ ع)

کاروباری خط و کتابت : از کے۔ محمد احمد ابن مخدوم ایم۔ اے۔ تقطیع۔  
 ۲۰x۳۰ صفحات ۱۶۸ غیر مجلد قیمت ۱۰ روپے۔ ناشر: کرتا ٹک اشاعت گھر بنگلور۔



اپنے مافی القمیر کو خط و کتابت میں سیدھے، صاف، عام فہم اور مؤثر انداز میں پیش کرتا ایک لطیف فن ہے۔ تجارت میں کامیابی کے لیے اس کی بہت اہمیت ہے۔ مگر اردو دواں حلقہ، تجارت اس فن کے ابھی تک غیر مانوس ہے۔ محمد احمد صاحب نے ایسے ناواقف کاروباری اصحاب کے لیے یہ کتاب تالیف کی ہے، جس میں انھوں نے خاصی وضاحت سے تجارتی خطوط نویسی کے تقریباً تمام ضروری پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور خطوط کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ اصحاب تجارت کے لیے یہ ایک سودمند کتاب ہے۔ (ف - ع)

## مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط،

طبع جدید آفسٹ

مرزا مظہر جان جاناں اٹھارہویں صدی عیسوی کے سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگوں میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے، ان کی خالقانہ ارشاد نے اخلاقی اور روحانی اقدار کو فروغ دینے میں ناقابل فراموش رول ادا کیا ہے۔ مرزا صاحب کی ادبی یا مذہبی شخصیت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ان خطوط کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ صرف یہی خطوط ہیں جو مرزا صاحب کے عقائد و نظریات ذہن اور شخصیت کو سمجھنے میں مہم و معاون ہو سکتے ہیں۔ انہیں خطوط سے ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب مغل حکومت کی سیاست میں نمایاں حصہ لیتے تھے آخر کتاب میں اشاریہ اور جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کی فہرست بھی شامل ہے

صفحات ۲۷۲ قیمت مجلد -/15 روپے آفسٹ

ملنے کا پتہ:

مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد دہلی

# مسلمانوں کی بحری سرگرمیاں

تاریخ اسلام کے بہت سے ایسے گوشے ہیں جن پر کما حقہ، توجہ نہیں دی گئی، جیسے تاریخ حریات بری و بحری، تاریخ تجارت بری و بحری، ابدان ہی سے متعلق بہت سے موضوع ہیں، جن کا جانتا تاریخ کے طالب علم کے لیے ضروری ہے۔ ابتداء میں اگر اس موضوع پر لکھا بھی گیا ہے، مگر وہ کتابیں اب موجود نہیں ہیں۔ اسی فروغ کے پیش نظر یہ کتاب ”مسلمانوں کی بحری سرگرمیاں“ آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ اس میں فن جہاز رانی، جہاز رانی کی تاریخ اور مسلمانوں کی بحری سرگرمیوں اور محیر العقول کارناموں پر پہلی محققانہ کتاب ہے جس میں علم الملاحہ اور اس کے منقلب گوشوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ تقطیع متوسط، سائز ۲۶x۱۷ صفحات ۴۵۶ قیمت مجلد -/25 غیر مجلد -/22۔

## نعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم

ہندوستان کے مشہور و مقبول شاعر بہتر ادلکھنوی مرحوم کے نعتیہ کلام کا دلپذیر مجموعہ ہے جسے مکتبہ برہان نے تمام ظاہری دلائلیوں کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے جن حضرات کو آل انڈیا ریڈیو سے ان نعتوں کے سننے کا موقع ملا ہے وہ اس مجموعہ کی پاکیزگی اور لطافت کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں۔ قیمت مجلد -/6

مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

مرزا محمد حسن قنیل کی سب سے زیادہ قابل قدر اور مستند کتاب

## ”ہفت تماشا“

جو ابھی تک اردو داں طبقہ کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔ اب ڈاکٹر محمد عمر استاد شعبہ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے اسے فارسی سے سلیں اور با محاورہ اردو میں منتقل کر کے ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے طالب علموں اور محققوں کے لیے اس انمول ذخیرہ معلومات کا افادہ عام کر دیا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں شمالی ہند کی تہذیبی سرگرمیاں ہوں یا سیاسیات شعرو شاعری ہو یا مذہبی تحریکات یا سماجی رسوم، ان کا مطالعہ کرنے والا کوئی ناقد اس کتاب کو نظر انداز کر کے اپنے موضوع سے انصاف نہیں کر سکتا کتاب کے شروع میں جناب مالک رام صاحب کا لکھا ہوا تعارف اور جناب نثار احمد ناردقی کا مقدمہ بھی شامل ہے۔

سائز متوسط ۲۶ × ۲۰ صفحہات ۲۴۱ قیمت ۱۵/- جلد ۱۵/

صلنے کا پتہ

مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد دہلی



ستمبر ۱۹۸۱ء

مصنفین دہلی کا علمی و دینی مآبنا  
ندوة اہلین دہلی کا علمی و دینی مآبنا

سُبرکاکُن

قیمت سالانہ : بیس روپے

مراتب  
سعید احمد کسرا بادی

# برہان

جلد نمبر ۸	ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۱ء	شمارہ نمبر ۳
------------	--------------------------------	--------------

## نظرات مقالات

- ۱۔ خلافت ارض اور علماء کی ذمہ داریاں
- ۲۔ دور جدید میں اسلامی قانون (فقہ)
- ۳۔ اردو شاعری میں فلسفہ وحدت الوجود
- ۴۔ دورہ انگلستان کے تاثرات
- ۵۔ جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب  
ہندوی۔ ناظم فرقانیہ الہیہ۔ بنگلور۔
- ۲۸۔ از: پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی
- ۳۱۔ ڈاکٹر عنوان چشتی، شعبہ اردو۔ جامعہ ملیہ  
اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵۔
- ۵۸۔ آئمۃ الرحمن صاحب محسنی۔ علی گڑھ

# نظرات

برادر عزیز مولانا سعید احمد پھلے دنوں ساؤتھ افریقہ تشریف لے گئے تھے رطہ شدہ پروگرام کے مطابق اپنی نواسی کی شادی میں شرکت کی غرض سے ان کو ۱۳ اگست کو کراچی پہنچنا تھا اور وہاں سے ہندوستان واپسی تھی لیکن افریقہ کے قیام کا پروگرام انماز سے زیادہ طویل ہو گیا، تازہ اطلاع کے مطابق ان کی واپسی ۱۸ ستمبر تک ہوگی، خیال تھا ستمبر کے برہان کے ”نظرات“ موصوف ڈربن ہی سے بھیجیں گے اور ان کی کتابت وقت پر ہو جائے گی، مگر ابھی تک مسودہ نہیں پہنچا اور اب اس کی توقع بھی نہیں ہے، اس خلا کو دو خطوں سے پر کیا جا رہا ہے جو مولانا نے میرے نام ڈربن سے بھیجے ہیں۔

مکتوب نمبر (۱) محترم داعی بھائی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

میں نے بمبئی سے جو خط بھیجا تھا۔ ملا ہوگا، میں یہاں ڈربن پر سوں ۲۸ کو ۱۲ بجے پہنچا۔ حالانکہ اصل پروگرام کے مطابق مجھے ۲۶ کی شام کو ڈربن پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ بمبئی میں جہاز ۱۴ گھنٹے لیٹ ہو گیا۔ اس کی وجہ سے بمبئی سے آگے کا اصل پروگرام بھی درہم درہم ہو گیا۔ مگر خیر الحمد للہ کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ کیونکہ بمبئی کی طرح ماریشس میں دن بھر — میں ایک شب قیام کرنا پڑا تو اس کا انتظام کمپنی نے ہی اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں کیا تھا جن میں کافی آرام ملا اور چونکہ میں تو ان چیزوں کا شوقین ہی ہوں اس لیے



الطف بھی آیا، پرموں ۲۸ کروڑ میں ڈربن سپینچا تو موسیٰ ایر پورٹ پر مع اپنی پوری فیملی کے موجود  
 تھے، اس سے پہلے تین چار مرتبہ ادرا ایر پورٹ پر آ چکے تھے اور جب میں نہیں آیا تو سخت پریشان  
 تھے، ادھر ادھر ٹیلیگرام بھی بھیجے مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اس سے ان کی پریشانی اور بڑھ گئی  
 تھی۔ یہاں موسیٰ پارک سے معلوم ہوا کہ وہ ۵ جولائی سے میرے منتظر تھے، معلوم نہیں مولانا  
 محمد علی صاحب نے مجھ کو یہ کیسے لکھ دیا تھا کہ موسیٰ پارک نے پروگرام منسوخ کر دیا ہے اور  
 شش کے روپے واپس منگوائے ہیں، موسیٰ کہتے ہیں میرے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں امد میں تو ۵  
 جولائی سے انتظار کر رہا ہوں، اس سے اندازہ ہوا کہ یا تو ایر پورٹ یا والوں نے جھوٹ کہا اند یا مولانا  
 محمد علی صاحب ان کی پوری بات نہیں سمجھ سکے: خیر ہر حال اب میں بہت آرام سے ہوں، موسیٰ پارک  
 ایک پہاڑی پر نہایت خوبصورت اور وسیع دو منزلہ کوٹھی بنوائی ہے، میں اس کوٹھی کی بالائی  
 منزل میں مقیم ہوں، فضا نہایت حسین اور موسم ہمارے ہاں کے نومبر دسمبر کا سا۔ ہر شے بیک وقت صاف  
 صاف، گرد و غبار کبھی مجھ پر دھواں اور گندگی کہیں نام کو نہیں، غذائیں نہایت اعلیٰ، خالص  
 لذت آ رہے، موسیٰ پارک سادہ پانی نہیں پیتے۔ ایک بوتل میں پچیس روپیہ کو معدنی پانی کی آتی  
 ہے وہی پانی پیتے ہیں اور خود مجھ کو بھی پلانے ہیں، بڑا عجیب و غریب پانی ہے، غرض کہ  
 شہ کے فضل و کرم سے ہر قسم کی راحت و آسائش ہے، موسیٰ پارک نے مجھ کو بلایا تھا صرف  
 کام کے لیے۔ مگر وہ آرام کہاں ملتا ہے، میری آمد کی خبر اخبارات میں چھپ گئی تھی۔ اس لیے  
 میرے آتے ہی مجھ پر پورش شروع ہو گئی اور انگریزی میں تقریروں کا پروگرام بن گیا۔ اس کے علاوہ  
 بڑے بڑے لوگ ملاقات کے لیے برابر آ رہے ہیں، رات میں نے تراویح مولانا عبدالرحمن انصاری  
 مسجد میں پڑھی، فارغ ہو کر باہر آیا تو مٹھا فحش کے ڈھیر لگ گئے، انصاری صاحب کو ابھی  
 سال میں ایک نہایت سخت حادثہ پیش آیا ہے، پہلے ان کو دل کا دورہ پڑا اور اسپتال میں رہے  
 ہاں سے رو بھرت ہو کر آئے تھے کہ ان کی دو جوان نواسیاں ایک کار کے حادثہ میں بیک وقت  
 ہلاک ہو گئیں، انصاری صاحب اور خصوصاً ان کی لڑکی اور داماد پر نہایت سخت اثر ہے، مجھ کو

معلوم ہوا تو میں فوراً تعزیت کو گیا۔

خدا کرے آپ بہم و جوہ بخیریت و عافیت ہوں۔ منی سلمہا کو دعا بردار و سچوں کو پیار۔  
قادری ادریس صاحب ہوں تو ان کو سلام کہہ دیجیے۔ سعید احمد اکبر آبادی۔

مکتوب نمبر (۲) محترم داعی بھائی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ کا ۲۲ اگست کا لکھا ہوا خط مجھ کو یہاں ۲۷ ستمبر کو یعنی پر سوں مل گیا۔ دارالعلوم دیوبند کا حال معلوم کر کے سخت صدمہ اور رنج ہوا۔ مولوی معراج الحق ہزار قابل ہی لیکن اس وقت ان کے مدیر بنانے کا ہرگز کوئی موقع نہ تھا اور آپ کی رائے کے مطابق اسے آئندہ کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے تھا اور اگر ابھی اس کا فیصلہ کرنا تھا تو میرے نزدیک مولوی محمد حسین بہاری زیادہ مستحق تھے۔ اسی طرح میں اس کا حامی نہیں ہوں کہ خارج شدہ سب طلباء کا اخراج واپس لے لیا گیا۔ افسوس ہے کہ میں وہاں نہیں تھا۔ ورنہ میں ایسا نہ کرنے دیتا۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور اس میں شک نہیں کہ بہت برا ہوا، اب دیکھیے کیا ہوتا ہے، خدا رحم فرمائے، صورتِ حال بڑی نازک اور خطرناک نظر آتی ہے، اعاذنا اللہ منہ۔  
میرا ارادہ ۸ ستمبر کو یہاں سے روانہ ہونے کا تعلق تھا۔ لیکن جانیسبرگ اور کیپ ٹاؤن کے لوگوں کا شدید تقاضا آگیا اور موسیٰ پارک کو بہانہ مل گیا اس لیے انھوں نے اصرار کر کے روک لیا۔ کیا کہوں موسیٰ پارک اور ان کا پورا گھر مجھ کو زیادہ سے زیادہ راحت و آسائش پہنچانے کے لیے کیا کیا کر رہے ہیں۔ یہ سب اللہ کا فضل و کرم بے حساب ہے، موسیٰ پارک اپنے کاموں کا ہرج کر کے دو دو سو چار چار سو میل مجھ کو سیر کرانے لے جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہیں ہے جو ان کے ساتھ نہ ہو میں نے ان کو آپ کا سلام پہنچا دیا ہے، سلام کہتے ہیں، بڑے بڑے عالیشان ڈنر، لنچ اور پارٹیوں کا سلسلہ ہے جو ختم ہونے میں نہیں ہوتا۔ علی گڑھ سے اب تک کوئی خط نہیں آیا سخت فکر اور پریشانی ہے۔  
آپ فرحانہ کو خط لکھ کر معلوم کر لیں اسے کچھ روپیہ کی ضرورت ہو تو بھیج دیں، میں آتے ہی ادا کر دوں گا۔

# خلافت ارض اور علماء کی فہم داریاں

## عصر جدید کا ایک اہم تجدیدی کام اور اس کی نوعیت

از مولوی شہاب الدین صاحب ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی نیکٹورہ ۷۷

(۱)

اسلام کی روشن فکری :

ساتویں صدی عیسوی فکر انسانی کی تاریخ میں ایک عظیم اور انقلابی صدی تھی جب کہ اسلام نے سب سے پہلے نوع انسانی کو نظام کائنات میں غور و فکر کرنے اور تجربے و مشاہدے کے ذریعہ صحیح نتائج اخذ کرنے کی انوکھی دعوت دی۔ یہ انوکھی اور انقلابی دعوت فکر اگرچہ بنیادی طور پر دجہ باری کے اثبات اور نظام ربوبیت کی تنقیح و توجیہ کے طور پر تھی مگر اس کے عقلی اور لازمی نتیجے کے طور پر اس سے جہاں ایک طرف علوم فطرت کا ارتقاء ہوا تو دوسری طرف تمدن اور اس کے مظاہر بھی ترقی کرنے لگے۔ چنانچہ قرآنی منشاء کے مطابق مسلمان بہت جلد اور حیرت انگیز طور پر صرف ایک دو صدیوں میں دنیا کے قدیم علمی سرزمین پر قابض ہو کر اس کو اپنی تہذیب اور ثقافت سے ہم آہنگ کیا اور ایک بالکل نئی ثقافت کی بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں کی علم نوازی اور جدید تحقیقات میں انہماک کا سب سے زیادہ روشن پہلو یہ تھا کہ خالص مذہبی حلقوں میں فلسفہ و کلام کے برعکس سائنسی تحقیقات کو کبھی مذہب کے مقابل نہیں سمجھا گیا بلکہ وہ

سے سائنسی علوم و فنون کو ترقی دینے سے متعلق اسلام کا اصل منشاء یہ تھا کہ ان علوم کی ترقی کے باعث کائنات کے وہ حقائق اور راز ہائے سرستہ پوری وضاحت کے ساتھ کھل کر سامنے آجائیں جن کے باعث اسلام کے بنیادی عقائد و تعلیمات کی تصدیق و تائید ہو سکے اور منکرین و معاندین کو دینی حقائق سے انکار کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔

۱۔ ملاحظہ ہو ابوالکلام، از علامہ شبلی نعمانی، ص ۱۱ مطبوعہ لکھنؤ، ۱۳۴۰ھ۔



ہمیشہ مذہب اور سائنس دونوں کو برابر نبھاتے رہے۔

**متکلمین اسلام اور اہل کلیسا:**

اسلامی دنیا میں یہ صورت حال صدیوں تک اسی طرح برقرار رہی۔ ایک طرف حکماء اور سائنس دان تھے جو نئی نئی تحقیقات و ایجادات و اکتشافات میں منہمک رہے تو دوسری طرف علمائے اسلام کا ایک خاص گروہ تھا جو اس دور کے ”جدید علوم“ کے تعلق سے پیدا ہوتے والے علمی و فکری مسائل کو سلجھانے اور علمی دنیا کی رہنمائی کرنے میں لگا رہا۔ چنانچہ گروہِ ادل میں جابر بن حیان، ابو نصر الفارابی، ائکندی، ثابت بن قرہ، ابراہیم بن سنان، حنین بن اسحاق اور ابن البیطار وغیرہ نظر آتے ہیں تو دوسری طرف گروہ ثانی میں امام ابو الحسن اشعری، امام ابو منصور ماتریدی، امام غزالی، امام رازی، امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیمؒ وغیرہ بھی دکھائی دیتے ہیں۔

ان ائمہ کرام نے اپنے دور میں دین اسلام کی ابدیت پر اثر انداز ہونے والے مسائل کی تنقیح کرتے ہوئے عقل و نقل کے حدود متعین کیے اور کلامی نقطہ نظر سے اسلام کا دفاع کر کے اعتقادی فتنوں اور گمراہیوں کا استیصال کر دیا۔ جو ان کا ایک تجدیدی کارنامہ تھا۔ غرض اسلام کے آغاز کے ساتھ ہی دنیا نے پہلی مرتبہ ایک آزادانہ طرز تحقیق اور ایک نئے فکری انقلاب کا نظارہ کیا جس کی مثال ہمیں سابقہ ادوار میں نہیں ملتی۔ مگر بد قسمتی سے مسلم حکومتوں کے زوال کے بعد یہ صورت حال برقرار نہ رہ سکی، بلکہ چودھویں اور پندرھویں صدی کے بعد جب کہ مغربی قومیں اسلامی اثرات سے بیدار ہوئے لگیں اور ان میں علمی تحقیق کا ذوق پیدا ہونے لگا تو ایک دوسرا تماشہ رونما ہوا۔ عیسائی مذہب اور کلیسا کے پیشواؤں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر مذہب اور سائنس کے بنیادی فرق کو نظر انداز کر کے ان دونوں کو یکساں درجہ دے دیا۔ یعنی مذہب کے اصول جس طرح ناقابلِ تغیر ہوتے ہیں اسی طرح کائنات سے متعلق بعض نظریات کو۔ جو اسطرح کے فلسفے اور منطق سے ماخوذ تھے۔

مذہب میں داخل کر کے انھیں مذہب کا جزو اور غیر متبدل قرار دے دیا جس کے باعث خوفناک نتائج برآمد ہوئے اور اہل علم اور اہل کلیسا کے درمیان کش مکش کا ایک المناک اور خونی سلسلہ چل پڑا جو بالآخر مذہب سے مکمل علیحدگی پر منتهی ہوا۔ اس طویل اور صدمہ سال کی کشمکش کے نتیجے میں موجودہ اتحاد و مادیت اور خدا بیزار تہذیب نے جنم لیا جو درحقیقت کلیسا کی ناقبت اندیشیوں کا براہ راست اور لازمی نتیجہ تھا۔

اسلام نے ساتویں صدی عیسوی اور اس کے بعد شریعت اور فطرت کو دوبارہ بہتر کی طرح اکٹھا کرنے اور ان دونوں کو باہم گلے ملانے کا جو بے مثال کارنامہ انجام دیا تھا اس کو یورپ کے نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے دور میں کلیسا کی خود غرضانہ اور دنیا پرستانہ ذہنیت نے بالکل برباد کر دیا اور مذہب کی ترقی کی راہ میں زبردست مشکلات کھڑی کر دیں بلکہ مذہب کی ترقی بالکل مسدود کر دی گئی۔ پھر بڑی مشکل سے اس کو ایک پرسنل معاملہ قرار دے کر اجتماعی زندگی سے بالکل بے دخل کر دیا گیا۔

کلیسا اور سائنس کے درمیان چپقلش کا یہ سلسلہ پندرھویں صدی سے شروع ہوا۔ جو بعد کی صدیوں میں بڑھتے بڑھتے نہایت درجہ شدید ہو گیا۔ لاکھوں بے گناہوں کی گردنیں ماری گئیں اور انھیں آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں مذہب بیزاری کا ایک ہم گیر رد عمل شروع ہو گیا۔ مظاہر فطرت اور قوانین فطرت کی توجیہ اب اس طرح کی جانے لگی کہ کہیں بھی خدا کا وجود یا مذہبی اصولوں کا دخل تسلیم کرنا نہ پڑے۔ یہ نئے یہاں تک بڑھی کہ باقاعدہ اور منظم طور پر انسان اور کائنات کے تعلق سے نئے نئے ملحدانہ اور مادہ پرستانہ فلسفے تراشے جانے لگے اور دین و اخلاق کو ایک ڈھکوسلہ اور کلیسا کی عیاری قرار دیتے ہوئے مذہب کا جوا پوری طرح اپنے کندھوں سے اتار پھینکا گیا۔ مذہب دشمنی کی اس پیٹ میں سارے مذاہب آگئے اور کسی کو بھی نہیں بخشا گیا۔ گویا یوں سمجھ لیا گیا کہ تمام مذاہب ایک ہی بھتیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

## یونانی عقلیات اور جدید سائنس و فلسفہ :

یہ تو عیسائی مذہب اور کلیسا کا حال تھا مگر افسوس کہ جدید علوم و فنون کے تعلق سے اہل اسلام کا موجودہ رویہ بھی اہل کلیسا سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے یعنی وہی اسطو اور اس کے متبعین کے نظریات کو جو منطق و فلسفے کی شکل میں موجود ہیں۔ دین کے برابر کا درجہ دے کر ایک متوازی دین بنادیا اور جدید علوم سے بالکل بے گانہ ہو گئے۔ پھر جدید علوم سے بیگانگی کی بدولت ان علوم کے تعلق سے اہل ان کی ترویج و اشاعت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے علمی، فکری، معاشرتی اور تمدنی مسائل و مشکلات سے بھی بے گانگی عمل میں آئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام بھی ماضی کی نشانی اور فرسودگی کی علامت سمجھا جانے لگا۔ گویا یوں سمجھ لیا گیا کہ اسلام اور مسلمانوں سے ان علوم و مسائل کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے حالانکہ اسلام ایک زندہ اور ابدی مذہب ہے اور ہر دور میں زندگی کے تمام مسائل حل کر سکتا ہے۔ کوتاہی جو کچھ بھی ہے وہ ہماری اپنی ہے، اسلام کی نہیں۔

یہ تاریخ کا ایک عجوبہ اور حیرت انگیز امر ہے کہ علمائے اسلام نے بڑی رد و کد کے بعد یونانی عقلیات (منطق و فلسفے) کو اپنا کر اس کو گلے تو لگالیا (جو امام غزالی کی کوششوں کا نتیجہ تھا) مگر سائنس اور جدید علوم سے دور رہے، حالانکہ قرآن حکیم، یونانی فلسفہ کی یہ نسبت موجودہ سائنس اور جدید علوم سے زیادہ قریب ہے، چنانچہ وہ اپنے بیان کردہ عقائد و تعلیمات کی صداقت و حقانیت کے ثبوت کے لیے جگہ جگہ مظاہر کائنات اور ان کے نظاموں سے استدلال کرتا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ تمام سائنسی علوم، مظاہر کائنات اور ان کے نظاموں ہی کی تفصیلات کا نام ہے۔

اس لحاظ سے ضرورت ہے کہ آج ہمارے دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کی جائے اور منطق و فلسفے کی کتابوں کو کم سے کم اور محدود کر کے سائنسی علوم کو رائج

لہ تفصیل کے لیے دیکھیے علم الکلام، از علامہ شبلی نعمانی، ص ۶۵، مطبوعہ آگرہ۔



کیا جائے۔ آج زمانہ فلسفہ کا نہیں بلکہ سائنس کا ہے۔ اور جدید فلسفہ تو سائنسی تحقیقات کو بنیاد بنا کر گفتگو کرتا ہے، قدیم فلسفے کی طرح اس سے چشم پوشی کر کے نہیں، چنانچہ تاریخ فلسفہ کا مصنف ویب لکھتا ہے:

”جن لوگوں کو ہم فلسفہ یورپ کا بانی کہتے ہیں ان کا حقیقی کارنامہ صرف اس قدر ہے کہ انھوں نے کہانیاں کہنا چھوڑ دیا اور (جب کچھ نہ تھا تو) کیا تھا بیان کرنے کا بے سود و لا حاصل کام چھوڑ کر اس کے بجائے خود سے یہ سوال کرنا شروع کیا کہ اس وقت جو دنیا میں چیزیں نظر آتی ہیں یہ درحقیقت کیا ہیں؟“

قدیم فلسفہ بالکل ازکار رفتہ ہو چکا ہے۔ اگر اس کی ضرورت ہے تو صرف اتنی کہ ہمارے قدیم اسلامی لٹریچر سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ اور اس کے لیے منطق و فلسفے کی اصطلاحات کا جان لینا کافی ہوگا۔

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ یونانی منطق و فلسفہ اسلامی علوم نہیں ہیں جن کو دانشوروں سے پکڑا جائے، بلکہ دراصل یہ علوم اسلام ہی کے دفاع کے لیے زمانہ قدیم میں داخل نصاب کیے گئے تھے۔ ان کی ضرورت اس وقت پیش آئی تھی جب کہ ان کا لٹوٹی بدل رہا تھا۔ مگر آج ان عقلی علوم کی جگہ پراسنسی علوم کا بول بالا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان عقلی علوم کو نظر انداز کر کے جدید علوم سے اپنا رشتہ استوار نہ کیا جائے، جب کہ یہ بات دینی، عقلی اور خود منطقی ہر حیثیت سے صحیح ہے۔ منطق کا مقصد ہی یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ ہمیں خطائے فکری سے بچاتی ہے۔ لہذا منطق اعتبار ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ جدید علوم و فنون کو اپنایا جائے جو عصر جدید میں زندگی کی علامت اور زندہ قوموں کا نشان قرار پا چکے ہیں اور کوئی قوم انھیں نظر انداز کر کے اپنا وجود ہی برقرار نہیں رکھ سکتی، جیسا کہ پچھلے ابواب میں ثابت کیا جا چکا ہے۔ لہذا ایسی منطق بھلا کس کام کی جو ہمیں بھلے اور برے میں تمیز کرنے سے بچی عاجز کر دے۔

لئے تاریخ فلسفہ، مترجم مولوی احسان احمد، ص ۳، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء۔

منظر ۔۔۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا۔ بقدر ضرورت کافی ہیں۔ ان میں اتنے  
فوض نہ کیا جائے کہ دوسرے ضروری علوم کا حق مارا جائے بلکہ ان اذکار رفتہ علوم کو سینے سے  
لگائے رکھنے میں سوائے دماغ کھپانے اور حیرانی اور سرگردانی کے نہ کوئی عقلی فوہی ہے اور نہ  
دین کی کوئی واقعی خدمت پھر ایسی صورت میں جب کہ منطق و فلسفے کی عملی اعتبار سے کوئی قدر  
و قیمت باقی نہیں رہی

قدیم فلسفے کے برعکس جدید فلسفہ البتہ اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس کے  
مابعد الطبعی مسائل جدید سائنسی نظریات پر قائم ہیں۔ اور سائنسی نظریات کے تغیر و تبدل کی  
بنیاد پر اس کے مسائل میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ جبکہ قدیم فلسفہ ہر حیثیت سے جامد  
ہے۔ بلکہ ماتم الا حجام، فلکیات اور عنصریات سے متعلق اس کے اکثر و بیشتر مسائل و مباحث  
مجموعہ غلطیوں جو محض ظن و تخمین اور دھم و خیال پر مبنی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نظریہ تجربہ مشاہدے کی  
کسوٹی پر پورا اتر نہیں سکتا، بلکہ خلاف مشاہدہ اور خلاف حقیقت ثابت ہوتا ہے۔ فکر یونان کی دنیا محض تخیلات  
و مفروضات پر مبنی ہے جس میں عقل کو تو خوب مصروف رکھا جاتا ہے مگر ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ لہذا جس قدر جلد ہو سکے  
ان بے فائدہ علوم سے بچنا چھڑا لینا ہی بہتر ہے۔

دنیا نے اسلام کا عقلی ارتقا دوسری صدی ہجری یا آٹھویں صدی مسیحی سے شروع ہوا جس کے نتیجے میں  
نئے نئے فکری و اعتقادی مسائل اور فلسفیانہ بحثیں پیدا ہوئیں اور فلاسفہ و متکلمین اسلام کے درمیان طویل  
نظریاتی کشمکش، مناظرے اور علمی معرکے آرائیاں برپا ہوئیں مگر دنیا نے حیرت سے دیکھا کہ وہی علوم جن کو  
فقہاء اور محدثین علوم باطل، اور علوم کفریہ قرار دیتے ہوئے صدیوں تک ان کا مقابلہ کرتے رہے

اب بکثرت زیادہ بہتر ہے کہ ہمارے مدارس میں موجودہ یونیورسٹیوں کے طرز تعلیم کے مطابق بعض علوم کو لازمی اور  
بعض علوم کو اختیاری رکھا جائے یعنی بنیادی اور ضروری مسائل کی لازمی تعلیم کے بعد بعض فنون کو  
اختیاری رکھا جائے کہ بعد میں جس کا دل چاہے وہ اپنے پسندیدہ علوم میں تکمیل کر سکے۔

۱۰ یہ قدیم طبیعیات کی تین شاخیں ہیں۔

بالآخر امام غزالی کی کوششوں و کاوشوں کی بدولت پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ان علوم سے اس حد تک بکھوٹا اور مصالحت کر لی گئی کہ تمام اسلامی مدرسوں میں ان کو داخل کر کے ہی چھوڑا گیا اور انہیں اس طرح "اسلامیال" کیا کہ ان کا شمار بھی "اسلامی علوم و فنون" میں ہونے لگا اور ان سے اس قدر محبت ہو گئی کہ اب ان سے جدائی بالکل شاق گزر رہی ہے۔ مگر جس بنیادی ضرورت کی خاطر یہ علوم قرون وسطیٰ میں داخل نصاب کیے گئے تھے اسی بنیادی ضرورت کے تحت آج یہ خارج نصاب کیے جانے کے قابل ہیں۔ ہر دور کا ایک عقلی مزاج ہوتا ہے جس کو ہر حال میں ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ لہذا دین برحق کی ابدیت و عالمگیری کے اثبات اور اس کے مادی غلبے و نفوق کے اظہار کا تقاضہ ہے کہ جدید علوم و فنون کو اپنایا جائے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ عقلی عدم دہیّت کے نصاب میں کلامی نقطہ نظر سے داخل کیے گئے تھے، جب کہ دین اسلام کو ان علوم کی طرف سے زبردست چیلنج درپیش تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ان علوم سے آراستہ ہو کر علمائے دین کلامی نقطہ نظر سے دین متین ہدفات کریں۔ اب چونکہ ان علوم عقلیہ کی اہمیت بنی باقی نہیں رہی اور ان کا ردائ اور چیلن بالکل ختم ہو گیا تو پھر ان علوم سے چمٹے رہنا بالکل غیر معقول اور غیر فطری بات ہو گئی۔ اس کے برعکس آج چونکہ علوم جدیدہ کا چیلنج درپیش ہے اس لیے ضروری ہے کہ موجودہ صورت حال کو بدلتے ہوئے نئے ہتھیاروں سے اپنے آپ کو مسلح کیا جائے تاکہ عصر جدید میں دین برحق کا دفاع صحیح اور بہت سے کیا جاسکے۔

### قرآن اور جدید علم کلام :

اس لحاظ سے آج ایک نئے علم کلام کی بنیاد رکھنے اور جدید علم کلام کو مدون کرنے کی ضرورت ہے۔ جو قدیم علم کلام کے برعکس، تمام تر قرآن حکیم سے ماخوذ ہوگا۔ قرآن حکیم بن وہ ابدی و سرمدی صحیفہ خداوندی ہے جس میں اس کے پیروں کو جدید علم کلام کے تمام انمول تفصیل کے ساتھ سمجھائے گئے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ فکری و نظریاتی اعتبار سے گمراہ قوموں اور گمراہ نفسوں کا رد و ابطال کیا جاسکے۔ قیامت تک وقوع



میں آنے والی جتنی بھی فکری و نظریاتی گمراہیاں، غلط عقیدے اور بھل فلسفے وجود میں آسکتے ہیں ان سب پر ایک عجیب و غریب اور اعجازی انداز میں قدغن لگائی گئی ہے اور ایک ایک فکری لغزش کا حال کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں غور و فکر اور تفکر و تدبیر کی تاکید کی گئی ہے۔

مگر یہ فائدہ صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ ہم نہ صرف سائنسی علوم کو زیر بحث لائیں بلکہ موجودہ گمراہ قوموں اور ان کے غلط نظریات اور فلسفوں کا بھی جائزہ لیں۔ یہ کلامی نقطہ نظر سے سائنسی علوم دراصل ہمارے اور دیگر قوموں کے درمیان افہام و تفہیم کے لیے ”اصول موضوعہ“ کا کام دیتے ہیں، جو اپنے غیر جانبدارانہ رویہ کی وجہ سے علم انسانی کا ایک قیمتی سراہ ہیں۔ علم مناظرہ کا یہ اصول ہے کہ طرفین کے درمیان گفتگو کیے کوئی بنیاد ہونی چاہیے، جو دونوں کے درمیان تسلیم شدہ ہو۔ ان بنیادی اور مسلم باتوں کو اصولی موضوعہ یا اصول متعارفہ کہا جاتا ہے۔

اسی طرح سائنسی علوم ”علم اسرار“ اور اس کے دریافت شدہ قوانین فطرت و جو دراصل نظام ربوبیت ہی کی تفصیلات ہیں، آٹ ہمارے اور گمراہ قوموں اور فرقوں کے ملے جدید فلاسفہ اور ملحدین کے افکار و آراء جو مختلف خود ساختہ نظاموں اور ”ازموں“ کی شکل میں نوع انسانی کو ”تھکیاں اور لوریاں“ دے دے کر سلا رہے ہیں۔

مثلاً مشہور جرمن مسلم محمد اسد ”اسلام دورا ہے پر“ میں تحریر کرتے ہیں: ”علم جیلے خود نہ مغرب کا ہے نہ مشرق کا۔ وہ ایسا ہی عالمگیر ہے جیسے کہ حقائق عالمگیر ہیں۔ لیکن جس نقطہ نظر سے علم کو دیکھا جاتا ہے اور پیش کیا جاتا ہے اس کا انداز ہر قوم کی ذہنی فطرت کی مناسبت سے مختلف ہے۔ حیاتیات یا طبیعیات یا نباتیات من حیثہ نہ مادہ پرستانہ ہیں اور مذہد حانی ان کا تعلق حقائق کے مشاہدہ کرنے، جمع کرنے اور منتشر کر کے ہے۔“

(مترجمہ رحم علی ہاشمی، ص ۶۴، دہلی، ۱۹۷۸ء)



ان آیات کریمہ میں اونٹوں کا نام صرف اہل عرب کی رعایت سے لایا گیا ہے۔ اصل میں یہاں پر اونٹوں کا تذکرہ جس انداز میں کیا گیا ہے اور جس اسلوب میں ان کی ساخت و پرداخت پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے اس سے خود بخود دیگر حیوانات کے تقابلی مطالعہ کا بھی اشارہ نکلتا ہے جو علم حیوانات (زواجی) کی اصل بنیاد ہے "سما" کے تحت تمام اجرام سماوی یعنی فسیات کا مطالعہ آ جاتا ہے۔ جبال اور ارض کی ہیئت ترکیبی سے واقفیت کے لیے پورے طبیعی جغرافیہ (Physical Geography) کا مطالعہ ضروری قرار پاتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ان علوم سے کما حقہ واقفیت کے بغیر نہ تو ان آیات کریمہ کی صحیح تفسیر ہو سکتی ہے اور نہ نوع انسانی پر اتمام حجت جو "قَدْ كُودِ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ" انہیں یاد دلادو تم تو صرف یاد دلانے والے ہی ہو یعنی تمہارا منصب صرف تذکیر و یاد دہانی اور تنبیہ و انتباہ ہے، کے مطابق اہل اسلام پر عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ خطاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے پوری امت محمدیہ سے ہے جو قیامت تک تمام اقدار پر حاوی رہے گا کہ وہ اپنے دور کے طبیعی علوم اور معلومات کا جائزہ لے کر اس سلسلے کے آفاقی یا سائنٹیفک دلائل کی تدوین کریں تاکہ وہ منکرین و معاندین کی رہنمائی یا ان پر اتمام حجت کا باعث بن سکیں۔

یہاں پر نمونے کے طور پر محض انہیں دو آیات کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ورنہ قرآن حکیم اس قسم کی آیتوں سے بھرا ہوا ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ عصر جدید کی بے انتہا ترقی کے باعث تمام علوم و فنون پوری طرح مدون ہو کر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ اگر اب بھی ہم قرآنی مقصد و منشاء کے مطابق ان علوم سے فائدہ اٹھا کر دین حق کی برتری ثابت نہ کریں تو اس سے بڑھ کر محرومی اور کیا ہو سکتی ہے! ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ تمام جدید علوم و فنون کا جائزہ



لے کر قرآن عظیم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نوع انسانی کی رہنمائی یا اس پر اتمام حجت کر دیں۔ یہی جدید علم کلام یا قرآنی علم کلام ہو گا۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ ط (لوگوں کو) اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ، دانش مندی اور اچھی موعظت کے ساتھ اور ان سے بہترین طریقہ سے مباحثہ کرو۔ (سجہ : ۱۲۵)

دلائل آفاق اور قوانین ربوبیت :

اس موقع پر ایک بہت بڑی اور ایک بنیادی غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ وہ

یہ کہ عام طور پر مذہبی حلقوں میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ موجودہ سائنسی علوم محض چند بدلتے ہوئے نظریات یا ”انکار پریشان“ کا نام ہے جن کی بنیاد پر کتاب اللہ کی تفسیر کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور احتیاط کا تقاضہ ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر میں اس قسم کے علوم کو داخل نہ کیا جائے مبادا کہ آگے چل کر یہ نظریات بدل جائیں اور کتاب اللہ کی ابدیت پر کوئی حرف آجائے !

یہ خیال بادی النظر میں تو بہت معقول اور وزنی معلوم ہوتا ہے مگر دراصل یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے جس کو کیا عالم اور کیا عامی ہر ایک — اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے بغیر — محض قلت فکر کی بنا پر اور بے سوچے سمجھے دہرائے چلا جا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ بذات خود بہت بڑی دانش مندی کا ثبوت دے رہا ہے۔ حالانکہ یہ طرز فکر دراصل حقائق سے چشم پوشی اور سہل انکار کا گونا گونا گونا ہے۔ قرآن حکیم میں نظام کائنات سے متعلق تقریباً ساڑھے سات سو آیات موجود ہیں یہ جن کا بنیادی مقصد انسان، خدا اور کائنات کے باہمی تعلقات کو واضح کرنا اور اس سلسلے میں منکرین و معاندین اور خدا بیزار لوگوں کے غلط اور بے بنیاد نظریات و مفروضات

کی اصلاح کرتا ہے۔ اس لیے جگہ جگہ منطائیات اور ان کے حیرت انگیز نظاموں میں غور و فکر کر کے منکرینِ خدا کے خلاف سائنٹفک دلائل و شواہد کا مستنباط کرنے کی تاکید کی گئی ہے، جن کو قرآن کی زبان میں دلائلِ آفاقی (جو انسان کے چاروں طرف مختلف مظاہر کے روپ میں پھیلے ہوئے ہیں) اور دلائلِ انفسی (جو انسان کے اپنے جسمانی و نفسیاتی احوال سے متعلق) کا نام دیا گیا ہے ان دلائل و بینات یا آفاقی و انفسی شواہد سے عبرت و بصیرت حاصل نہ کرنے والوں کو بہائم اور چوپایوں سے تشبیہ دی گئی ہے جیسا کہ تفصیلات پچھلے ابواب میں گذر چکیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آفاقی و انفسی دلائل و شواہد کا یہ استنباط کس کے ذمہ ہے؟ قرآن حکیم کے بنیادی مقصد اور اس کی روح کے مطابق منکرینِ حق پر یہ اتمامِ حجت کون کرے گا؟ اقوامِ عالم کی فکری و نظریاتی گمراہیاں کیسے دور ہو سکیں گی؟ کیا قرآن حکیم کا پیغام پورے عالمِ انسانی کو پہنچانا ضروری نہیں ہے؟ کیا اس کا پیغام قیامت تک تمام ادوار اور تمام خطہ ہائے ارض کے لیے عام نہیں ہے۔؟ کیا اس کے ابدی دلائل و براہین جدید ذہن و فکر کو مطمئن نہیں کر سکتے؟ بالفاظِ دیگر قرآن حکیم کے دلائلِ آفاقی و عوام کے لیے ہیں یا خاصانِ علم کے لیے بھی؟ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ان دلائل و شواہد کا استنباط جدید علوم و فنون کی مدد کیے بغیر ممکن بھی ہو سکتا ہے؟ نیز کیا موجودہ علوم و فنون سے مدد لیے بغیر ہم موجودہ ابوابِ فن پر اتمامِ حجت کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ جب تک علوم و فنون کی گہرائیوں میں غوطہ زنی نہ کی جائے، جدید ذہن و دماغ کی تسلی و تشفی کا سامان فراہم نہیں ہو سکتا اور موجودہ استدلال اور عقل پرست ذہن کو مطمئن کر کے ان کے قلوب کو بدلانا نہیں جاسکتا۔ اور جب تک یہ فکری معرکہ سر نہ کر لیا جائے

لہٰذا اسی طرح خود قرآن حکیم کی گہرائیوں میں ڈوب جانے کی ضرورت ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم میں جتنی گہری نظر ڈالیے اس کے اسرار اتنے کھلتے نظر آئیں گے۔

عملی حیثیت سے کوئی صالح انقلاب برپا نہیں کیا جاسکے گا۔ کیونکہ کوئی بھی ہمہ گیر فکری انقلاب اس وقت تک برپا نہیں جاسکتا جب تک کہ ارباب دانش اور اہل فن کو علمی و استدلالی حیثیت سے زیر نہ کر لیا جائے اور وہ ”حق“ کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دیں۔ ظاہر ہے کہ دانشور طبقے کا اپنے اپنے حلقوں میں عوامی ذہن و فکر پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ لہذا دانشور طبقے کو زیر کر لینا گویا کہ علمی حیثیت سے میدان سر کر لینا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم کو جدید سے جدید تر ہر قسم کے ”ہتھیاروں“ سے پوری طرح مسلح کر دیا گیا ہے تاکہ اہل اسلام ہر دور میں حسب ضرورت ان سے کام لیں اور صحیح سوچ و جدوجہد کا مظاہرہ کریں۔ مگر جب ہمارے ”اسلحہ خانے“ میں ہر قسم کے جدید ترین ہتھیار موجود ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ موجودہ راکٹوں اور مزامیلوں کا مقابلہ تیروں امداد تلواروں سے کرنا عقل و دانائی سے بعید تر ہوگا۔

بنیادی سوال پھر بھی باقی رہ گیا۔ وہ یہ کہ سائنسی علوم و مسائل کی مبینہ ”تغیر پذیری“ کا حل کیا ہے؟ تو یہ کوئی ایسا مشکل اور پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے جس سے ہم اس قدر پریشان اور ہراساں ہو جائیں کہ محض ایک مفرد حقے کی بنیاد پر کتاب اللہ کی ساڑھے سات سو آیات کی تفسیر کرنا ”شجر ممنوعہ“ سمجھ کر چھوڑ دیں۔ اصل بات یہ ہے — جیسا کہ سائنسی علوم اور ان کے ایجادات و اکتشافات کی تاریخ شاہد ہے — کسی چیز کے متعلق انسانی علم ابتداءً محدود ہوتا ہے، پھر جیسے جیسے مشاہدات و تجربات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اس کے متعدد پہلو واضح اور تفصیلی معلومات حاصل ہوتے جاتے ہیں۔ مگر نکتے کی بات یہ ہے کہ نئے نئے اکتشافات کے باعث سابقہ معلومات کلیتہً یا یکسر باطل نہیں ہو جاتیں (خصوصاً جب کہ وہ نظریاتی امور سے متعلق نہ ہوں بلکہ ان کا تعلق تجرباتی و مشاہداتی امور سے ہو) بلکہ ان معلومات و مسائل کے چند نئے پہلو یا نئے اجزاء و عوامل اور ان کی کارکردگیوں کا مزید علم حاصل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تحقیق و تجربہ سے سب سے پہلے صرف چند



عناصر (Elements) کا علم ہوا۔ پھر مزید تجربے کے بعد چند مزید عناصر معلوم ہوئے، حتیٰ کہ ان کی تعداد ۹۲ تک جا پہنچی۔ شروع میں یہ خیال تھا کہ وہ ناقابل تقسیم ہیں مگر بعد میں مزید تجربات سے معلوم ہوا کہ ہر ایٹم دو یا تین درجن سے لے کر یورینیم تک تمام کے تمام (تمام) تین قسم کے اجزاء سے مرکب ہیں، جن کو الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران کا نام دیا گیا۔ پھر معلوم ہوا کہ پروٹان اور نیوٹران باہم ایک مرکزے کی شکل میں ملے ہوئے ہیں، اور الیکٹران ان کے گرد بڑی تیزی کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ ایٹم کے اس مرکزہ پروٹان اور نیوٹران کے مجموعے) کے متعلق ابتداً خیال تھا کہ وہ ناقابل تحلیل ہیں۔ مگر مختلف ترکیبوں کو آزمانے کے بعد بالآخر عمل فزیکس (ایٹم کے مرکزے کو توڑنے کا ایک بہت ہی پیچیدہ عمل) کے ذریعہ جب اس کو توڑا گیا تو اس سے ایک ایسی ہیستناک اور دیو پیکر تو انائی خارج ہوئی جو آج ایٹمی قوت یا جوہری توانائی کے نام سے مشہور ہے۔ ایٹم بم ایٹم کے مرکزے میں چھپی ہوئی اسی دل ہلا دینے والی قوت کا نام ہے۔

اب یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ نئے نئے عناصر کی دریافت کے باعث سابق میں دریافت شدہ عناصر کا وجود باطل نہیں ہو گیا۔ جس طرح کہ خود ایٹم کے اندرونی اجزاء کی دریافت سے ان عناصر کے وجود پر کوئی حرف نہیں آ سکا۔ پھر اسی طرح الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران کی کارکردگیوں اور ان کی تفصیلات کے منکشف ہونے کے باعث سابقہ معلومات و تفصیلات کسی بھی طرح باطل نہیں ہو گئیں، بلکہ صرف اتنا ہی کہا جائے گا کہ پہلے ان اجزاء و عناصر سے متعلق انسانی علم اجمالی اور مختصر تھا مگر بعد کی تحقیقات و تجربات کی

سہ یعنی قدرتی عناصر کی۔ اور اگر غیر قدرتی یا مصنوعی عناصر کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان کی

تعداد اس وقت ۱۱۵ تک جا پہنچتی ہے ملاحظہ ہو کتاب *Asimov's Guide to*

*Science* vol. 1, P. 234, Pelican Books, England, 1979.

*Fission.*

۷

وجہ سے وہ مفصل اور وسیع ہو گیا۔ اسی پر دوسرے تجرباتی علوم کو بھی قیاس کر لیجئے۔

اس سے یہ کلیہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ علم انسانی یا علوم سائنس کی وہ بنیادی معلومات کبھی نہیں بدلتیں جو تجربے و مشاہدے میں ایک بار پوری طرح ثابت ہو جائیں اور بار بار کے تجربوں سے ہمیشہ ان سے یکساں نتائج برآمد ہوتے ہوں۔ مثلاً ہائیڈروجن کے دو ایٹموں اور آکسیجن کے ایٹم کو کیمیائی طور پر ملاسنے سے پانی کا ایک سالمہ وجود میں آتا ہے۔ اور پانی کے سالمے کی کیمیائی تحلیل سے پھر وہی مفرد عناصر برآمد ہوتے ہیں۔ یہ ایک قانون قدرت (لا آف نیچر) یا قانون ربوبیت ہے جو آج بھی صحیح ہے اور آئندہ کبھی سرد در میں قیامت تک صحیح رہے گا۔ یہی حال دیگر قوانین قدرت یا ریاضیاتی ضوابط کا ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدْ رَكَعًا ثُمَّ نَبَّأُ ۝۵۱ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ایک (طبعی) ضابطہ مقرر کر دیا۔ (فرقان: ۲۰)

ایک سادہ سی مثال لیجئے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ آگ جلاتی ہے اور پانی آگ بجھاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں ایک لمحے کے لیے بھی ہمیں شک نہیں ہوتا۔ اس قسم کے حقائق کو قوانین قدرت کہا جاتا ہے اور اس قسم کے قوانین کا دائرہ بہت وسیع ہے جب کہ پیہم تجربات و مشاہدات سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً حیوانی زندگی کا انحصار آکسیجن پر ہے۔ کوئی جاندار پانی کے بغیر زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ تمام جاندار ایک حیاتیاتی مادے (پروٹوپلازم یا سٹروما) سے مرکب ہیں۔ پروٹوپلازم کا تقریباً ستر فیصد حصہ پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ کائنات کی تمام اشیاء متعدد عناصر سے مرکب ہیں۔ مثلاً آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن اور کاربن وغیرہ۔ غرض یہ پوری کائنات نہایت درجہ منضبط قوانین کے مجموعے کا نام ہے اور یہاں پر امتشاز بد نظمی اور لافانویت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُتُورٍ ؟ -

Law of Nature. ۵۱

سائنسی نظریات میں رد و بدل یا تبدیلی جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ ان ثابت شدہ طبیعی قوانین اور بنیادی اصولوں میں نہیں بلکہ ان مفروضات میں ہوتی ہے جو یا تو ابھی زیر مشاہدہ ہوں یا جن میں کسی رکاوٹ کے باعث سرے سے کوئی تجربہ و مشاہدہ ہی ممکن نہ ہو۔ اصل میں کوئی بھی سائنس داں اور کوئی بھی عالم طبیعیات مختلف اشیائے عالم میں ربط و تعلق اور ترجیح و تادیل کے لحاظ سے بعض نظریات و مفروضات قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے خواہ ان کے متعلق اس کو تفصیلی علم حاصل ہو یا نہ ہو۔ دنیائے سائنس میں تغیر و تبدل جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ عموماً اسی قسم کے نظریات و مفروضات میں ہوتا ہے۔ فلکیات (اس میں خصوصاً آغاز کائنات سے متعلق نظریات)، ارضیات (جیالوجی)، اور نظریہ ارتقاء وغیرہ کے اکثر مسائل و مباحث اسی باب سے متعلق ہیں۔ اس کے بالمقابل طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات (سوائے آغاز حیات اور روح اور اس کے مظاہر سے متعلق معمول کے اکثر مباحث تجرباتی و مشاہداتی ہونے کی بناء پر قابل استدلال ہیں)۔ ان علوم اور ان کے مباحث میں غور و فکر کرنے اور ان کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد انسان کے اندر اتنی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی بنیاد پر وہ خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اسے کن امور سے استدلال کرنا چاہیے۔

قرآن حکیم میں مختلف علوم و فنون کے حقائق یا فکری نتائج۔ جو اصل مغز ادب و ہر کی لہ اسی بنا پر قرآن حکیم تجربے و مشاہدے پر زور دیتا ہے۔ جیسا کہ تفصیلات پچھلے ابواب میں گزر چکیں۔ کہ کائنات کی تمام چیزوں کا نہایت درجہ باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تاکہ وہ تمام قوانین و رو بہت منکشف ہو جائیں جن کے باعث قرآن حکیم کے ابدی و سرمدی بیانات کا اثبات اور علم الہی کی قیامت کا پوری طرح نظارہ ہو جاتا ہو۔

اس موضوع پر میں نے اپنی ایک دوسری کتاب (دو جلد باری اور قیامت کے شواہد نیلے نباتات میں) میں تفصیلی بحث کی ہے اور قرآن اور کائنات کے حقائق میں تطبیق دینے کے لیے بہت سے اصول و کلیات وضع کر کے کی کوشش کی ہے جن کی حیثیت جدید تفسیری اصول و ضوابط



حیثیت رکھتے ہیں۔ بالکل معجزانہ انداز میں مذکور ہیں۔ موجودہ دور کی عقلیت کے مطابق ذہن سازی کے لیے مثبت اور بنیادی ردل ادا کر سکتے ہیں۔ ان حقائق کو سمجھنے کے لیے لازمی طور پر جدید سے جدید تر متعلقہ علوم کی جزئیات کو بھی زیر بحث لانا پڑے گا۔

جس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ مثلاً قرآن میں مذکور ہے کہ نباتات میں بھی قانون زوجیت پایا جاتا ہے۔ یعنی حیوانات کی طرح پیڑ پودوں میں بھی نر و مادہ پائے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو علی وجہ البصیرت سمجھنے اور متعلقہ مسائل کی تنقیح کے لیے حیاتیات (ریالوجی) کے

بہت سے مباحث بھی چھیڑنے پڑتے ہیں۔ اب ممکن ہے کہ بعض جزئیات میں جو نظری حیثیت رکھتے ہوں۔ آئندہ چیل کر کوئی تبدیلی واقع ہو جائے۔ مگر یہ حقیقت کہ تمام

نباتات زوج زوج ہوتے ہیں اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ یہی حال دیگر تمام حقائق و معارف کا بھی ہے۔ اب یہ کتنی بڑی نادانی ہوگی کہ ہم ایک موبہم سے خدشے کی بنا پر اس قسم کی آیات کی سائنٹفک نقطہ نظر سے تفسیر کرتا ہی چھوڑ دیں۔ گویا کہ قرآن مجید کے پانچویں ایک حصہ کو مہل قرار دے دیں۔ لے

العیاذ باللہ!

غرض انہی تمام مباحث و مسائل کے جاننے کا نام "علم اسماء" ہے اور اس کی تحصیل علمائے اسلام کے لیے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ علمائے اہل جماعت

۱۔ قرآن حکیم کے علوم خمسہ میں سے ایک مستقل علم نظام کائنات سے متعلق بھی ہے، جس کو شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب "الفوز الکبیر" میں "التذکیر بالارواح" کا نام دیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں یا مظاہر کائنات کے ذریعہ تذکیر و انتباہ۔ شاہ صاحب کی تصریح کے مطابق قرآن کے بنیادی علوم پنجگانہ یہ ہیں: (۱) علم احکام (۲) علم مخاصمہ (۳) مظاہر کائنات کے ذریعہ تذکیر و انتباہ (۴) صحیفہ تاریخ کے ذریعہ تذکیر و انتباہ (۵) علم آخرت۔ (حاشیہ نمبر ۲ صفحہ ۲۲ پر)

ہمیشہ اور ہر دور میں بلکہ ہر ملک و قوم میں اس فرض کفایہ کی ادائیگی کے لیے تیار رہنی چاہیے۔  
ورنہ وہ عند اللہ قابل مواخذہ ہوں گے۔ اور ان کا کوئی بھی عذر قیامت کے دن  
مسموع نہیں ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے کے تمام امور اور تمام مسائل کو کھول کھول  
کراپنے آخری اور ابدی صحیفہ میں بیان کر دیا ہے۔

ہمارے علماء کا فرض ہے کہ وہ ان علوم کی تحصیل کر کے قرآنی منشأ و مقصد کے  
مطابق عالم انسانی کی ہدایت و رہنمائی کا سامان فراہم کریں۔ قرآن حکیم میں ان علوم و  
مسائل کا تذکرہ بھی دراصل قرآن عظیم کی وسیع ہدایت و رہنمائی ہی کے ایک حصہ کے  
طور پر ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ان علوم سے خدا پرستی کے اثبات کے لیے سائنٹفک  
دلائل و شواہد فراہم کرنا مقصود ہے۔ یعنی مادہ پرست اور خدا بیزار لوگ نظام کائنات  
سے متعلق جن حقائق اور واضح نتائج سے آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں یا تجاہل  
عارفانہ سے کام لیتے ہوئے جن منطقی دلائل کا سامنا کرنے سے جی چراتے ہیں ایسے تمام  
مواقع پر انہیں متنبہ کرتے ہوئے متعلقہ شواہد کی نشاندہی کرنا اور منکرین حق کی علمی  
کمزوریوں کو واضح کرنا۔ یہ بھی ”معدوف و منکر“ کے مقتضار کے عین مطابق ہے چنانچہ  
يَا مُرُؤْنَ يَا مُعْرِوْفٍ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ“ (وہ معدوف کا حکم کرتے ہیں اور  
منکر سے روکتے ہیں) کے وسیع مفہوم میں یہ مشق بھی داخل سمجھی جائے گی۔

حاشیہ نمبر ۲، بقیہ ص ۲ : امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ان تمام علوم و فنون کی تحصیل کو  
فرض کفایہ قرار دیا ہے جن کے عدم وجود کے باعث اجتماعی حیثیت سے کوئی خرابی  
لازم آتی ہو۔ نیز اسی طرح امام ابن تیمیہؒ نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے کہ جدید علوم  
و مسائل حاصل کر کے زمانے کے مزاج کے مطابق کتاب و سنت کی تشریح و تفہیم کرنا تبلیغ دین  
میں داخل ہے اور یہ علمائے امت کے لیے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے۔

غرض قرآن حکیم میں ان علوم کا تذکرہ بھی دراصل اس کی ابدی اور عالمگیر رہنمائی ہی کا ایک حصہ ہے اس سے الگ نہیں۔ ظاہر بنیوں کو دھوکہ دیتا ہے کہ قرآن حکیم کو بھلا انسانی علوم سے کیا واسطہ! وہ سمجھتے ہیں کہ سائنسی علوم، نظام شریعت کے مغائر ہیں۔ حالانکہ یہ سائنسی علوم جو بادی النظر میں انسانی علوم معلوم ہوتے ہیں دراصل محض انسانی علوم نہیں ہیں بلکہ نظام کائنات اور نظام ربوبیت کی توضیح و تفصیل کرنے والے ہیں۔ کائنات میں جتنی بھی اشیاء ہیں سب کی سب خداوند کریم ہی کی پیدا کردہ ہیں۔ اور انسانی علوم کی بنیاد بھی یہی مخلوقات الہی ہیں۔ لہذا ان علوم کی تحقیق و تفتیش سے مخلوق الہی کا تفصیلی علم حاصل ہوتا ہے جو نظام ربوبیت کو سمجھنے کی بنیاد ہے اور جب تک انسان نظام ربوبیت کو صحیح طور پر سمجھ نہ لے وہ ”رب العالمین“ نظام جہانوں کے رب اور پروردگار کی صحیح معرفت بھی حاصل نہیں کر سکتا جو کہ اصل مقصود ہے۔

یہ ایک بعید از قیاس بات ہوگی اگر ہم یوں تصور کر لیں کہ مظاہر کائنات اور ان کے نظامات کسی بھی درجہ میں نظام شریعت کے مخالف واقع ہوئے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نصوص قرآنی کے مطابق مظاہر کائنات کے تمام ضوابط بنانے والا خالق عالم حل شانہ ہی ہے۔ اسی نے ایک ایٹم سے لے کر ایک نظام شمسی تک تمام مظاہر کی تخلیق کی اور

لے سائنسی علوم۔ جیسا کہ اہل بصیرت کی رائے ہے۔ اپنی ماہیت کے اعتبار سے پوری طرح سیکولر اور غیر جانبدار ہیں۔ ہر ایک ان کی جس طرح چاہتا ہے تشریح کرتا ہے اور ان کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر مادہ پرستانہ نقطہ نظر سے نظام کائنات کے معنی حل نہیں ہوتے اور مادیتین، مظاہر کائنات کے درمیان بین السطور کھینکتے رہتے ہیں۔ جب کہ اسلامی نقطہ نظر سے ان مختلف و متضاد نظاموں اور ان کے تمام ظاہری و باطنی علل و اسباب کی مکمل اور تشفی بخش تشریح و توضیح ہو جاتی ہے اور کہیں بھی کوئی راز یا شکاف باقی نہیں رہتا۔



ان کے طبیعی ضوابط مقرر کیے۔ اور اسی علیم و خیر اور ہمدان و ہمہ بین بستی نے نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنا کلام بھی نازل فرمایا۔ لہذا ان دونوں میں تعارض و تضاد کس طرح ہو سکتا ہے۔ !

امام دلی اللہ دہلویؒ (۱۱۱۳ - ۱۱۷۶ھ) نے قرآن حکیم کے تمام مضامین و مندرجات کو بنیادی طور پر پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ جن میں سے ایک ”التذکیر بالارباب اللہ“ بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں جو مظاہر کائنات یا مخلوقات الہی (حیوانات و نباتات اور جمادات و افلاک) کی شکل میں صفوہ ارض اور سمائے دنیا میں بکھری ہوئی ہیں، اُن کے ذریعہ یاد دہانی اور سبق آموزی۔ اس تصریح کے مطابق غور فرمائیے یہ موضوع قرآن حکیم کا ایک مستقل موضوع اور اس کے علوم و معارف کا پانچواں ایک حصہ ہے۔ کیا ہم اتنے بڑے حصہ کو نظر انداز کر سکتے ہیں !

حاصل یہ کہ نظام کائنات اور نظام ربوبیت سے متعلق ہر نیا انکشاف قرآن حکیم کی ابدی صداقتوں کو اجاگر کرنے والا اور اس کے لافانی نقوش و اسرار کو بے نقاب کرنے والا ہو گا، جب کہ ہم لغت، نحو اور تمام صحیح تفسیری اصولوں سے کام لے کر آیات الہی کی صحیح تفسیر کریں۔ اس طرح تمام صحیح اصولوں کو کام میں لا کر جب پوری ذمہ داری کے ساتھ اس کی تفسیر کی جائے گی تو پھر اس کے غلط ہو جانے یا کتاب اللہ پر حرف آ جانے کا کوئی خدشہ باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ یہ کوشش محمود و مستحسن ہوگی اور عند اللہ قابل اجر بھی۔ آج بہت سے تشنگان علم اس قسم کی صحیح تفسیروں کا تقاضہ و مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ وقت کی بہت بڑی ضرورت اور ایک بہت بڑا غلبہ جس کو پورا کرنا عصر حاضر کا ایک کارنامہ ہو گا۔

لے نہ رفتہ و فساد برپا کرنے کی غرض سے اس کی آیات میں توڑ مرڈ و ممانی تاویلات کر کے جیسا کہ عصر جدید کے متجددین کا قاصد ہے۔

الرُّقْفَ كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ۝

الف، لام، را۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں (علمی اعتبار سے) محکم کی گئی ہیں بلکہ پھر ان کی تفصیل ایک حکیم اور باخبر ہستی کی جانب سے کی گئی ہے۔ (ہود: ۱)

خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِأَرْبَعِينَ يَوْمًا طِإً فِي ذَلِكَ لَآيَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝  
اللہ نے زمین اور آسمانوں کو حکمت اور مطابقت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس باب میں اہل ایمان کے لیے ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ (عنکبوت: ۴۴)

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ  
لِّلْمُسْلِمِينَ ۝ (اے محمد!) ہم نے آپ پر وہ کتاب اتار دی ہے جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والی ہے۔ اور وہ (ان ابدی حقائق کی بدولت) فرمانبرداری کے لیے ہدایت و رحمت اور خوشخبری ہے۔ (نحل: ۸۹)

۱۔ یعنی اصول صحیحہ کی رو سے ان کا مفہوم کبھی غلط ثابت نہیں ہو سکتا اور کائنات کے حقائق ان کے کبھی متضاد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ چنانچہ چودہ سو سال کی تاریخ میں آج تک اس قسم کے تعارض و تضاد کی کوئی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جاسکی۔ یہ بھی نوع انسانی کے لیے ایک چیلنج ہے۔ یہ اس بات کا قطعی اور فیصلہ کن ثبوت ہے کہ لازوال سچائیوں سے لبریز یہ کتاب حکمت بھی اس حکیم و خیر ہستی کی جانب سے ہے جس نے اس رنگارنگ صحیفہ فطرت کی تخلیق کی ہے۔ ورنہ ان دونوں میں اس قدر توافق اور مکمل ہم آہنگی ہرگز نہ پائی جاتی۔

اور دوسری حیثیت سے زمانہ خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ بن جائے اس کے شرعی و اخلاقی احکام و ضوابط از کار رفتہ یا آؤٹ آف ڈیٹ نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ان کی اہمیت و افادیت ہر دور میں منطبق صحیح کی رو سے مسلم رہے گی۔ (حاشیہ نمبر ۲ و ۳ صفحہ ۲۶ پر)

فَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ۝ (در ارض و سماء)

کا کوئی راز (سر بہتہ) ایسا نہیں ہے جو (اس) کتاب روشن میں موجود نہ ہو (نمل: ۷۵)

لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (ہم نے تمہارے)

پاس ایک ایسی کتاب بھیج دی ہے جس میں تمہارا تذکرہ (داستان) موجود ہے۔ (انبیاء: ۱۰)

أَفَعِثَ اللَّهُ ابْتِغَىٰ حُكْمًا ۖ ذَٰلِكَ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۖ ط

تو کیا میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کو حکم مان لوں! حالانکہ اسی نے اس کتاب کو تمہارے

پاس تفصیل کے ساتھ بھیج دیا ہے۔ (انعام: ۱۱۳)

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ ۖ لِيُكَفِّرَ عَنْ الْعَالَمِينَ ۖ ذَٰلِكُمْ يَوْمَ ۝

بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر فرقان (فیصلہ کن کتاب) نازل کی

تاکہ وہ سارے جہان کو متنبہ کر سکے۔ (فرقان: ۱)

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَآئِرٌ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَخُذُوا ۖ إِنَّمَنِ الْبَصِرُ فَلْيَنْفِسِ ۖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ط

حاشیہ نمبر ۲ و ۳، (بقیہ صفحہ ۲۵) ۲ امام داغ بکھتے ہیں کہ لفظ ”الحق“ کی اصل مطابقت

و موافقت ہے اور جب اس کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر ہو تو اس کا طلب ہوگا وہ ذات

جو بتقاضائے حکمت اشیاء کو وجود میں لائے۔ اسی طرح ہر اس چیز کو بھی ”حق“ کہا جاتا ہے جو

حکمت کے تقاضوں کے مطابق پیدا کی گئی ہو (مخلص از المفردات فی غرائب القرآن)

۳ یہاں پر ہدایت، رحمت اور بشری کے الفاظ ہماری ذہن سازی کے لیے

نہایت درجہ اہمیت رکھتے ہیں جو ”تبیان“ سے متعلق ہیں۔ گویا کہ قرآن حکیم کو ہر قسم کی

معلومات سے آراستہ کرنے کے یہی مقاصد ہیں۔ مطلب یہ ہو کہ یہ بھی ہدایت ہی کی خاطر ہے

کہ اہل اسلام منشائے خداوندی کے مطابق نوع انسانی کی صحیح رہنمائی کر کے اس کی

رحمت اور خوشخبری کے مستحق بنیں۔



رگوں) تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے روشن دلیلیں آچکی ہیں۔ پس اب جس نے بصارت رکھ لی (آنکھوں) سے کام لیا وہ فائدے میں رہا اور جو (جان بوجھ کر) اندھا بنا وہ زیاں کار ہوا (انعام: ۱۰۵)

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاَفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَّبِعُوْنَ لَهُمُ اٰلِهٌ اَحَقُّ ط  
اَوْ لَمْ يَكُنْ بِرَبِّكَ اٰلِهٌ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ ہم عنقریب ان (منکرین حق) کو اپنے نشانات ولائل دکھا دیں گے، ان کے گرد دلواح میں بھی اہل خودا کی اپنی ہستیوں میں بھی، تا آنکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ (کلام) برحق ہے کیا یہ بات ان کی تسلی و تشفی کے لیے کافی نہیں ہے کہ تیرا رب (اس عالم آب و گل کی) برہیز سے واقف ہے۔ ۝ ۹  
(رحم سجدہ: ۵۳)

اس قسم کی اگر تمام آیات کو اکٹھا کیا جائے تو فکر و نظر کے بہت سے گوشے اجاگر ہو جاتے ہیں اور ہر شبہ کا کافی و شافی جواب مل جاتا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا روپی ہے جس نے تمہارے پاس اس کتاب کو تفصیل کے ساتھ بھیج دیا ہے۔ (انعام: ۱۱۳)  
(باقی آئندہ)

## منقش حکمت

جناب الحق پھونڈوی مرحوم کے نام سے ہندوستان کا تقریباً بھرپور حال لکھا واقف ہے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے معدودے چند شعرا میں ہے۔ آپ کے کلام کا اندازِ ظرافت، رنگینی اور شوخی کے ساتھ ہر حکمت بھی ہوتا ہے، یہ مجموعہ اشارات، عبارات، خطابات، تین عنوانات پر مشتمل ہے۔ آخر میں منتخب غزلیات ہیں۔ صفوات ۳۲۰ قیمت مجلد - ۷/-  
مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۷

# دور جدید میں اسلامی قانون (فقہ)

از: پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیات کی وجہ سے دنیا میں جو غیر معمولی تبدیلیاں آئی ہیں انھوں نے سماج کے قدیم معاشرتی اور معاشی نظام کو دھیمہ برہم کر دیا ہے۔ ان اخلاقی اور مذہبی روایات و اقدار کی جگہ، جن کا اب تک معاشرہ میں ایک اہم مقام تھا اور جن کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، نئی اقدار نے لینا شروع کر دی ہے۔ اس صورت حال نے جو کہ تمام مذاہب کے لیے یکساں طور پر پریشان کن ہے اسلام کو بھی ایک اہم سوال سے دوچار کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ کیا اسلام جس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ تمام بنی نوع انسان کے لیے اور تمام زمانوں کے لیے باعث ہدایت ہے، جدید تہذیب و تمدن کے اس چیلنج کا بہتر انداز میں مقابلہ کر سکتا ہے؟ یہی وہ سوال ہے جس پر راقم السطور اس

نوٹ: استاد معظم پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی صاحب مدظلہ کا مقالہ انگریزی میں دہلی بھون نئی دہلی میں منعقدہ بین الاقوامی سمینار میں جو کہ ۲۸، ۲۹، ۳۰ جنوری ۱۹۸۱ء کو ہوئی تھی، پڑھا گیا تھا۔ معظم و مکرم جناب مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی مدظلہ کے ارشاد کے بموجب اس کا ترجمہ قارئین برہان کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ سمینار گورنمنٹ آف انڈیا کی جانب سے چودھویں صدی ہجری کے اختتام کی تقریبات کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھی۔

(ماجد علی خاں - جامعہ ملیہ اسلامیہ)

مقالہ میں بحث کرنا چاہتا ہے۔

در اصل لفظ ”الدین“ جو کہ پورے مذہب اسلام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کے دو جز ہیں :- (۱) دین - (۲) شریعت - دین کا تعلق بنیادی اصول و ضوابط سے ہے، گو کہ دین کی تشریحات مختلف پیغمبروں نے (اپنی شریعت کے مطابق کیں)، اس کی تکمیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہوئی۔ دین بنیادی طور پر حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی رہا جیسا کہ قرآن میں بھی متعدد جگہوں پر اس پر زور دیا گیا ہے۔

جہاں تک شریعت کا تعلق ہے اس میں وہ قوانین و ضوابط ہوتے ہیں جن کا مدار دین پر ہوتا ہے۔ گو کہ عملی اعتبار سے دین و شریعت کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا تاہم شریعت میں تھوڑی سی لچک اور نرمی ہوتی ہے تاکہ کسی خاص قوم کی ضرورت اور زمانہ کے تقاضہ کے مطابق ضروری قوانین و ضوابط بنائے جاسکیں۔ قرآن کریم نے اس خاص نقطہ نظر کو بھی واضح کر دیا ہے: ”الدین“ کے متعلق قرآن کہتا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ط بَكُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ط (الشوریٰ ۲: ۱۳)

ترجمہ: ”اس (اللہ) نے تمہارے لیے وہ دین ٹھہرایا جس دین پر نوح (علیہ السلام) کو چاہنے کا حکم دیا اور جس دین کا حکم ہم نے تجھ کو (اے محمد) بذریعہ وحی عطا کیا۔ اور جس دین کا ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ (پیغمبروں) کو حکم دیا۔ سب سے یہی کہا تھا) دین کو قائم رکھو اور اس میں کھوٹ نہ ڈالو۔ (اے پیغمبر) جس (دین) کی طرف تو مشرکوں کو بلا تا ہے وہ ان پر بہت گراں“



شریعت کے لیے قرآن میں مذکور ہے :-

لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَا جَا ط (المائدہ ۵: ۴۸)

ترجمہ: ”ہم نے تم میں سے ہر ایک کو ایک ماہ اور شریعت دی ہے“

اس سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ ہر پیغمبر کو دو مقاصد سے مبعوث کیا گیا: (۱) اپنے سے پہلے پیغمبر کے ”الدین“ کی تصدیق کرے؛ (۲) اُس قانون (شریعت) میں ضروری ترمیمیں اور تبدیلیاں کرے جو اس سے پہلے پیغمبر لایا تھا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو انھوں نے اعلان کیا:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَإِلٰهُكُمْ بَعْضُ

الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ - (ال عمران ۳: ۵۰)

ترجمہ: ”اور (میں) تصدیق کرتا ہوں توریت کی جو مجھ سے پہلے نازل کی گئی تھی اور میں اس لیے آیا (ہوں) کہ بعض چیزیں جو تم پر حرام ہو گئی تھیں ان کو حلال کر دوں (خدا کے حکم سے)“

وحی الہی کے اس عام طرز سے ایک سوال ابھرتا ہے: ”اگر قرآن اللہ کی نازل کردہ آخری کتاب ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی و رسول ہیں تو وہ مسائل کس طرح حل ہوں گے جو زمانہ کی ترقی اور معاشرتی تبدیلیوں کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد رونما ہوں گے؟“ اس کا جواب ہے: ”اجتہاد کے ذریعہ“ لیکن قبل اس کے کہ اس کی مزید تشریح کی جائے یہ بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ قرآن نے یہ صاف صاف کہا ہے کہ اللہ نے ”الدین“ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مکمل کر دیا ہے۔ (سورۃ المائدہ: آیت ۱۰۵) لیکن شریعت کے متعلق اس قسم کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ”الدین“ جو کہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے اور جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے

تشریح اور وضاحت کی ہے ہر اعتبار سے کامل ہے اور اس میں ہر زمانہ کے اندر لوگوں کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن شریعت جس میں کہ قوانین و ضوابط ہوتے ہیں قدرتی طور پر اس حیثیت کی حامل نہیں ہوگی کیونکہ حالات زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نئے نئے مسائل درپیش ہوں گے جن کی وجہ سے قرآن و سنت کی روشنی میں نئے ضوابط بناتے جائیں گے اور پرانے قوانین میں تبدیلی کی جائے گی۔ اسی ضرورت کے پیش نظر اجتہاد کے بغیر چارہ کار نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس وقت اجتہاد کیا ہے جب آپ کو فوری اور وقتی ضرورت کے تحت مختلف مسائل کو حل کرنے میں وحی الہی سے صاف رہنمائی نہیں ملتی تھی۔ علاوہ ازیں صحابہؓ کو بھی اس وقت اجتہاد کرنے کی ترغیب دی گئی جب کہ اس کی ضرورت پیش آئی۔

جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنایا گیا تھا وہ روانگی سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے اُن ضوابط کے متعلق دریافت فرمایا جن کو سامنے رکھ کر وہ وہاں پر فیصلہ کریں گے۔ انھوں نے جواب دیا ”قرآن کے قانون سے“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ دریافت کیا۔ ”اگر تم قرآن میں کسی مسئلہ کا حل نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟“ انھوں نے عرض کیا۔ ”اس صورت میں میں سنت کی طرف رجوع کروں گا“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر معلوم کیا۔ ”اگر تم سنت میں بھی دھل نہ پاسکے تو کیا کرو گے؟“ انھوں نے کہا ”اس صورت میں میں اپنے اختیار رائے کا استعمال کروں گا“ اس کو سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے زیادہ خوش ہوئے کہ آپ نے دونوں ہاتھ اُپر اٹھا کر فرمایا۔ ”تمام تعریفیں اس کے لیے ہیں جس نے اپنے رسولؐ کے رسول (پیغام رماں) کو اس طرح ہدایت دی جس طرح کہ اس نے چاہا“

غایت اور مقصد | اب ہم اجتہاد کے مطلب اور غایت پر غور کرتے ہیں۔ اجتہاد لفظ ”جہد“

مشتق ہے جس کا لغوی مطلب سعی یا کوشش کرنا ہے۔ اصطلاحاً اس کا مطلب ہے :- ”کسی فقیہ کا کسی (مشتبہ یا ناقابل حل) مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں اپنی دماغی صلاحیتوں کو بہتر سے بہتر طریقہ پر استعمال کرنا“ اس طرح ان مسائل میں اجتہاد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جن کو قرآن و سنت میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی فرضیت؛ علم الفرائض (میراث کے احکامات)؛ جھوٹی گواہی کی سزا؛ زنا کی حرمت وغیرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ”جو کچھ حلال ہے اور جو کچھ حرام ہے اس کو صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے۔ اُن دونوں کے درمیان مشتبہات ہیں“ ان مشتبہات میں ہی انفرادی یا اجتماعی فیصلہ (اجتہاد) کی ضرورت پڑتی ہے۔

اجتہاد کا طریقہ | اصول فقہ کے مطابق اسلامی قانون (علم الفقہ) کے چار بنیادی ماخذ ہیں :- (۱) قرآن حکیم (۲) سنت (۳) اجماع اور (۴) قیاس۔ قرآن میں جو کہ اللہ کی طرف سے براہ راست اس کے رسولؐ پر نازل کیا گیا ہے چھوٹی بڑی ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ جیسا کہ خود قرآن (سورۃ آل عمران) میں کہا گیا ہے آیتیں دو قسم کی ہیں۔ (۱) وہ آیتیں جن میں بنیادی اور محکم احکامات صاف صاف بیان کیے گئے ہیں۔ (۲) وہ آیتیں جن کے تمثیلی معنی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری قسم میں آنے والی آیتوں کے معانی و مراد مختلف لوگوں میں مختلف ہوں گے لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ ان آیتوں کی کوئی ایسی تشریح کی جائے یا ایسے معانی بتائے جائیں جو محکم آیات (یعنی پہلی قسم والی آیات) کے متناقض ہوں۔

سنت بالواسطہ (خفی) وحی ہے۔ اس لیے اگر کسی حدیث کا مستند ہونا ثابت ہو جائے تو اس پر عمل کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ قرآن کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم



کی حیات طیبہ ایک اسوۂ حسنہ ہے۔ اس وجہ سے آپ کے ہر فعل اور ہر قول کا سمجھنا، اس کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ گو کہ حدیث کا بنیادی مقصد قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس کی وضاحت کرنا اور اس کو سمجھانا ہے تاہم ایسی (مستند) احادیث بھی قابل قبول سمجھی جاتی ہیں جو بظاہر قرآن کے صریح الفاظ اور اس کی روح کے منافی دکھائی دیتی ہیں۔

جہاں تک اجماع اور قیاس کا تعلق ہے یہ ایک دوسرے سے (ذرا) مختلف ہیں۔ اجماع اجتماعی اجتہاد و اتفاق رائے کا نام ہے جبکہ قیاس انفرادی اجتہاد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ جل شانہ نے قرآن میں ان کو اسلامی قانون کے مآخذ میں شمار کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ان کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے بھی ان مواقع پر جہاں قرآن و سنت سے کسی مسئلہ کے بارے میں صاف حل موجود نہیں ہے اجماع و قیاس کے ذریعہ فیصلہ کیا ہے۔ یہ بات بھی واضح طور پر سمجھ لینا ضروری ہے جو کہ ہماری آئندہ آنے والی بحث میں مددگار ثابت ہوگی کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مآخذ فقہ (قانون) اسلام بنیادی طور پر چار ہیں یعنی قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔ لیکن پہلے دو مآخذ یعنی قرآن و سنت کو **أَدَلَّةُ الْقَطْعِيَّةُ** کہا جاتا ہے جبکہ آخری دو مآخذ کی حیثیت **أَدَلَّةُ الْقَطْعِيَّةِ** کی نہیں ہے کیونکہ ان دو مآخذ کی بنیاد اجتہاد پر رکھی گئی ہے اس لیے ان کو **أَدَلَّةُ الْاِجْتِهَادِ** کہتے ہیں۔ اسی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ **أَدَلَّةُ الْاِجْتِهَادِ** میں غور و خوض کا دروازہ کھلا ہے تاکہ کسی مخصوص زمانہ کے حالات کے مطابق فیصلہ کیا جاسکے۔ اس طرح مجتہد کے دو بنیادی کام ہیں :- (۱) حالات کے مطابق کسی امام یا ائمہ اربعہ کے کبے گئے اجتہاد پر دوبارہ غور و خوض کر کے اگر کوئی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو تو اس کے بارے میں رائے دینا تاکہ نئے حالات کا مقابلہ کیا جاسکے۔ (۲) سماج کی جدید معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں

کے پیش نظر نئے مسائل کا حل تلاش کرتا۔ پہلی صورت میں مجتہد کو فقہ اسلامی کے کسی مخصوص مکتب فکر کی مزید گہرائی میں جانا ہوگا۔ اگر فقہ اسلامی کے کسی مسئلہ کی بنیاد قرآن و حدیث کو بنایا گیا ہے تو مجتہد کو یہ دیکھنا ہوگا کہ حکم منصوص ہے یا نہیں۔ اگر ایسا ہے (یعنی منصوص ہے) تو پھر کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ قرآن میں جو کچھ کہ صاف صاف کہہ دیا گیا ہے اس میں خود پیغمبر کو بھی کسی قسم کی تبدیلی کا کوئی حق نہیں ہے۔ چنانچہ کچھ خواہگی حالات کے تقاضہ کے تحت آپ نے ایک حلال چیز کو نہ کھانے کی قسم کھالی تھی جس پر قرآن میں آپ کو تنبیہ کی گئی اور فرمایا گیا :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ . (اتحریم ۶۶ : ۱)

ترجمہ : اے نبی ! اللہ نے جو چیز تجھ پر حلال کی ہے تو اس کو (اپنے اوپر)

حرام کیوں کرتا ہے ؟

اگر قرآن و حدیث میں بیان کردہ حکم کسی ایسی علت یا دلیل کی بنیاد پر ہے جو کہ خود قرآن و حدیث میں مذکور ہے یا کسی بڑے صحابی رضی اللہ عنہ نے اپنے قول و فعل سے اس (علت) کو واضح کیا ہے تو پھر مجتہد کو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ علت یا دلیل جدید حالات میں قابل اطلاق ہے یا نہیں۔

اور اگر مجتہد یہ دیکھتا ہے کہ کوئی قانون نص میں قطعیت کی بنیاد پر نہیں بنایا گیا ہے بلکہ کسی امام کے اجتہاد کا نتیجہ ہے تو اس صورت میں مجتہد کو جدید تقاضوں کے تحت اس امام سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ یہ اختلاف اس صورت میں کیا جاسکتا ہے جبکہ اس امام نے کسی آیت قرآن کی تفسیر یا کسی حدیث کی تشریح اپنے اجتہاد اور اپنی رائے کے مطابق کی ہو۔ مجتہد اس تشریح کو (جدید تقاضوں کے تحت) عقلی دلائل سے نئے انداز میں بیان کر سکتا ہے۔ بہر حال اجتہاد کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ طوفانی (م ۱۸۳ ص ۷۷) نے قرآن و حدیث سے تقریباً ۴۵ (پینتالیس) ایسے

اصولوں کی تخریج کی ہے جن کی بنیاد پر مجتہد اپنی رائے دے سکتا ہے۔ ان میں سے چند اصول و طریقے جن میں کسی کو اختلاف نہیں ہے یہاں پر بیان کرنا غیر ضروری نہیں ہوگا۔ ”عرف“ اور ”استصلاح“ [کسی قوم و برادری کے رسم و رواج اور معاشرتی آداب کا] اس کے قوانین کی وضع میں بنیادی کردار ہوتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی معرکہ الآراء تصنیف حجة الله البالغة میں اور اسی طرح بہت سے اکابر علماء نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے اور اسلام کی قانون سازی میں قرآن و سنت کی روشنی میں ”عرف“ کی اہمیت بتائی ہے۔ مشہور فقیہ ابن عابدینؒ نے اس موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے۔ عباسی دور کے قاضی القضاة اور مسلک احناف کے اہم ستون قاضی ابو یوسفؒ نے تو یہاں تک کہا ہے: ”جو شخص اپنے زمانہ کے ”عرف“ سے واقف نہ ہو اس کو فتویٰ دینے کی اجازت نہیں ہے۔“

اسی طرح ”استصلاح“ اور ”المصالح المرسلة“ بھی چیزوں کی حسن و فحش معلوم کرنے کا ایک اہم حربہ ہے۔ اس موضوع پر بھی فقہاء نے بحث کی ہے۔ خاص طور پر امام مالکؒ کے مسلک میں اس کی کافی اہمیت ہے۔

وضع قانون اسلامی کے دیگر اصول حسب ذیل ہیں :

- (۱) الاصل فی الاشیاء الایباحۃ = اشیاء میں اصل اباحت ہے۔
- (۲) اذا اُبتیٰ احد کم ببلیتین فالیختر باھو یرتھما = اگر کوئی دو ضرر سا چیزوں میں گھر گیا ہے تو وہ ان میں سے کم ضرر سا چیز کو اختیار کرے۔
- (۳) سداً جاب ذرائع الفساد = فساد کے ذرائع کا دروازہ بھی بند رکھنا چاہیے۔

(۴) الضرورات تبیح المحظورات = ضرورتیں ممنوعات کو مباح بنا دیتی ہیں۔

(۵) دفع الضرر مقدّم علی جلب المنفعة = ضرر کا دور کرنا منفعت



حاصل کرنے کا مقدمہ ہے۔

(۶) الدِّینُ یُسْرُ : دین آسان ہے۔

(۷) لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اَلَا وُسْعَهَا۔ اللہ کسی کو اس کی وسعت اور برداشت

سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

(۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی۔ لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام

(اسلام میں نہ خود نقصان اٹھانا ہے اور نہ دوسرے کو نقصان پہنچانا ہے۔) یہی اسلامی قانون رازی میں اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں اُن چیزوں سے بھی فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں جن پر غیر مسلم عمل پیرا ہوں بشرطیکہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے نہ ٹکراتی ہوں۔)

امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں ایک روایت کی تخریج کی ہے جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ رضا عمت کے دوران عورت سے بہبتری کرنے پر پابندی لگانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن جب آپؐ کو یہ معلوم ہوا کہ فارس اور روم میں لوگ اس پر جس کو عربی میں غیلۃ کہتے ہیں عمل کرتے ہیں اور اس سے عورت یا بچے (کی صحت) پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا تو آپؐ نے اپنے اس ارادہ کو ترک کر دیا۔ اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ معاشرہ کی فلاح و بہبود کا ہمارے فقہاء نے اتنا خیال رکھا ہے کہ مولانا بجز العلومؒ (م ۱۲۲۵ھ) جیسے جید فقیہ نے صاف صاف کہہ دیا ہے: ”اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی احکامات کی بنیاد دراصل انسان کی فلاح و بہبود ہے۔ شارع (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہی احکامات کا حکم دیا ہے جو لوگوں کی بھلائی کے لیے ہیں۔“ سہ

ملہ شرح مسألم الثبوت، ص ۵۴۳۔

ابن قیمؒ (م ۷۵۰ھ) بھی تحریر کرتے ہیں: ”اللہ جل شانہ نے اپنے رسول صرف اسی وجہ سے مبعوث کیے اور انہی کتابیں اسی لیے نازل کیں کہ لوگ عدل و انصاف قائم کریں عدل و انصاف اور مسادات ہی دراصل آسمان و زمین کو قائم رکھتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی عدل و انصاف کے آثار موجود ہیں وہاں پر اللہ کے مذہب اور طریقہ کے آثار بھی (یقیناً) موجود ہیں۔ اللہ جو حکیم اور عادل ہے ایسا نہیں کر سکتا کہ انصاف کے کچھ طریقوں کو نازل کر دے اور جب انصاف کے کچھ اور طریقے سامنے آئیں تو ان کو رد کر دے“ ۱۵

وہ مزید تحریر کرتے ہیں: ”اللہ کا مقصد بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن کا قیام ہے جس طریقہ کے ذریعہ عدل و انصاف قائم کیا جائے گا وہی دین ہوگا اس کو دین کے خلاف نہ کہا جائے گا“

ممکن ہے ہم میں سے کچھ لوگ ابن قیمؒ کے ان خیالات کو انتہا پسند اور سخت سمجھیں لیکن اگر اس حدیث کی روشنی میں دیکھا جائے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ اس حد تک آگے نہیں بڑھے ہیں جیسا کہ خیال کیا جا رہا ہے۔ فقہ کا نشیونما اور ارتقار اب تک ہم نے یہ دیکھا کہ اسلام میں قانون سازی کس طرح کی جاتی ہے۔ اس کے بنیادی اور فردعی مآخذ کیا ہیں اور ان کو کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور اجتہاد کا طریقہ اور اس کی حد کیا ہے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فقہ کی ابتداء کس طرح ہوئی اور اس کا ارتقار کیسے ہوا تاکہ ہمیں تاریخ فقہ اسلامی کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ اپنی حیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی مسلمانوں کے لیے ہدایت و رہنمائی کا واحد ذریعہ تھی۔ وہ اپنے مختلف معاملات میں اور مسائل کے حل کے سلسلے میں آپ کی طرف ہی رجوع ہوتے تھے۔ آپ کے اقوال و افعال، اسی طرح آپ کی تفسیر

یعنی کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے عمل پر آپ کسکوت جس کا مطلب آپ کی پسندیدگی تھا۔ کو قانون کا درجہ حاصل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی فقہ اسلامی کا ایک اور ماخذ یعنی استخراج مسائل و استدلال جبکہ کسی قانون کی وضاحت موجود نہ ہو، بھی ظاہر ہو چکا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جس کا مطلب وحی الہی، چاہے وہ جلی ہو یا خفی، کا منقطع ہو جانا تھا، مسلمانوں نے اسی پر اتکا کیا جو کہ انھوں نے اپنے سردار (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سیکھا تھا یا آپ سے سنا تھا اور قانون سازی کے وہی طریقے انھوں نے اختیار کیے جن کی منظوری آپ نے دی تھی یا جن کو آپ نے پسند کیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد مملکت اسلامیہ، الشیخ، افریقیہ اور یورپ کے کچھ حصوں تک پھیل گئی، فتوحات اور سیاسی اقتدار کی وسعت کی وجہ سے مختلف زبانوں، تہذیبوں اور تمدنوں کے لوگ کثیر تعداد میں ایک ساتھ ایک ہی جھنڈے کے نیچے ایک حکومت کے تحت رہنے پہنچے۔ اس مخصوص معاشرتی و معاشی صورت حال کی وجہ سے بڑی کثیر تعداد میں نئے مسائل ابھرے۔ اس زمانہ میں حجاز کا معاشرہ اب سے باہر ممالک کے معاشرے سے مختلف تھا۔ حجاز کا خطہ دوسرے ممالک سے الگ تھلگ تھا۔ جب کہ نئی مملکت اسلامیہ کے (دوسرے حصے وسیع المشرب تھے جن میں طے چلے لوگ آباد تھے اس لیے مدینہ منورہ کے فقہاء جن کے سرخیل امام مالکؒ تھے، کے سامنے وہ صورت حال اور پیچیدہ مسائل نہیں تھے جن کا سامنا فقہاء عراق یعنی امام ابو حنیفہؒ (اور ان کے اصحاب) کو کرنا پڑا۔ اس لیے امام مالکؒ مدینہ منورہ کے عرف اور تعالیٰ پر ہی قائل رہے جبکہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کو (نئے مسائل میں) قیاس اور اجتہاد کے دوسرے طریقوں سے جن کو کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کام لینے کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی نہ رہا۔ اس فرق اور طریقہ کار میں اختلاف کی وجہ سے فقہاء کے ان دونوں گروہوں کے فتاویٰ میں بھی کافی بعد





کام کیا۔ امام ابو حنیفہؒ (۸۰ھ تا ۱۵۰ھ) امام مالکؒ بن انس (۹۰ یا ۹۴ھ تا ۱۷۹ھ)، امام شافعیؒ (۱۵۰ھ تا ۲۰۴ھ) اور امام احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ تا ۲۴۱ھ) وہ چار مشہور فقہاء ہیں جن کے مکاتیب فکر کچھ سیاسی مقاصد اور مقامی ضروریات کے پیش نظر عالم اسلام میں مقبول ہوئے اور پر دان چڑھے۔ ان کے علاوہ کبھی کبھار اور فقہاء تھے جن کو اجتہاد کا درجہ حاصل ہوا لیکن ان کے مکاتیب فکر مقبول نہ ہو سکے۔ ان میں سے داؤد بن علی النطاہری، الاوزاعی، سفیان ثوری اور ابو ثور بہت مشہور ہوئے۔ امام شافعی کا شمار عالم اسلام کے بڑے فقہاء میں سے ہوتا ہے وہ پہلے فقہ ہیں جنہوں نے باقاعدہ اصول الفقہ کی تدوین کی اور وہ اس علم کے مجدد ہیں۔

ہیفینگ لکھتا ہے: "امام شافعیؒ ایک ایسی چیدہ شخصیت کے حامل تھے جنہوں نے اپنے دور کے اہل الرائے اور محدثوں کے درمیان کا راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے نہ صرف قانون سازی کے ان ذرائع کا استعمال کیا جو اس دور میں رائج تھے بلکہ انہی کتابت الرسائل میں قانون سازی کے اصول و قواعد بھی مرتب کیے ظاہر ہے اس موضوع پر ان اصول و قواعد کی حیثیت صرف آخر کی نہیں ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ انہوں نے مستقبل میں اجتہاد کے لیے راستہ آسان کر دیا۔ انہی تصانیف میں ان اصول و قواعد پر بعد میں آنے والے بہت سے علماء و فقہاء نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان کو سمجھایا ہے اور ان پر (گردانہ) اصل نے بھی کیے ہیں۔ ان میں سے کافی کام ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ حال میں عربی کتابوں کی ایک بڑی تعداد خاص طور پر مصر میں مطبوعہ کتابوں میں اس موضوع پر بہت اچھے اور مفید مباحث سامنے آئے ہیں جن سے اس موضوع پر کافی روشنی پڑتی ہے اور جو ہمارے مقصد کے لیے بہت معین و قیمتی ہیں" (۱)۔

(باقی آئندہ)

Cited by A.A.A. Fyzee in his book

۱

"Outline of Muhammadan Law", P 24.

# اردو شاعری میں فلسفہ وحدت الوجود

ڈاکٹر عنوان چشتی

شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

اسلام کی وہ تعبیر جس میں ”اعمال ظاہری“ پر حکم لگایا جاتا ہے لیکن اعمال باطنی کی نفی نہیں کی جاتی فقہ کہلاتا ہے اور اسلام کی وہ تعبیر جس میں اعمال باطنی پر زور دیا جاتا ہے لیکن اعمال ظاہری سے صرف نظر نہیں کیا جاتا ”تصوف“ کہلاتا ہے مولانا اشرف علی تھانوی نے لکھا ہے کہ ابتدائے شریعت اعمال ظاہری اور باطنی دونوں پر محیط تھی لیکن آگے چل کر شریعت کے ”جزء متعلق بہ اعمال ظاہری“ کا نام فقہ اور ”جزء متعلق بہ اعمال باطنی“ کا نام تصوف ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ اور تصوف میں تضاد نہیں بلکہ یہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ انھوں نے تصوف کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ اعمال باطنی کے طریقوں کو طریقت کہتے ہیں۔ پھر ان اعمال باطنی کی درستی سے قلب میں جو صفاء اور جلا پیدا ہوتا ہے اور اس سے انسان حقائق الہیہ اور حقائق کوئی سے آگاہ ہوتا ہے نیز اس پر عبود و معبود کے رشتہ کے اسرار کھلتے ہیں ان کمشوقات کو حقیقت اور اس انکشاف کو معرفت کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ



تصوف اسلام کے دائرے میں ہے اور شریعت کا ایک مخصوص پہلو ہے جو تزکیہ باطن اور تہذیب نفس پر زور دیتا ہے۔ اور بصارت پر بصیرت نیز معلومات پر معرفت کی فوقیت پر اصرار کرتا ہے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا ہے کہ ”تصوف کا اقل علم اوسط عمل اور آخر عطا من اللہ تعالیٰ ہے۔ جس کو دوسرے الفاظ میں بالترتیب تصوف کے علمی عملی اور کشفی پہلو کہا جاسکتا ہے۔ تصوف کے ارتقائی عمل میں علم پہلا مرتبہ ہے حضور اکرم ص کا ارشادِ اقدس ہے کہ علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اور حکمت مسلمان کی کھوئی ہوئی میراث ہے حضرت سید علی ہجویری داتا گنج بخشؒ نے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں :- پہلی علم ظاہری دوسری علم باطنی۔ علم ظاہری میں کلمہ شہادت اور اسلام کے بنیادی اصولوں اور ارکان سے واقفیت شامل ہے۔ اور علم باطنی میں ”معرفت الہی کی تحقیق شامل ہے۔ انھوں نے علم پر مبلغ گفتگو کی ہے نیز علم شریعت کے ارکان، علم طریقت کے ارکان کا تجزیہ کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں علم من اللہ، علم باللہ اور علم الیقین، عین الیقین نیز حق الیقین کی وضاحت فرمائی ہے۔ حضرت غوث الاعظمؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بھی علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کی تشریح کی ہے۔ اس تمہید کا صرف یہ مقصد ہے کہ تصوف کے علمی پہلو میں علم کی زبردست اہمیت ہے۔ تصوف کا علمی دائرہ بیکہ ابتدا میں اشارہ کیا جا چکا ہے مسائل الہیہ اور مسائل کونیہ دونوں پر محیط ہے۔ فلسفہ و تصوف میں دونوں مسائل ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں چونکہ تمام مسائل کو سمیٹنا ممکن نہیں ہے اس لیے یہاں فلسفہ تصوف کی روشنی میں تصور وجود و موجود کی وضاحت اردو شاعری کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ یعنی حضرت محی الدین ابن عربی کے

۱۔ عوارف المعارف (مترجم) ابوالحسن، نو لکھنؤ ۱۸۹۰ء ص ۳۱۸-۷۸۔

۲۔ کشف المحجوب (مترجم) غلام معین الدین نعیمی، نوری یک ڈپو لاہور ص ۴۳-۴۵۔

فلسفہ وحدت الوجود کے ہر پہلو، درجے اور جہت کو اردو شاعری میں تلاش کرنے اور اس کی معنویت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تصور وجود کیا ہے۔ تصور توحید ہے جو اسلام کا بنیادی اصول ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ داتا گنج بخشؒ نے لکھا ہے کہ توحید کا مفہوم خدا نے خود ہی واضح کر دیا ہے قرآن کریم میں آیا ہے کہ (ترجمہ) ”تمہارا صرف ایک معبود ہے۔“ تم دو معبود نہ بناؤ بلاشبہ وہ معبود ایک ہے۔“ اور کہو اے محمدؐ ”اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کے بعد حضرت علی ہجویری نے تصور توحید کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ توحید تین قسم کی ہے۔ اول حق تعالیٰ کی توحید اسی کے لیے۔ یہ حق تعالیٰ کا علم ہے کہ وہ اکیلا ہے۔ دوم توحید حق مخلوق کے لیے۔ یہ خدا کا علم ہے کہ اس نے بندہ کے دل میں توحید پیدا فرمائی۔ سوم مخلوق کی توحید خدا کے لیے۔ یہ مخلوق کا علم ہے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ساتھ۔ لہذا جب بندہ حق کے ساتھ عارف ہو جاتا ہے تو وہ اس کی وحدانیت پر حکم کر سکتا ہے۔ حضرت جامیؒ نے نفحات الانس میں توحید کے چار مراتب بیان کیے ہیں یعنی توحید ایمانی، توحید علمی، توحید حالی اور توحید الہی انھیں مدارج کو حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ نے توحید شریعت، توحید طریقت، توحید معرفت اور توحید حقیقت کا نام دیا ہے۔ یہ چونکہ اردو شاعری میں تصور توحید کے بعض مراتب کا جمالیاتی اظہار ہوا ہے اس لیے مختصر ان مراتب کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ توحید ایمانی میں لا الہ الا اللہ کا اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب ضروری ہے جس کا مفہوم لا معبود الا اللہ بھی ہے

۱۔ کشف المحجوب (مترجم) غلام معین الدین نعمی، نوری بکڈپو لاہور ص ۲۶۷، ۲۶۸۔

۲۔ تذکرہ غوثیہ۔ سلطان بکڈپو حیدرآباد ص ۱۳۰، ۱۳۱۔

اس منزل میں عابد و معبود کے درمیان حجابِ غیریت حائل رہتا ہے۔ لیکن شرکِ جلی سے نجات مل جاتی ہے اردو شاعری میں یہ تصور ملتا ہے مثلاً ۵

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا      حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا  
اس مستعزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے      کیا تاب گذر ہوئے تعقل کے قدم کا  
بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن      آباد بھی ہے تو ہے گھر دیر و حرم کا  
ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب سے      اور دل میں بھر دسہ ہے تو ہے تیرے کرم کا

خواجہ میر درد

نمایاں کر دیا اس نے بہارِ روئے خنداں کو      کہ دی نغمہ کو مستی رنگ کچھ صبح بہاراں کو  
ہاں آنے لگا خوبی داے جانِ دلبری      تو نے حیات بخش دی ہے صبح بہار کو

اصغر گوٹروی

خواجہ میر درد کے اشعار میں خدا کی وحدت کے اقرار کے ساتھ اپنی عبدیت کا احساں بھی کار فرما ہے اور اسی کو کائنات کا مبداء و سرچشمہ اور معبود تصور کیا گیا ہے نیز اس کی صفاتِ جمالی کا عرفان بھی کار فرما ہے۔ اس کے اوصاف کے لکھنے میں عجز کا اقرار کرنا اسی کو لوح و قلم کا خداوند قرار دینا، اس کی مستعزت تک تعقل کے قدم کا گزرنہ ہونا، اسی سے دیر و حرم کا آباد ہونا اور اسی کے سایہ میں شیخ و برہمن کا بسنا، اسی کے خوف سے جی کا لڑنا اور اسی کے کرم پر بھر دسہ کرنا محض یوں ہی نہیں بلکہ ان اشعار میں اسلامی تصورِ توحید، شاعرانہ حسن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اصغر کے اشعار میں اسی نغمہ کو مستی اور صبح بہار کو رنگ عطا کرنا اور بہارِ روئے خنداں کو نمایاں کرنا، نیز اسی نگارِ خوبی و جانِ دلبری کا صبح بہار کو حیات بخشنے کا عرفان بھی تصورِ توحید کا دلکش شری الہا ہے جس پر رنگِ مجاز غالب ہے اردو شاعری میں توحیدِ ایمانی اور توحیدِ شریعت کا رنگ بہت گہرا اور روح پرور ہے۔



توحید علمی میں صوفی خدا کے سوا کسی کو موجود حقیقی نہیں سمجھتا جو منظر ہر اور موجودات اپنی ذات، صفات اور افعال کے ساتھ نظر آتے ہیں ان کا انحصار خدا کی ذات صفات اور افعال پر ہے اس منزل میں صوفی کائنات کے تمام منظر ہر کو خدا کے نور کا پرتو سمجھتا ہے اور ان میں جمال خداوندی کا نظارہ کرتا ہے۔ یہ فنا ہے غیریت کی پہلی منزل ہے۔ ابد و شاعری میں توحید علمی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔

مثلاً

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا      خورشید میں بھی، اس کا ہی ذرہ ٹھہر تھا۔ (درد)  
جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا      تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا (درد)  
بحرکت ہے کائنات کو تیرے ذوق سے      پرتو سے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے وغالب  
ان اشعار میں اس کے حسن سے ہر نور کا مستعار ہوتا، خورشید میں اس کا ذرہ ٹھہر ہوتا، جگ میں ادھر ادھر دیکھنے کے باوجود اسی کا نظر آنا، کائنات کو اسی ذوق سے حرکت ہونا، اور آفتاب (حقیقی) کے پرتو سے ذرہ میں جان ہونا تو حید علمی کا منظر نامہ ہے چونکہ اس منزل میں صوفی کے دل پر انوارِ الہی کا نزول ہوتا ہے اس لیے جلوؤں کی فراوانی کی وجہ سے یہ مقام حیرت بھی ہے چنانچہ ان کے جلوؤں کی حیرت فزائیوں پر روح پرور اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً:

اللہ رے ان کے جلوؤں کی حیرت فزائیاں      یہ حال ہے کہ کچھ نہیں آتا نظر مجھے  
ترے جلوؤں کے آگے ہمت شرح و بیاں رکھ دی      زبان بے نگہ رکھ دی نگاہ بے زباں رکھ دی  
اک عالم حیرت ہے فنا ہے نہ بقا ہے      حیرت بھی یہ حیرت ہے کہ کیا جانے کہ کیا ہے  
جز دل حیرت آشنا اور کو یہ خبر نہیں      اک مقام ہے جہاں شام نہیں سحر نہیں  
نمودن کو حیرت میں ہم کیا کیا سمجھتے ہیں      کبھی پردہ سمجھتے ہیں کبھی جلوہ سمجھتے ہیں  
اتنا سا یہ حیرت کا کرشمہ نظر آیا،      جو کھٹاپس پردہ سر پردہ نظر آیا۔  
اصر گوندوی

توحیدِ حالی کی منزل میں صوفی کی نگاہ سے اپنی ذات اور کائنات معدوم ہو جاتی ہے اور اس پر جمالِ خداوندی کا انکشاف ہوتا ہے۔ صوفی جمالِ خداوندی میں اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مشاہدہ کو بھی خدا کا مشاہدہ تصور کرتا ہے۔ صوفیائے عقیدہ کے مطابق سالک کو اس منزل میں شرکِ خفی سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ وہ کیفیت ہے جہاں صوفی کے لیے مشاہدہ حق میں خلقِ حجاب نہیں بنتی اور مشاہدہ خلق میں حق حجاب نہیں بنتا یعنی وہ حق میں خلق کو اور خلق میں حق کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ اردو شاعری میں یہ رنگ بھی نظر آتا ہے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے      میراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس شمار میں (غالب)  
اس عالم تصویر کو دیکھا تو یہ دیکھا      میری ہی نظر محو ہے، میری ہی نظر میں (فانی)  
انتہا دید کی یہ ہے کہ نہ کچھ آئے نظر      کیف بے رنگی حیرت ہے نظر کی مواج (اصغر)  
ترا جلوہ، ترا انداز، ترا زو قِ نمود      اب یہ دنیا نظر آتی نہیں دنیا بھگو (اصغر)  
اصل شہود و شاہد و مشہود کو ایک سمجھنا، عالم تصویر کے نظارہ کو اپنی نظر کی اپنی ہی نظر میں  
محویت قرار دینا، دید کی انتہا پر کیف بے رنگی حیرت کا احساس ہونا، دنیا کو اسی کا جلوہ۔  
اسی کا انداز اور اسی کا ذوقِ نمود قرار دینا توحیدِ حالی کا تصور ہے۔

توحیدِ الہی میں صوفی خیال کرتا ہے کہ جس طرح ذاتِ باری تعالیٰ ازل میں تھی کہ اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ اسی طرح آج بھی ہے کہ اس کے سوا کچھ نہیں اور اسی طرح مستقبل میں رہے گی کہ اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ یعنی وجود و موجود ایک ہے اور حق ہے۔ اور حق کے سوا کچھ نہیں۔ یہی توحیدِ وجودی ہے۔ توحیدِ وجودی کا نقطہ آغاز توحیدِ علمی کا تصور تھا اور نقطہ مروج توحیدِ الہی ہے۔ توحیدِ وجودی کا سرخفی ”ہمہ دوست“ اور اصول ”ہمہ موجودات یکہ وجود حق دانستن“

ہے اس تصور میں حقیقت اعلیٰ ذات اور صفات کی حامل ہے اس نے مرتبہ قدیم یا باطن میں سر مو تبدیلی نہ فرماتے ہوئے مرتبہ ثانی یعنی خارج میں ظہور فرمایا ہے۔ وہ مرتبہ ذات میں واحد اور مرتبہ صفات میں کثرت ہے۔ اس طرح جو موجود ہے وہی وجود ہے اور جو وجود ہے وہی موجود ہے یعنی ذات اور کائنات کے مابین رشتہ غیریت نہیں بلکہ رشتہ یحیئیت ہے۔ اردو شاعری میں یہ انداز فکر اپنی پوری دلربائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

تجھ سوا بھی جہاں میں کچھ ہے (در) جسم و جاں گرد وہیں پر ہم ایک ہیں (ر) ہوں تو میں شمع مگر بجھیں بے پردے والے کا (قانی) تلاش چشم حقیقت نگر نہیں ہے مجھے (ر) پردہ پر مصور ہی تنہا نظر آتا ہے (اصغر) جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے (ر) نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ (اقبال) "لا" کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا (اقبال) ہو گیا سارا زمانہ تو ہی تو میری طرح (میکیش) کروں میں کس طرف پشت کس کی سمت سجود (ر)

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے ہووے کب وحدت میں کثرت سے خلل حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری یہ جستجو ہے کہ ہے عالم مجاز کہاں جو نقش ہے ہستی کا دھوکہ نظر آتا ہے سو بار ترادامں ہاتھوں میں مرے آیا خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زنجاری نفی ہستی کرشمہ ہے دل آگاہ کا چھایا عالم پتیر رنگ و بو میری طرح ہر ایک رُخ تراخ ہے ہر ایک سمت تری ذات

ان اشعار میں تجھ سوا جہاں میں کچھ نہ ہونا، کثرت سے وحدت میں خلل نہ آنا، حسن ذات اور عشق، صفت ہونا نیز شمع کا پردہ نہ اور پردہ کا شمع ہونا، تلاش چشم حقیقت نگر سے انکار کرنا بلکہ عالم مجاز کی جستجو کرنا، پردہ پر تنہا مصور کا ہی نظر آنا اور ہر نقش دھوکا دکھائی دینا، سو بار اس کے دامن پر ہاتھ ڈالنا لیکن ہر بار اپنا ہی گریباں ہاتھ میں آنا، زمان و مکان کا نہ ہونا اور صرف لا الہ الا اللہ کا عرق نہ ہونا "لا" کے دریا میں



اللا اللہ کا موتی نہاں ہوتا۔ اس کا رنگ دلو کے عالم پر میری طرح چھا جانا اور سارا زمانہ میری طرح تو ہی تو ہو جانا نیز ہر رخ ہر سمت، اسی کا رخ اور اسی کی ذات ہونا وجودی انداز فکر ہے۔ اردو شاعری میں جہاں موجود کو وجود قرار دیا گیا ہے اور اس کو حق کہا گیا ہے وہ اسی نظریہ کا اثر ہے۔

وجود سے موجود تک کا سفر، قطرہ کے گہر بننے کا عمل ہے حضرت محی الدین ابن عربیؒ نے اس کو ایک مخصوص نظام فکر بنا دیا ہے۔ اس نظام فکر کے دو دائرے ہیں: ایک الہیہ اور دوسرا کونیہ۔ بقول میکش اکبر آبادی دائرۃ الہیہ میں وجود کا مرتبہ احدیت، مرتبہ وحدت اور مرتبہ فاعدیت شامل ہے۔ دائرۃ کونیہ میں مرتبہ ارواح، مرتبہ امثال اور مرتبہ اجسام شامل ہے۔ آخری مرتبہ انسان کا ہے یہ سب مراتب کا جامع ہے۔ وجود کے اس درجہ بدرجہ موجود بننے کے عمل کا نام تنزلات ہے۔

— مرتبہ احدیت مرتبہ ذات ہے جو اپنی ذات سے ہر نسبت اور ہر قید سے پاک ہے یہاں تک کہ مطلق کی قید سے بھی پاک ہے۔ اردو شاعری میں یہ عالم نظر آتا ہے۔

میں وہاں ہوں جہاں نہیں میں بھی      عالم و ماورائے عالم کیا دفائی

مکان و لامکان کوئی نہیں ہے      جہاں میں ہوں وہاں کوئی نہیں ہے (عنوان چشتی)

عالم اور ماورائے عالم کی نفی کر کے اس کیفیت کو محسوس کرنا جہاں شاعر خود موجود ہونے کے بعد بھی موجود نہیں ہے یا مکان اور لامکان کی نفی کر کے وہاں خود کو محسوس کرنا جہاں کوئی نہیں ہے منزل احدیت ہے۔ جو اپنی ذات سے ہر قید اور ہر نسبت سے پاک ہے۔

مرتبہ وحدت بھی مرتبہ ذات ہے لیکن یہ علم اجمالی کی منزل ہے یعنی یہ مرتبہ ہے

جہاں حق تعالیٰ کو اجمالی طور پر اپنی ذات اور صفات کا علم ہے۔ مرتبہ واحدیت بھی مرتبہ ذات ہے لیکن یہ علم تفصیلی کی منزل ہے۔ یہ وہ مرتبہ ہے، جہاں اسم اللہ کا ظہور ہوا ہے اور اسے اپنی ذات صفات نیز مظاہر کا علم جزئیات کے ساتھ ہے۔ اسی علم تفصیلی کا نام ”اعیان ثابتہ“ بھی ہے وہ صورتیں جو تخلیق عالم سے پہلے علم الہی میں تھیں ”اعیان ثابتہ کہلاتی ہیں اور کائنات اور اس کے مظاہر ”اعیان خارجہ“ ہیں یعنی جو مرتبہ عینیت میں ذات مطلق ہے اور مرتبہ علم میں ”اعیان ثابتہ“ ہے، وہی مرتبہ اجسام میں ”اعیان خارجہ“ ہے۔ ————— ظہور ذات کے یہ تینوں درجہ علم الہی ہیں اپنی ذات سے قدیم ہیں اور غیر فانی نیز ناقابلِ تغیر ہیں۔ ”وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ ”اللہ ہر شے کا جاننے والا ہے“ اس پر دلالت کرتا ہے اس سلسلہ میں حضرت محی الدین ابن عربی کا ارشاد ہے:

”علم حق تین طرح کا ہوتا ہے (۱) علم ذاتی اس میں حق تعالیٰ خود ہی عالم خود ہی معلوم اور خود ہی علم ہے چونکہ حق تعالیٰ سب کا منشأ اور اصل ہے اس لیے اس نے جب خود کو جان لیا تو سب کو جان لیا (۲) علم فعلی۔ ذات حق سے بدرجہ فیض اقدس تمام اشیاء کے حقائق و صورت قبل خلق علم الہی میں نمایاں ہوتے ہیں اگر یہ علم نہ ہو تو حق تعالیٰ کے افعال اضطراری اور بے اختیار ہوتے اور اشیاء کو پیدا کرنے کے بعد جاننا لازم آئے گا جو مستلزم جہل حق ہے جو محال ہے۔ (۳) علم انفعالی تمام اشیاء کو پیدا کرنے کے بعد عالم شہادت میں شہود ہوتا ہے علم ذاتی اور علم فعلی خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں یہ

حضرت محی الدین ابن عربیؒ کا یہ خیال بھی ہے کہ معلومات حق یا اعیان ثابتہ کا مرتبہ ارادۂ تخلیق سے پہلے کا ہے یعنی اعیان ثابتہ غیر مخلوق ہیں۔ اعیان ثابتہ اور حقائق اشیاء ظہورات اعمار الہی کے امکانات ہیں یہ تمام مراتب یعنی احدیت، وحدت اور

واحدیت ”کن“ یعنی ارادہ تخلیق سے پہلے کے ہیں۔ اس لیے داخلی الہی اور قدیم ہیں۔ اردو شاعری میں ”اعیان ثابتہ“ یا معلومات الہی کی تجلیاں بھی ملتی ہیں۔  
 مہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیسرا اعیان میں مظاہر ظاہر ظہور تیسرا (در)  
 آنکھیں جو ہوں تو عین ہے موجود ہر جگہ بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ (میر)  
 آگے عالم عین تھا اس کا اب عین عالم ہے وہ

اس وحدت سے یہ کثرت سہیاں میر اسب گیان گیا (میر)  
 ان اشعار میں اس کے نور کا مہیتوں کو روشن کرنا، اعیان علم کی مظاہر یعنی اعیان  
 خارجہ کہنا اور اسی کو ظہور ظاہر بنانا، موجود کو عین اور اسی کا جہاں میں موجود بالذات  
 ہونا یا عالم کو اس کا عین اور اس کے عین کو عالم قرار دینا اعیان ثابتہ اور معلومات الہی  
 کی منزل ہے۔

وجودی فکر میں ”کن“ وہ لمحہ ہے جہاں ایک طرف وجود اور دوسری طرف موجود  
 ہے یا ایک طرف ذات اور دوسری طرف کائنات ہے (ارواح، امثال اور اجسام) علم  
 الہی کا ظہور خارجی ہے حق تعالیٰ نے وجود خارجی کی تخلیق لفظ ”کن“ سے کی ہے کن  
 امر کا صیغہ ہے، جس کے معنی ہیں ہو جا اور کائنات وجود میں آگئی۔ عدم کی تعریف فلسفہ  
 میں یہ ہے کہ اس سے وجود نہیں ہو سکتا۔ وجود کی تعریف یہ ہے کہ معدوم نہیں ہو سکتا  
 اس لیے باری تعالیٰ نے نہ عدم محض سے تخلیق کائنات کی اور نہ ہی وجود کو وجود ہونے کا  
 حکم دیا۔ ابن عربیؒ کے مطابق خدا نے ”اعیان ثابتہ“ پر لفظ کن کے ساتھ تجلی فرمائی اور  
 وہ خارج میں ظہور پذیر ہو گئے۔ اس سلسلے میں صوفیاء کا عقیدہ ہے کہ  
 تخلیق کائنات کا سبب اللہ تعالیٰ کی ”خواہش خود بینی“ ہے جس کے پس پردہ محبت  
 کا فرما ہے۔ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا جب میں نے چاہا کہ  
 میں پہچانا جاؤں تو میں نے کائنات کی تخلیق کی چونکہ خود بینی کے لیے آئینہ ضروری تھا  
 اس لیے حق تعالیٰ نے کائنات کو تخلیق کیا اور اسے اپنے جمال کا آئینہ بنایا۔ یہ آئینہ



تین مرتبوں پر مشتمل ہے یعنی عالم ارواح، عالم امثال اور عالم اجسام پر۔ اردو شاعری میں ”خواہش خود بینی“ اور محبت کا عجیب و غریب تصور ملتا ہے۔ مثلاً:

عکس شخص اس آئینہ میں جلوہ فرما ہو گئے      ان نے دیکھا آپ کو ہم اس میں پیدا ہو گئے (رد)  
عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصوٰر بے مثل      ہائے کیا صورتیں پردہ میں بنائے میاں (میر)  
لایا ہے میرا شوق مجھے پردہ سے باہر      میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں (ر)  
دہر جز جلوہ کینا کی معشوق نہیں،      ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود ہیں (غالب)  
ہو بھی چکے تھے دام محبت میں ہم اسیر      عالم ابھی اسیر زمان و مکان نہ تھا۔ (فانی)  
عشق ہے پر تو حسن محبوب      آپ اپنی ہی تمنا کیا خوب (ر)

ان اشعار میں آئینہ میں اس کی خود بینی سے عکس شخص کا پیدا ہونا، جس مصوٰر کا عالم آئینہ ہے اس کا پردہ میں صورتیں بنانا، خلوتی راز نہاں کو شوق کا باہر لانا، حسن کی خود بینی سے خلقت کا وجود ہونا اور دہر کو کینا کی معشوق کا جلوہ قرار دینا، دنیا کے بقیہ زمان و مکان ہونے سے پہلے ہی آپ اپنی محبت میں اسیر ہو جانا، عشق کو اپنی تمنا کے صلہ میں حسن محبوب قرار دینا قائل وجودی فکر ہے اور ارادہ تخلیق نیز ”خواہش خود بینی“ کا جمالیاتی اظہار ہے۔

اردو شاعری میں عشق بھی ایک زبردست محرک کی صورت میں اکبر ہے۔ دل نے عشق مجازی و حقیقی کو شغل بہتر کہا ہے پیر کا خیال کہ سارے عالم میں عشق بھر رہا ہے۔ تصوف میں عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ ہے۔ وجودی فکر میں تو مجاز عشق کا خارجی اور حقیقت داخلی رُخ ہے۔ یہ ایک نامیالی قوت ہے جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں جاری و ساری ہے۔ اردو شاعری میں اس کی زنگارنگی کا جواب نہیں ملتا مثلاً:

محبت نے خلعت سے کاڑھا ہے نور      محبت نہ ہوتی نہ ہوتا ظہور  
محبت مسبب محبت سبب      محبت سے آتے ہیں کارِ عجب

میر تقی میر، مثنوی شعلہ عشق۔

کچھ حقیقت نہ پوچھ کیا ہے عشق      حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق  
عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں      بے محمد کہیں علیؑ ہے کہیں  
عشق عالی جناب رکھتا ہے      جبرئیلؑ و کتاب رکھتا ہے

عشق حاضر ہے اور غائب ہے عشق ہی منظر العجائب ہے  
میر تقی میر: مثنوی معاملات عشق

ان اشعار میں محبت کا ظلمت سے نور کا ڈھٹنا، محبت کے سبب ظہور حق ہونا، محبت کو سبب اور مسبب قرار دینا اسی نظریہ کا شاعرانہ اظہار ہے اور عشق کو خدا، نبی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اس کو حاضر و غائب اور منظر العجائب تصور کرنا وجودی فکر کا اظہار ہے اور عشق کو تخلیق کائنات کا محرک قرار دینا ہے۔

اقبال کے یہاں تو عشق خودی کی روح بن کر نمودار ہوا ہے جس میں وجودی فکر کی پرچھائیاں بھی شامل ہیں۔ اقبال نے اپنی نظم ”شمع اور شاعر“ میں کہا ہے۔  
صبح ازل جو حسن ہوا دستان عشق آواز کن ہوئی پیش آموز جان عشق  
یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ اک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ  
مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی شام فراق صبح کتنی میری نمودگی (اقبال)  
اقبال نے ان اشعار میں آواز کن کو پیش آموز جان عشق اور حسن کو دستان عشق کہا ہے۔ اور حجاب وجود سے اپنی نمود کی صبح کو شام فراق قرار دیا ہے اس میں وہی نظریہ تخلیق کائنات کا رفرما ہے جس کا محرک عشق اور خواہش خود بینی ہے۔

صوفیاء کا عقیدہ ہے کہ موجودات متحرک اور متغیر ہیں۔ عالم ہر آن فنا ہوتا ہے اور ویسا ہی دوسرا پیدا ہو جاتا ہے لیکن ظاہر میں نگاہ کو اس کا فنا ہونا اور موجود ہونا دکھائی نہیں دیتا۔ چونکہ تغیر موجود یعنی اعیان خارجہ میں ہوتا ہے، جو حادث ہے اور أعراض کا مجموعہ ہے۔ اس لیے یہ تغیر بھی حق تعالیٰ کی تجلی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ مرتبہ قدیم یعنی باطن میں اعیان ثابتہ پر تجلی فرماتا ہے تو اس تجلی سے اعیان خارجہ وجود میں آتے ہیں۔ یہ سلسلہ برابر جاری ہے ”کے کرازل سے تا بہ ابد ایک آن ہے“ کے مصداق عمل تخلیق جاری ہے۔ تجلی کا عمل مسلسل۔ ”تجلی کو تکرار نہیں ہے۔ حق تعالیٰ ایک عین پر دوبار تجلی نہیں فرماتا

اور ایک ہی صورت میں دو اعیان پر تجلی نہیں ہوتا۔ حضرت محمد الدین ابن عربیؒ نے ظہور تجلی کو ”عطایائے الہی“ کہا ہے اور اس کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی ”عطایائے ذاتیہ“ جو ہمیشہ تجلی الہی سے ہوتے ہیں۔ یعنی اعیان ثابۃ پر اسما و صفات کا ظہور ہوتا ہے دوسری ”عطایائے اسمائے“ جن پر تجلی الہی عین ثابۃ کی استعداد اور امتزاج کے

مطابق ہوتی ہے۔ انھوں نے تجلی کے اظہار کو تجلی ذاتی، تجلی صفاتی اور تجلی فعلی بھی کہا ہے۔ اس نظر پر یہ کہ تجدد و امثال کہتے ہیں۔ خواجہ میر دردؒ نے تجدد کو دو طرح کا بتایا ہے۔ پہلا تجدد اضافی جو مادیت سے مخصوص ہے اور حدوث زمانی کی طرح ہے جس سے مراد اعیان خارجہ ہے۔ دوسرا تجدد حقیقی جو حدوث ذاتی کی طرح تمام ممکنات کو حاصل ہے ممکنات سے مراد علم الہی اور اعیان ثابۃ ہے۔ یہ مختصر آئیہ کہ حق تعالیٰ مظاہر میں نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان میں زندگی کی لہریں کر دھڑکتا ہے اور ہر تغیر تبدیلی اور حرکت اسی سے ہے ”کل یوم یجئ بھوتی شان“ ہماری ہر روز نئی شان ہے۔ اس پر ہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ اردو شاعری میں یہ نظریہ تجدد و امثال بھی ملتا ہے۔

ہر آن ہیں واردات دل پر	آتا ہے یہ قافلہ کہاں سے (درد)
آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز	پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں (غالب)
ہے تجلی تیری سامان وجود	زرہ بے پرتو خورشید نہیں (م)
گر کون دمکان منظر نیرنگ نہ ہوتا	ہر آن میں اس کا یہ نیا ڈھنگ نہ ہوتا

(شاہ نیاز بریلوی)

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون و اقبال  
ان اشعار میں ہر آن دل پر کی واردات کا نازل ہونا، آرائش جمال سے فارغ نہ

۱۔ نصوص الحکم (مترجم) عبدالقدیر صدیقی الکتاب لاہور ۱۹۷۹ء ص ۱۲۵۔

۲۔ علم الکتاب ص ۱۳۳۔



ہوتا اور ہمیشہ نقاب (کائنات کی جہت داخلی) میں آئینہ پیش نظر رکھنا، اس کی تجلی سے سامان وجود ہونا، ذرہ کا لیے پر تو خورشید نہ ہوتا، کن فیکون کا مظہر نیرنگ ہوتا اور باری تعالیٰ کا ہر آن نیا ڈھنگ ہوتا اور مادہ صمغے کن فیکون کا آنا اور کائنات کی تخلیق اور تشکیل مسلسل کا عرفان ہونا اسی نظریہ کا شاعرانہ اظہار ہے بعض اشعار میں یہ افکار گہرے رنگ مجاز کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں۔

یہ کون برق تجلی ہوا ہے آفت جاں کہ ایک دم نہیں جھٹلے اب قرار مجھے  
کیا فیض بخشیاں ہیں رخ بے نقاب کی ذروں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی  
رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی شعاعیں کیا پڑیں رنگت کھر آئی گلستاں کی  
(راصنہ)

ان اشعار میں کسی برق تجلی کا آفت جاں ہوتا اور جوں شعلہ بے قرار ہوتا، صفی بے نقاب کی فیض بخشوں سے ذروں میں آفتاب کی روح دوڑ جاتا، رخ رنگیں کی تبسم ہائے پنہاں کی موجوں یعنی شعاعوں سے گلستاں کی رنگت کھر آنا ظہور تجلی اور تخلیق مسلسل کا انکارانہ اظہار ہے۔ ابن عربی کے فلسفہ میں تہذیلات کے آخری مدارج عالم ارواح، عالم امثال اور عالم اجسام ہیں۔ عالم ارواح غیر مرنی ہے۔ عالم امثال خواب ہے، عالم اجسام عالم رنگ و بو ہے۔ ابتدائی تین مراتب، مرتبہ احدیت، وحدت اور واحدیت علم الہی کے مراتب ہیں۔ اور آخری تین مراحل یعنی عالم ارواح، امثال اور اجسام بالترتیب خارجی مراتب ہیں۔ عالم اجسام عالم رنگ و بو ہے جس میں کائنات اور اس کے تمام مظاہر شامل ہیں۔ انسان تمام اسرار الہی اور صفات کا حامل ہے اس لیے حاصل کائنات ہے۔ ابن عربی کے نقطہ نظر کی روشنی میں اگرچہ حق تعالیٰ خالق اہد کائنات مخلوق ہے لیکن یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے، خدا عالم ہے اور کائنات معلوم، نیز دونوں کے مابین رشتہ غیرت نہیں رشتہ عنیت ہے۔ کائنات یا وجود حقیقت اعلیٰ یا وجود کے خارجی رخ اور داخلی رخ حقیقت

اعلیٰ کے داخلی رخ کا عکس ہے اور کائنات یا موجود کا ہر منظر اعیان ثابتہ کا خارجی روپ ہے۔ جو اعیان ثابتہ کی استعداد اور مخصوص تقاضوں کے ساتھ مظاہر کی شکل میں جلوہ گر ہے اس لیے کائنات کی کثرت سمندر کی موجوں کی طرح عین وحدت ہے۔ یعنی وجود و موجود ایک ہے اور حقیقی اور واقعی ہے نیز جو کچھ ہے حق ہے حق کے سوا کچھ نہیں ہے لیکن حفظ مراتب کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ ”گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی“۔ اس لیے یہ غلط ہے کہ تصوف ایک متنی فلسفہ یا نظریہ ہے۔ نیز یہ بھی غلط ہے کہ تصوف کائنات اور موجود کو شر اور قابل ترک قرار دیتا ہے۔ واقعہ ہے کہ تصوف کا یہ نظریہ کائنات (موجود) تقدیس اور انسان کی عظمت پر اصرار کرتا ہے۔ اور انھیں قابل ترک نہیں قابل قدر اور قابل تسخیر قرار دیتا ہے۔ اُردو شاعری میں کائنات کی تقدیس اور انسان کی عظمت کا جہاں جہاں ذکر ہے اس پر تصوف کا اثر ہے۔ تصوف اگرچہ ایک روحانی، وجدانی اور اخلاقی انسان کے وجود پر اصرار کرتا ہے مگر اس کے مادی، شعوری اور نفسیاتی وجود کی نفی بھی نہیں کرتا۔ بلکہ ایک مکمل انسان کا تصور پیش کرتا ہے جو الجھیل کے یہاں انسان کامل اور اقبال کے یہاں ”مرد مومن“ کی شکل میں نظر آتا ہے اُردو شاعری میں اس انداز کا دلکش تصور کائنات اور تصور انسان پایا جاتا ہے۔ مثلاً ۵

سر سری ہم جہان سے گزرے	ور نہ ہر جا جہان دیگر تھا (میر)
یاں بلیل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول	گلگشت سر سری نہیں ہے اس جہان کا (در)
بہار ساقی ہے بزم گلشن، ہیں مطربانِ چمن شرابی	پیالہ گل سرسبز شیشہ، شراب بواہر کلی شرابی

سراج

ہے مثل نمودِ سور پر وجودِ بحر یان کیا دھرا ہے قطرہ و موج و سرب میں (غالب)

ان اشعار میں ہر جا جہان دیگر دیکھنا، اس جہان پر عبرت سے آنکھ کھولنا، بہار کو ساقی، بزم کو گلشن، گل کو پیالہ، سرسبز کو شیشہ، بو کو شراب اور کلی کو شرابی قرار دینا

اور نمودِ صورت پر وجودِ سحر کا انحصار ہونا وجودی فکر کا مثبت رویہ ہے۔ اب یہ شرط پڑھیں۔  
 خدا بندے میں آکر یوں نہاں ہے کہ جوں بوگل کی گل کے درمیاں ہے (دلی)  
 حسن تھا پردہ تجرید سوں سب سے آزاد طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ (دہلی)  
 جیوں گل شگفتہ رو ہیں سخن کے چمن میں ہم جیوں شمع سر بلند ہیں ہر انجمن میں ہم (دلی)

مت سہل ہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تیرا منی پہ شیخ ہمارے نہ جائیو  
 دو عالم سے کچھ پیسے ہے نظر آہ کس کا دل و دماغ ہوں میں (دہلی)  
 ہر چند کہ آہن ہوں پہ آئینہ بنا ہوں (دہلی)  
 ان اشعار میں خدا کا بندہ میں یوں نہاں ہونا جوں بوگل میں، حسن کا پردہ تجرید سے  
 آکر انسان کی صورت میں طالبِ عشق ہونا، سخن کے چمن میں گلوں کی طرح شگفتہ ہونا اور  
 ہر انجمن میں شمع کی طرح سر بلند ہونا، فلک کی برسوں کی کاوش کے نتیجہ میں انسان کا خاک  
 کے پردہ سے نکلتا۔ انسان کے گناہ آلود دامن کے پھوٹنے سے فرشتوں کا وضو کرنا،  
 انسان کا دونوں عالم پر نظر رکھنا، اور انسان کی کدورت کا بھی منظر صفا ہونا، انسان کی  
 عظمت، بزرگی اور تقدس کا رزمیہ ہے۔ یہ انسان خالص روحانی، وجدانی اور اخلاقی  
 انسان ہے جو اپنے مادی، شعوری اور نفسیاتی وجود کی بھی نفی نہیں کرتا۔

اس تجزیہ کا یہ حاصل ہے کہ

- (۱) اسلام کا بنیادی اصول توحید ہے۔ توحید کی چار قسمیں ہیں۔ ایمانی، علمی، حالی اور الہی۔ توحیدِ ایمانی کی فلسفیانہ تعبیر کا نام توحیدِ وجودی ہے۔
- (۲) علمِ الہی کے تین مراتب ہیں: احدیت، وحدت اور وحدت۔ وحدت کی منزل معلومات الہی کی تفصیلی صورت ہے۔ جو عیانِ ثابۃ کہلاتی ہے۔



(۳) محرک تخلیق جذبہ خود بینی اور عشق ہے۔

(۴) اعیان ثابۃ تجلی الہی اور اسماء الہی سے جلوہ گر ہوتے ہیں، جس کا نام تجد و امتداد ہے۔ تجلی الہی سے اعیان ثابۃ اپنی استعداد اور اقتضائے مطابق خارج میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔

(۵) تنزیلات کے خارجی مراتب میں عالم اربعہ، عالم درجہ، عالم اجسام ہیں۔ کائنات مقدس اور انسان عظیم ہے۔ اور یہ سب کچھ حق ہے۔ انسان ان سب مراتب کا جامع ہے۔ تصوف ایک روحانی، اخلاقی اور وجدانی انسان کا تصور پیش کرتا ہے جو ادنیٰ شعوری، درحقیقت انسان کی بھی نفی کرتا ہے۔

(۶) اردو شاعری میں یہ سارے مراحل جمالیاتی انداز سے ملتے ہیں۔ جس سے ایک طرف اردو شاعری کا کینوس بہت وسیع ہوا ہے جس پر نئی معنویت کی بصیرت رقص کرتی ہے اور دوسری طرف ایسی جمالیاتی تسکین بھی ملتی ہے، جس کی نظیر عام طور پر نہیں ملتی۔

## قرآن اور تصوف

مؤلف جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔ اے۔

تصوف اور اس کی تعلیم کا اصل مقصد عبودیت اور الوہیت کے مقامات کا تعین اور ان کے ربط و تعلق کا حصول ہے اور ظاہر ہے کہ پسند مختلف قسم کی ذلتوں اور گمراہیوں کا رجحان بن کر رہا ہے۔ مؤلف نے کتاب وسنت کی روشنی میں تمام الجھنوں اور نزاکتوں کو مزاوت و نشیں اور عالمانہ پیرایہ میں واضح کیا ہے۔ نزاع میں تصوف کے بارے میں کہیں مقدمہ ہے۔ صفحات ۱۸۰، متوسط تقطیع طبع، فیسٹ، قیمت مجیدہ ۱۶/۱۲/۱۲ پتہ:-

مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۷

# دورہ انگلستان کے تاثرات

آئمۃ الرحمن صاحب محسنی - علی گڑھ

گزشتہ موسم گرما میں تقریباً ڈھائی ماہ تک مجھے انگلستان میں قیام کرنے کا موقع ملا۔ وسطی اور جنوبی انگلستان کے متعدد شہروں قصبوں سے گزر ہوا کہیں کہیں رک کر گھومنے پھرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ زیر نظر جائزہ میں صرف چند خوش آئند حقائق و تجربات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو ایک مسلمان کی حیثیت سے میرے مطالعہ میں آئے اور جن کو ایک امید افزا دور کا پیش خیمہ سمجھا جاسکتا ہے۔

انگلستان کی پریس رپورٹوں کے مطابق اب اس ملک میں اسلام کے نام لیواؤں کی آبادی پندرہ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ چار سو ساجد کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ ان سب مسجدوں میں ۲۴ گھنٹوں میں پانچ بار یا نماز بلند اذان کی آواز گونجتی ہے۔ کثیر تعداد میں مسلمان پنجگانہ نماز ادا کرنے کے لیے ان مسجدوں میں جمع ہوتے ہیں۔ وہاں کے اخباروں میں اس کا بھی ذکر دیکھا کہ تخمینہ کے مطابق عیسائی مذہب کے پیرو سال میں صرف ایک بار کرسمس کے موقع پر تقریباً ۱۱ لاکھ کی تعداد میں مختلف چرچوں میں جمع ہو پاتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ گزشتہ بیس سال میں انگلستان کی سرزمین پر اسلام کا اثر درسونغ بڑی آب و تاب سے بڑھا ہے۔

انگلستان میں مسلمان زیادہ تر تبدیل سکونت سے جمع ہوئے ہیں اور انہوں نے وہاں کے سماجی اور تہذیبی حالات پر نمایاں اثر ڈالا ہے۔ ان کے رہن سہن و روحانی اقتدار اور پسندیدہ کردار نے انگریزوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ آپس کے میل جول نے ان تک اسوۂ حسنہ کی روشنی پہنچائی۔ جس نے ان کے دلوں میں اسلامی آداب سیکھنے کا جذبہ پیدا کیا۔ اب وہاں نو مسلم انگریزوں کی تعداد مقامی جرائم کے اندازہ میں (سچا س ہزار کے قریب بھی جاتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو برضا و رغبت اسلام کے دائرہ میں آئے ہیں۔

میرے قیام کے دوران ہی انگلستان کی ایک مشہور صحافی خاتون (پولی ٹائن بی) کا ایک مضمون گارڈین کے ہفتہ وار رسالہ جولائی کے شمارہ میں چھپا تھا جو غیر جانبداری کے اعتبار سے حقیقت افزہ ہے۔ وہ جنوبی لندن کے ایک مکان میں دونوں مسلم خواتین سے ملی تھیں اور اس بنا پر ان کا انٹرویو سپر دقلم کیا تھا۔ پولی ٹائن بی کو ان خواتین نے بتلایا کہ وہ اپنی شادیوں سے پہلے ہی حلقہ اسلام میں داخل ہو چکی تھیں اور جب ہی سے لباس کے سلسلے میں وہ دونوں شعار اسلامی کی پوری پابندی کرتی ہیں۔ بعد میں ان کی شادیاں بھی مسلم حجاب کی تجویز کردہ جگہوں پر انجام پائیں۔ دونوں اب کئی کئی بچوں کی مائیں ہیں اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اسلامی قدروں کی حدود میں کر رہی ہیں۔

یہ دونوں مسلم خواتین (نعمہ اور سکینہ) ڈھیلے ڈھالے لباس پہنے ہوئے تھیں۔ سر پر سے چادر لاکر چہرہ کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ دیکھ کر کوئی بھی ان دونوں کو ایرانی یا مصری مسلم خواتین سمجھ سکتا تھا۔ صرف ان کی شستہ انگریزی کی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ خواتین انگلش ہیں۔ ان کی نشست و برخاست میں بھی اسلامی تہذیب کے آداب نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے تھے۔ ان سے جب تک کوئی مخاطب نہ ہوتا وہ سنجیدگی سے خاموش بیٹھی رہتیں۔ سوال کا مناسب جواب دیتیں اور عام طور پر اجنبیوں سے بات چیت کرنے میں تامل کرتیں۔ جیسے کہ وہ چاہتی ہوں کہ ان کے مرد اس کام کو انجام دیں دریافت کرنے پر ان کے ذاتی حالات کا علم ہوا۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

نعمہ: جن کی پیدائش، تعلیم و تربیت کیمبرج میں ہوئی تھی، ان کی والدہ جرمن کنیتھولک تھیں۔ ان کا انگلستان کے چرچ سے متعلق تھے۔ اور ہوائی افسر تھے۔ تقریباً پانچ سال پہلے نعمہ کیمبرج میں ہی ایک سکریٹری کی پوسٹ پر کام کر رہی تھیں۔ اس زمانہ میں اتفاقاً طوع پران کی ملاقات سوڈان کے ایک مسلم حامیان سے ہو گئی۔ نئے ملاقاتیوں کے عادات و اطوار۔ ان کے مذہبی معتقدات میل جول کے غیر رسمی اور پر خلوص انداز ایسے تھے جن سے وہ بہت متاثر ہوئیں۔ مغربی سوسائٹی کی ادنیٰ اور رسمی خوش اخلاقی سے بالکل مختلف نعمہ نے بتلایا کہ وہ لوگ بہت ہی شریف، منکسر المزاج اور



جستجو تھی۔ انھوں نے ہی مجھے قرآن شریف کے ... انگریزی ترجمہ کی ایک جلد بطور ہدیہ دی۔ اس کتاب مقدس کے مطالعہ سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ہی صراطِ مستقیم ہے اور اس کا پیش کردہ نظام حیات ایک مکمل آئین ہے۔ اس کے بعد مجھے اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا اور میں نے عیسائیت سے اپنا رشتہ منقطع کرنے کا اعلان کر دیا اور اپنی ایک مسلم دوست کا نام نعیمہ اپنے لیے تجویز کیا۔

سکینہ : یہ لنکا ٹائر کی رہنے والی ہیں۔ ان کی زندگی مذہبی قدروں سے کبھی بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ وہ یونیورسٹی کی طالبہ تھیں اور بی بی طرزِ زندگی کو اپنا چکی تھیں۔ ان کو ایک جہانگرد بی بی کی طرح مرا کو جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے دوران قیام میں ہی وہ اسلامی تہذیب و معاشرت سے واقف اور متاثر ہوئیں۔ اپنے جذبہ تجسس کے زیراثر انھوں نے مرا کو میں بہت سے علم دوست لوگوں سے اسلام کے بارے میں۔ اس کی تعلیمات اور نبوی زندگی کی تنظیم کے بارے میں بہت سے سوالات کیے۔ ان کا کہنا ہے کہ تسلی بخش جوابات پاکر میرے دل و دماغ پر اسلام کے فلسفہ ثابت ہو گئے۔ یونیورسٹی کے انھوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنے رہن مہن اور لباس میں اسلامی طور طریقوں کو اپنا کر نمایاں تبدیلی پیدا کر لی۔ یونیورسٹی کے طلباء و طالبات اور قصداً و قدر نے رد عمل کے طور پر تحقیر اور اجتناب کا رویہ اختیار کیا۔ چنانچہ وہ اس نام نہاد تعلیم ہی سے دست بردار ہو گئیں جس کا طرہ امتیاز الحاد و انکار تھا اور جو دانشوری کے لیے شرط لازم کا درجہ رکھتی تھی۔ اس وقت ان کے مسلمان دوستوں نے ملیشیا کے ایک دیندار مسلم کا شادی کے لیے پیام پیش کیا جو منظور کر لیا گیا اور شادی کی اسلامی رسم ادا کر دی گئی۔ سکینہ اب شعائر اسلام کی پوری پابندی کے ساتھ اپنے خاوند اور بچوں میں بید مسرور زندگی بسر کر رہی ہیں۔

برطانوی سرکار نے لندن میں ایک مرکزی ادارہ قائم کیا ہے جس کو برطانوی مسلمانوں کی انجمن کہتے ہیں۔ (The Association for British Muslims) اس انجمن کا قیام ۱۹۷۳ء میں کیا گیا تھا۔ ابتدا میں یہ دوستوں کی غیر رسمی سی انجمن تھی لیکن اب یہ

ایک ریسرڈ (Association) ہے جس کا باقاعدہ دستور بنایا جا رہا ہے جو رفاہ عام اور تعلیمی تنظیم پر مشتمل ہے۔

انجمن کے روح رواں ایک نو مسلم انگریز رضی عبداللہ ہیں۔ پہلی ہی نظر میں آپ ان کو ایک پابند شریعت دینی رہنما پائیں گے مضبوط قوی اور شرعی ڈاڑھی رکھنے والا یہ مرد مومن ڈھیلا ماسفیکر تا اور ٹٹوں سے اونچا پا جامہ پہنے سر پر عربی عمامہ باندھے ایک جانے پہچانے مسلمان کا سراپا معلوم ہوتا ہے۔ گفتگو کیجیے تو یہ شستہ مذاق رکھنے والا پاک فطرت انسان نور ایمان کی روشنی سے انور معلوم ہوتا ہے۔ ملت اسلام کا یہ بہادر رہنما ہی اپنی معاش کے لیے اسٹوک نیوٹنگٹن (Stoke Newington) میں کتب سلاہیہ کی ایک دکان لگاتا ہے۔ ہفتہ کے دن رضی عبد اللہ ریسرچنٹ پارک لندن کی مسجد میں بچوں کو درس قرآن دیتے ہیں۔ بچوں سے وہ بے پھلکے انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ خاص مذاہمہ انداز میں کبھی کبھی وہ مسلمان بچوں کو تنبیہ کرتے سنے گئے ہیں کہ ”دیکھو پیسے بچہ قرآن پاک پڑھنے کے ساتھ ساتھ گرتے رہو۔ اس دن آداب نہ کیجئے تو تم کو عید نہ ملے گا“۔

رضی عبداللہ قبیلہ سلاہیہ سے ہیں۔ ان کے معمولی بہن بھائی ماجر تھے اور ساتھ ساتھ بشور ایجنٹ کا کام بھی کرتے تھے۔ ان کی ساری تجارتی سرگرمیاں بحری طائرین کے رہائشی علاقہ سے دایسہ بھیس تفریبا پانچ سال قبل ساغہ گیش اسلام ہوئے اور اس روحانی تبدیلی نے ان کی کایا پلٹ کر دی۔ یمن، من، دھن سے دینی خدمت میں ایسے مصروف ہوئے گویا ایک راستہ بھولے ہوئے تھے۔ اب ان کو منزل مل گئی ہے۔

رضی عبداللہ کے قریبی ساتھیوں میں ایک اور انگریز نو مسلم داؤد رلیف ہیں۔ یہ اب بھی زیورات اور جواہرات کے تاجر ہیں قبول اسلام سے قبل لندن میں ان کا شمار صف اول کے منکرین میں ہوتا تھا۔ ایک اور ساتھی محمد عیسیٰ ہیں برٹش لائبریری میں ترکی اور فارسی زبان کے مخطوطات کے ماہر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور اہم معادن

یوسف اسلام میں جو کیٹ اسٹیونس (Cat Stevens) نامی مغنی کی حیثیت سے بہت مشہور و معروف رہ چکے ہیں۔

برطانوی مسلمانوں کی انجمن کے کام اور برطانوی ملت اسلامیہ کی تعلیم و تربیت کا مرکز وہ اسلامی ادارہ ہے جو عرصہ سے رجینٹ پارک کی مسجد میں سرگرم عمل ہے۔ جمعہ یا ظہر کی نماز کے وقت وہاں مسلمانوں کا بڑا اجتماع ہوتا ہے کیونکہ دن میں زیادہ تر لوگ پرانے لندن کے کاروباری علاقوں میں کام کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ اس مجمع میں عربی یا ایشیائی مسلمان تو آپ کو انگریزی یا نصف انگریزی لباس میں نظر آسکتے ہیں مگر انگریز نو مسلم زیادہ تر عربی قسم کا جیٹ پہن کر ہی نماز کے لیے آتے ہیں۔ خطبہ میں رضی اللہ عنہ کو یہ وضاحت کرتے سنا گیا ہے کہ برطانوی مسلمانوں کی انجمن کسی سیاسی جماعت یا کسی مسلم ملک کی اندرونی سیاست سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف اسلام کے روحانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔ یہاں صرف اسی درس حیات کی تعلیم ہوتی ہے جو نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سو سال پہلے بنی نوع انسان کی دینی اور دنیوی بہبود کے لیے ہر خاص و عام کو سنایا تھا۔ اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہوئے وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ۱۹۷۷ء میں وہ اسلام لائے تھے۔ ان کے بھائی نے ان کو کلام پاک سے متعارف کرایا تھا۔ اس وقت تک وہ دنیاوی عیش و عشرت سے پوری طرح لطف اندوز ہو چکے تھے مگر روح مطمئن نہیں تھی۔ گویا وہ ایک بوزنہ کی مانند ایک درخت سے دوسرے درخت۔ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھلنا لگتے رہے تھے کہ شاید اطمینان کی جگہ ملے۔ مگر اس مسلسل کود بھانڈ کے باوجود سکون قلب میسر نہیں تھا اور جستجو کی یہ آخری جست تھی جہاں آخر کار قرآن کے مطالعہ سے حیات ابدی کی راحتوں کا سراغ میسر آیا ہے۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ بوزنہ نہیں انسان ہوں اور خود کو پہچاننے لگا ہوں۔

اسی طرح کیٹ اسٹیونس یعنی یوسف اسلام بھی اب اپنا زیادہ وقت مسجد میں گزارتے



ہیں۔ اور انگلستان کی ملت اسلامی کی فلاح و بہبود کے منصوبوں کو کامیاب بنانے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک ترک مسلمان خاتون سے شادی کی ہے اور عنقریب پہلے بچے کے باپ بننے والے ہیں۔ انھوں نے خوش دلی کے ساتھ کہا کہ اپنی زندگی کی ذمہ داری اختیار کرنے کی صلاحیت مجھ میں کہاں تھی میں تو گانے کے ریکارڈوں کی ترتیب اور گانے بجانے کی محفلوں کے اہتمام ہی کو اپنا تمام وقت دیتا تھا اور اسی کو اپنا بڑا کارنامہ تصور کرتا تھا۔ بھلا میں اگلی نسل کے وجود اور اس کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں سنجیدگی سے کیا سوچ سکتا تھا؟ بسف اسلام اب پوری طرح یقین رکھتے ہیں کہ زن و شو کا مقدس رشتہ قائم کرنے اور اس کے آداب قرآن پاک کے اہم موضوعات میں سے ہیں۔

ایک اندازہ مسلمہ رقیہ لٹا تھا اس نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عہد نو کی ترقی یافتہ سوسائٹی میں عورت کی آزادی پر بہت زور دیا گیا ہے لیکن اگر فکر سے کام لیا جائے تو یہ معلوم کر لینا دشوار نہیں ہوگا کہ یہ انسان دوستی کی مانگ نہیں ہے بلکہ اس آزادی میں جنسی بے راہ روی کے تقاضے پوشیدہ ہیں۔ اسلام عورت کو کہیں زیادہ باعزت زندگی بسر کرنے کا حق دیتا ہے۔ عزت نفس کے ساتھ دنیا میں رہنے اور عمر گزارنے کے امکانات ہیا کرتا ہے۔ مغربی تہذیب کی اس دور کی بیماری یہ ہے کہ وہ ہر طرف سے بے راہ روی کے دروازے داکر نا چاہتی ہے۔ اچھائی برائی کو ابھاد میں ڈال کر ایک عام انتشار پیدا ہو گیا ہے جس سے اب ہم اسلامی طرز زندگی اختیار کر کے ہی نجات پاسکتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ ”میں خدا ہوں“ جو کچھ میں سمجھتا ہوں اس پر کوئی روک نہیں لگائی جاسکتی۔ یا تو ہم کیا رنگی ایسا روحانی سکون حاصل کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں جہاں کوئی پابندی، خشقت اور محنت نہ ہو۔ یا پھر ہم جسم اور مادہ کی لذت کے علاوہ دوسرے اعلیٰ اقدار کے ایک سرے سے منکر ہو جاتے ہیں۔

بہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انگلستان میں ایک مضبوط اسلامی معاشرہ کی شروعات ہو چکی ہے۔ لندن، منچسٹر، نوٹنگھم اور ریڈ فرڈ جیسے شہروں کے رہائشی علاقوں اور بازاروں میں اور اسی طرح

شاید دوسری جگہوں پر بھی) اسلانی کاروں کے نقشِ قدیم صاف نظر آتے ہیں۔

مسلمانوں کی دونوں کے نوکیسوں کے شیشوں پر جابجا اردو، انگریزی میں اعلانات نصب نظر آتے ہیں۔ ان میں مواعظ، مذاکرات، سیرت کے جلسوں، مجالس میلاد وراثت، عیدوں کے انعقاد کی اطلاع درج ہوتی ہیں۔ اندر جائیے تو مانوس آواز کے ساتھ ”اسلام علیکم“ اور ”علیکم السلام“ کے خوشگوار کلمات سنائی دیتے ہیں۔ مسلم اتحاد اور ملی خدمت کی مسکراہٹیں بکھر جاتی ہیں۔ اہم روزہ فرد۔ میرے دوران قیام میں رمضان شریف کا بارگاہِ برکت ہمیشہ بھی آیا۔ اس زمانہ میں وہاں طلوع و غروب کا فاصلہ بہت ہو چکا تھا۔ اگر مطلع صاف ہو تو صبح کے ۴ بجے سورج اپنی پوری آب و تاب سے نمودار ہو جاتا تھا۔ اور رات کے دس بجے غروب ہوتا تھا۔ لیکن باوجود دن کی اس صبر آزمائی کے مسلمانوں کی بڑی تعداد نہایت ذوق و شوق سے تریضہ رمضان ادا کر رہی تھی۔ سوچنے کا مقام ہے کہ ایک ماہ تک صبح ۳ بجے سحر کھا کر ۸ گھنٹے پورے صبر و سکون سے گزار کر روزہ افطار کرنا اور معمول کے مطابق تمام دنیاوی کاروبار ہمیشہ کی طرح انجام دینا ان مومنین کے لیے کس قدر صبر آزمایا ہو گا۔

آخر میں نہایت افسوس کے ساتھ کچھ ایسی باتوں کا ذکر کر رہا ہوں جو ضروری ہیں جن کے تذکرہ کی تدبیر سمجھدار مسلمانوں کو سونپنا چاہیے۔

وہ یہ کہ شہروں کی کچھ مسجدوں میں باہمی اختلافات ظاہر ہونے لگے ہیں۔ بعض جگہ یہ اختلافات سنجیدہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ سننے میں آیا کہ ایک شہر میں ایسا جھگڑا عدالتی چارہ چوٹی تک پہنچ گیا ہے جس قصبہ میں ہم مقیم تھے وہاں کی مسجد میں ایک روز کسی نماز کے وقت دو جماعتوں میں تصادم کی نوبت آگئی تھی جس کے نتیجہ میں مقامی پولیس کو مداخلت کرنی پڑی اور بعض امن کے خطرہ کے تحت مسجد میں تاملے ڈال دیے گئے۔

اس قسم کے نا معاقبت اندیش نہ افعالی پر قابو پانے کا کوئی راستہ پیدا کرنا از بس ضروری ہے۔ غیر جانبدار ہمدردانِ ملت کو ان مسائل کی طرف فوری توجہ کرنے کی ضرورت ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ اگر اس قسم کے مسائل اکثر پیش آتے رہے تو غیر مسلم آبادی افراد کی اس کمزوری کو مسلم معاشرہ کی کوتاہی

اکتوبر ۱۹۸۱ء

# مَصْنُوعَاتِ دینی و علمی و دینی ماہنامہ

## برپا آں

قیمت سالانہ : بیس روپے

مُرَاتَبِع  
سعد احمد کسرا بادی



# برہان

جلد نمبر ۸، فی الحجۃ السکۃ ۱۴۲۷ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۶ء، شمارہ نمبر ۴

نظرات

محمد عبداللہ طارق

۲

مقالات

۱۔ خلافت ارض اور علماء کی ذمہ داریاں

جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی ۵  
ناظم فرقان نیو اکیڈمی۔ بنگلور۔

۲۔ دور جدید میں اسلامی قانون (فقہ)

انز پر وفیسر سجاد احمد اکبر آبادی ۲۵

۳۔ قاضی ضیاء الدین ستانی (م ۱۹۷۹ء)

از جناب مولوی محمد ارشد صاحب اعظمی (مفہم ناس) ۳۷

ایک اجمالی تعارف

فاضل مدرسہ وصیۃ العلوم خاتقاہ النہ آباد۔

۴۔ اسلام اور قومی یک جہتی۔

از مولوی سعد صاحب اسرار سی (فاضل دیوبند) ۴۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

# نظرات

ہمارا موجودہ دور اس لحاظ سے تاریخ میں بڑا عجیب و غریب دور ہے کہ ابر میں جہاں ایک طرف اسلام کو دنیا کے مختلف طبقات بنظر استخسان دیکھ رہے اور اس کی خوبیوں اور کمالات کا اعتراف زبان اور قلم سے کر رہے ہیں یہاں تک کہ اپنے مذہب کو چھوڑ چھوڑ کر اسلام کے دامن امن و سلام میں سکون پا رہے ہیں دوسری طرف خود اسلام کے نام لیا آلس کے قاذورات، سیاسی اختلافات، گروہی عصبیت، جماعتی تخریب، بین الاداراتی انتشار و افتراق، برادر کشی اور خدا جاننے کن کن نفسیاتی، اخلاقی اور روحانی بیماریوں میں مبتلا ہیں جس کسی نے یہ کہا تھا کہ ”مذاہب میں بہترین مذہب اسلام ہے مگر قوموں میں سب سے بہت اخلاق کی حامل قوم مسلمان ہے“ اس نے کچھ بہت غلط بات نہیں کہی تھی، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جس قبیل کے حامل ایسے لوگ ہوں اور اس کے باوجود لوگ اس پر پروانہ دار ٹوٹ پڑتے رہیں اگر اس کے حامل حقیقتہً اسلام کے کمالات سے متصف ہوتے تو کس قدر تیزی سے اس کا نور اقصائے عالم میں پھیل جاتا — شاید خدائے تعالیٰ کو یہی منظور ہے کہ اسلام اپنی مقبولیت، اثر انگیزی اور سحر آفرینی کے لیے کسی قوم کی باندہ اخلاقی کارہن منت نہ رہے بلکہ وہ اپنے کمالات کا اعتراف اپنے ہی بل بوتے پر کرائے۔

ہم اگر اپنی بیماری تلاش کریں تو محسوس ہو گا کہ ممالک، جماعتیں، ادارے، ملی طبقات اور افراد بھی کی بیماریاں کم و بیش یکساں ہیں، ہم اپنے مقصد کی سچی لگن، اس کے حصول کے لیے فانیّت، ریمان داری، خود اعبادی، خلوص، مخالف کی رائے کا احترام، قوتِ صبر و برداشت اور تعلق مع اللہ کی نعمتوں سے محروم ہیں۔ بے مقصد کوشش، رسمی مشاغل، دل کا کھوٹ، اپنی بات کی پیچ، دوسروں کی اندھی تقلید، خود غرضی اور خدا ہیزی ہماری زندگیوں میں عام ہے، ہم خود کو سنبھالنے کے لاکھ جتن کریں اور کتنی ہی تدبیریں سوچ لیں ان بیماریوں کو دور کیے بغیر ہم اپنی حالت سدھار نہیں سکتے، امام جلیل اور بطلی خواہ صداقت امام احمد بن حنبلؒ نے ملت اسلامیہ کی نبض پر انگلی رکھ کر بڑی پی ٹی ایک رائے دی تھی جس کی صداقت روز بروز عیاں سے عیاں تر ہو رہی ہے کہ

لن یصلح آخر هذه الامة الا ما صلح به اولها۔ اس وقت کے پچھلے بھی صرف اسی چیز سے کامیاب ہو سکتے ہیں جس سے ان کے اگلے کامیاب ہو چکے ہیں۔ ۵۰  
اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر  
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی

ہر بھٹوں کا قبولِ سلام ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک بہت خاص اور اہم واقعہ ہے جس پر طرح طرح سے ظہار خیال کیا جا رہا ہے ہم مسلمانوں کے لیے اس واقعے میں مسرت سے زیادہ بغرت کا پہلو ہے۔ کسی اداسے کے ملازمین بیک وقت اسے چھوڑ کر چلے جائیں، کسی تنظیم کے بہت سے ارتقا، ایک دم سے اس سے الگ ہو جائیں، یا کسی مذہب کے پیرو اس مذہب کو خیر باد کہہ دیں تو یہ بات یاقینی ماندہ لوگوں کے لیے سخت تکلیف دہ اور قلبی اذیت کا باعث ہوتی ہے، مگر اس کا تجربہ ہر شخص اپنی اپنی ذہنی پرواز، سلامتی طبع اور فکر کی بلندی یا پستی کے مطابق کرتا ہے۔

سطحی اور عامیانه ذہن رکھنے والوں نے اس واقعہ کی وجہ سے دوسروں پر سازش کرنے اور ہر بھٹوں پر ناجائز و غیرہ کے الزامات عائد کیے جس کو ہماری حکومت کی حقیقت میں نگاہ نے تحقیقات کی روشنی میں بے بنیاد قرار دیا۔ کسی کسی طرف سے یہ آواز بھی آئی کہ اچھا ہوا یہ بوجھ ہمارے معاشرے سے ملتا، مگر حقیقت خناس اور انصاف پسند ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد نے اس واقعے کو حقیقت پسندی کی منظر سے دیکھا، انھوں نے بے جھجک تسلیم کیا کہ کوئی لالچ، کوئی دیا ویا کوئی بیرونی عمل نہیں بلکہ اس کا واحد سبب ہندو معاشرے کا اپنا نقص ہے، اس کی حد سے بڑھی ہوئی، وسیع پنج، ادنیٰ ذاتوں پر غلی ذاتوں کے مظالم اور پھر صدیوں سے تسلسل کے ساتھ اس کا باقی رہنا اس حادثہ کا سبب بنا ہے، ایک انگریزی ہفتہ وار کا ریڈیٹر جس کے قلم نے ہمیشہ مسلمانوں پر زہر کے پھینٹے برسائے لطف لیا ہے وہ بھی حق و انصاف کی بات کہے بغیر نہ رہ سکا اور اس نے اپنے ایک مضمون میں حسب عادت بہت سی قابل اعتراض اور اشتعال انگیز باتوں کے ساتھ یہ اعتراف کیا کہ اسلام کی اپنی خوبیاں اور گونا گوں کمالات ہی ہیں جو لوگوں کو ہمیشہ اپنی طرف کھینچے رہتے ہیں، اس نے ایک انگریزی سیاح کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ اس کشش و قوت کا راز اسلامی جمہوریت ہے اور خاص طور پر ہندوستان میں جہاں قبولِ اسلام ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے ذات پات کی لعنت سے نجات مل سکتی ہے۔“

بھٹی کے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار نے ایک مضمون ایم کے رخصتیش کے قلم سے ہر بھٹوں کے



اجتہاد قبول اسلام کے بارے میں شائع کیا ہے جس میں مضمون نگار نے اس واقعے کا بہت عمدہ اور صحیح تجزیہ کیا ہے، وہ لوگ اب نئے مذہب میں آکر کیا محسوس کرتے ہیں، انھوں نے مذہب تبدیل کر کے کیا پایا اور ان کا یہ اقدام کیسا رہا اس پر اس نے نہایت معتدل اور درست اظہار رائے کیا ہے، اس نے اس بات پر حیرت ظاہر کی ہے کہ ڈاکٹر امبیدکر نے اپنے ساتھیوں کو لے کر اسلام کے بجائے بدھ مت کیوں اختیار کیا؟ حالانکہ اس سے انھیں کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوا، صرف بدھ ہرچجن ہو گئے اور ان کے ساتھ اعلیٰ ذات والوں کا یرتاؤ بدستور پہلا سا ہی رہا۔

شکر اچاریہ صاحبان نے اس واقعے سے بے چین ہو کر اعلیٰ ذات والے ہندوؤں کو جو مشورے دیے ہیں کہ وہ ہرچجنوں کے ساتھ رواداری، نرمی اور مہربانی کا سلوک کریں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے مضمون نگار نے بہت صحیح لکھا ہے کہ ”اب یہ کوشش بعد از وقت ہے، یہ لوگ اسطبل کے پھاٹک اس وقت بند کرنے چلے ہیں جبکہ گھوڑے وہاں سے باہر نکل چکے ہیں“ وہ لکھتا ہے کہ ”ہرچجنوں نے اس وقت یہ فیصلہ کر کے درحقیقت نہایت دوراندیشی اور عقل و بصیرت کا ثبوت دیا ہے“

مضمون نگار نے مستقبل کے ایک اندیشے کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ”ہو سکتا ہے ایک پشت یا دو پشت تک لوگ، جنھیں نو مسلم ہرچجن کہتے ہیں لیکن ایک ہی دونسل کے بعد رفتہ رفتہ وہ دیگر مسلمانوں کے شانہ بشانہ اور مساویانہ مقام حاصل کر لیں گے“ وہ دیکھتا ہے ”عرصہ ہوا کیرالا کے ایک ہرچجن مصلح لیڈر نے ہرچجنوں کو اسلام قبول کر لینے کا مشورہ دیا تھا مگر ہرچجن اس وقت تعلیمی پس ماندگی کا شکار تھے، وہ اس مشورے کی اہمیت نہ سمجھ سکے تھے مگر آج ان میں اپنا مستقبل خود اپنی مرضی کے مطابق تعمیر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے اور ان کے درد کا درماں اب ان کے سامنے آچکا ہے۔“

ان حالات میں ہم مسلمان خود اپنا بھی جائزہ لے لیں، کیا ہم اس قابل ہیں کہ کوئی ہمارے درمیان آکر خوش محسوس کرے؟ کیا یہ لوگ جو ابنا مذہب چھوڑ چھوڑ کر اسلام میں آ رہے ہیں، کیا ان کو ہمارے اخلاق کی خوبی، ہمارے کردار کی بلندی، ہماری شرافت و دیانت، ہماری انسان دوستی اور ہمارے اوصاف و کمالات نے اسلام کی طرف کھینچا ہے؟ کیا ہمیں دیکھ کر کوئی اسلام کی تصویر سمجھ سکتا ہے؟ افسوس کہ ایسا نہیں ہے، ہماری عادات و اطوار میں بہت کچھ اثرات اس گندے معاشرے کے شامل ہو گئے ہیں جس کو انھوں نے چھوڑ کر اسلام میں پناہ لی ہے، فردن ادنیٰ کے مسلمان لادھساس (چھوٹ چھات) سے بالکل نا آشنا تھے مگر آج ہندوستان کے مسلمان میں یہ چیز بھی اچھی خاصی آگئی ہے، خدا نہ کرے کہ ہمارے ان نئے بھائیوں کو ہمارا معاشرہ دیکھ کر مایوسی ہو۔ (باقی صفحہ ۶ پر)

# خلافتِ ارض اور علمائی ذمہ داریاں

## عصرِ جدید کا ایک اہم تجدیدی کام اور اس کی نوعیت

جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور  
(قسط دوم)

سائنس اور فلسفہ جدید کا نیا آہنگ

تصویریت یا وحدۃ الشہود :

جیسا کہ عرض کیا جا چکا فلسفہ جدیدہ کی بنیاد جدید سائنس کے مسئلہ حقائق و نظریات پر ہے اور سائنسی نظریات میں ترمیم و اضافے کے ساتھ ساتھ جدید فلسفہ کے مسائل و مباحث بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جدید سائنس نے چونکہ مادیت (Materialism) اور میکانیٹ (Mechanism) کے بے بنیاد نظریات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔ اس لیے اب

۱۔ تمام فلسفیانہ نظریات اصولی اعتبار سے چار مذاہب (اسکول آف تھماٹ) میں تقسیم کئے گئے ہیں۔  
جمہرہ ہیں۔ (۱) ثنویت یا دوئی (۲) تصویریت یا روجیت (۳) مادیت۔ اور (۴) ارتیابیت۔  
ان میں سے اول الذکر دو براہِ راست یا بالواسطہ مذاہب کے مؤید و حامی ہیں تبصرہ مواند ہے اور چوتھا نہ دوست ہے اور نہ دشمن۔

تفصیل کے لیے دیکھیے ”مذہب و عقلیات“ از مولانا عبدالباری ندوی

جدید سائنس اور فلسفہ جدید کا آہنگ "تصوریت" یا ایک "ہمہ گیر کائناتی ذہن" قرار پاتا ہے۔ اس طرح آج یہ دونوں روحانیت کے اثبات میں مذہب کے مؤید اور اس کے حامی نظر آتے ہیں۔

۱۵ نظریہ تصوریت کو سمجھنے کے لیے نظریہ ثنویت کو سمجھنا ضروری ہے اور ثنویت (Dualism) نام ہے اس چیز کا کہ کائنات میں دو بالکل مختلف اور متضاد چیزیں پائی جاتی ہیں یعنی جسم اور روح یا مادہ اور عقل و شعور۔ تمام مذاہب کی تعلیمات کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ اور ارسطو کا بھی یہی نظریہ تھا۔ اس کے برعکس تصوریت (Idealism) کا نظریہ یہ ہے کہ اصل الاصول صرف ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے روح یا عقل یا ذہن، باقی تمام عالم جسمانیات اسی کا پرتو ہیں اور مادیت کا مستقل وجود ایک قسم کا فریب ہے۔ دور قدیم میں فلاطون اکی کا داعی تھا جب کہ دور جدید میں اسپینوزا (Spinoza) لائبینیز (Leibnitz) برکلی (Berkeley)، شیلنگ (Schelling) ہیگل (Hegel) اور برگسان (Bergson) وغیرہ سب اس کے ہم نوا اور مؤید ہیں۔ مذہب میں صوفیہ اور ارباب باطن سے ان قائلین تصوریت کے ڈانڈے اس قدر مل جاتے ہیں کہ صرف حال اور حال کا پردہ رہ جاتا ہے۔ (ماخوذ از مذہب و عقلیات، ص ۱۱)

واضح رہے کہ قرآنی عقائد و تعلیمات کے مطابق "وحدۃ الوجود" کے بے بنیاد نظریہ کی صحت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں البتہ "وحدت الشہود" کا اثبات اس حیثیت سے ہوتا ہے کہ قرآن حکیم میں صفات الہی سے متعلق جتنے بھی دعوے کیے گئے ہیں ان کا ثبوت مشاہداتی طور پر اس عالم رنگ و بو میں موجود ہے جو سائنسی علوم کے تفصیلی مطالعے سے حاصل ہوتا ہے، جبکہ وہ قرآن حکیم کی ہدایات کے مطابق کیا جائے اور ان دونوں میں تطبیق دی جائے۔ لہذا اس موقع پر مجھے اسی نقطہ نظر کا اثبات مقصود ہے۔



اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب نیوٹن نے قانون تجاذب کو دریافت کیا تو مادہ پرستوں کو نظام کائنات کی مادہ پرستانہ نقطہ نظر سے توجیہ کرنے کے لیے بظاہر ایک قوی بنیاد مل گئی اور وہ سمجھے کہ اس قانون کی دریافت کے باعث عالم طبیعی اور عالم حیاتیاتی کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے، چنانچہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تحریر فرماتے ہیں:

”جب نیوٹن نے سترھویں صدی میں قانون تجاذب کا انکشاف کیا اور علم حرکت کی تدوین کی تو ان قوانین کا اطلاق نہ صرف روئے زمین پر پیش آنے والے واقعات پر کیا گیا بلکہ نظام شمسی کے سیاروں اور دوسرے مظاہر پر بھی اس کو وسعت دی گئی۔ فرانس کے مشہور ریاضی داں لاپلاس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس کائنات کی میکا نمکس ایک ہی ہو سکتی ہے اور اس میکا نمکس کو نیوٹن نے دریافت کر لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ اب اس کے بعد طبیعی سائنس میں کسی کے لیے کچھ کرنا باقی نہیں رہا۔ ۱۹ ویں صدی میں اس میکا نمکس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو گئیں کہ نہ صرف طبیعی سائنس بلکہ حیاتیاتی علوم میں بھی اس کا اطلاق کیا جانے لگا اور انسانی اعضاء بلکہ دماغ کے افعال کی توجیہ بھی میکا نمکی اصول پر ہونے لگی اور یہ سمجھا جانے لگا کہ جس سائنس کی بنیاد اس میکا نمکی اصول پر نہ ہو وہ باضابطہ سائنس ہی نہیں ہو سکتی۔“

ایک طرف تو یہ کوشش ہو رہی تھی اور دوسری طرف چند دیگر سائنس دانوں ہی کے تجربات و تحقیقات کی بدولت ایسے نتائج برآمد ہوئے کہ مذکورہ بالا مادہ پرستانہ نظریات کا قلع قمع ہو گیا اور یہ ذہنیت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی، چنانچہ ڈاکٹر موصوف تحریر فرماتے ہیں:

”علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات

انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، عین اسی زمانے میں پے درپے چند ایسے  
 تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہل گئیں اور علم طبیعیات میں  
 ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا۔ مادہ و توانائی، ذرہ اور موج، جوہر اور عنصر، زمان و مکان  
 اور علت و معلول جیسے بنیادی تصورات ہی سرے سے بدل گئے اور خود قوانین قدرت کا بھی  
 ایک نیا مفہوم لیا جانے لگا۔ ان تغیرات نے نیوٹن اور میکسول کی طبیعیات کی بجائے اس  
 جدید طبیعیات کی تشکیل کی جس کی بنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی  
 ہے۔<sup>۱</sup>

انیسویں صدی کی طبیعیات میں مادہ اور توانائی ایک دوسرے کے متضاد تصور  
 کیے جاتے تھے۔ جدید طبیعیات میں مادہ اور توانائی کا یہ اختلاف ختم ہو گیا اور تجربوں  
 سے ثابت ہو گیا کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں یعنی مادے کو توانائی  
 میں اور توانائی کو مادے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز یعنی ۱۹۰۰ء میں پلانک (Planck) نے کوانٹم  
 (Quantum) کا انکشاف کیا اور بتایا کہ توانائی اور مادی نظام کی حالتوں  
 میں تبدیلی مسلسل نہیں بلکہ ایک خاص قلیل ترین مقدار یعنی کوانٹم کے اضعاف  
 (Multiples) کے متناسب ہوتی ہے۔ اس انکشاف کے بعد قدیم ترین  
 زمانے سے طبیعی کائنات میں تغیر و تبدل کے مسلسل اور تدریجی ہونے کا تصور چلا آ رہا تھا،  
 وہ ختم ہو گیا اور اس کی وجہ سے نیوٹن کی میکانیक्स میں ایک غیر معمولی انقلاب رونما ہوا۔  
 آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت (Relativity) نے زمان و  
 مکان کے تمام قدیم تصورات کو بدل کر رکھ دیا اور علت و معلول سے متعلق جبریت

کا نظریہ بھی باطل ہو گیا، چنانچہ خود سائنس دانوں کو ہتھیار ڈالتے ہوئے سائنس کے حدود نئے سرے سے متعین کرنے پڑے۔

”سائنس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ مظاہر فطرت کی اصلی اور آخری ماہیت اور حقیقت معلوم کرے بلکہ سائنس کا کام صرف یہ ہے کہ ان اشیاء اور مظاہر میں باہمی ربط و تعلق کا پتہ چلائے۔ ڈیراک نے مثال کے طور پر کہا کہ سائنس میں یہ سوال کرنا بے معنی ہے کہ برق کی حقیقت یا ماہیت کیا ہے بلکہ صحیح سوال یہ ہوگا کہ قوت برق کا عمل کیا ہے؟“

طبعی علوم کی انہی ترقیوں کی بدولت مادیت و دہریت اور جبر و تعین کا دور اب ختم ہو چکا ہے اور تمام جدید فلاسفہ مثلاً پائی زن برگ، سر جیمز جینز، سر آرتھر ایڈنگٹن اور دہارٹ ہٹھ و غیرہ کا اس بنیادی نقطہ نظر پر تقریباً اتفاق ہو چکا ہے کہ ہماری اس کائنات میں مادیت کے بجائے بنیادی طور پر ”تصوریت“ یا ”ذہنیت“ پائی جاتی ہے اور ایک ہمہ گیر آفاقی ذہن (Universal mind) کا اثبات ہوتا ہے۔

فلسفہ تصوریت کی وہ صدا جو مشہور فلسفی برکلی (۱۶۸۵-۱۷۵۳ء) نے روحانیت کے اثبات میں اب سے کوئی دو ڈھائی سو سال پہلے بلینز کی تھی آج جدید سائنس اس کی تائید کر رہی ہے اور تمام جدید فلاسفہ اس کو چاروں طرف سے چاروں طرف سے پر محبور نظر آ رہے ہیں۔ وحدت کائنات یا کائنات کے ایک یونٹ ہونے کا یہی وہ آفاقی تصور ہے جو توحید باری تعالیٰ اور ایک واجب الوجود ہستی کے اثبات کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اسی کا نام تصوف کی اصطلاح میں ”وحدت الشہود“ ہے جو کم از کم سائنٹیفک نقطہ نظر سے ایک

لکھنؤ، مذہب و سائنس میں ختم ۳۷۷ کے لیے دیکھیے مولانا عبد الباقی ندوی کی کتاب ”مذہب و سائنس“



وجدانی اور مشاہداتی چیز ہے یعنی جو شخص مذہبی نقطہ نظر سے ایک ذات والا صفات اور فوق الطبیعی ہستی کے وجود کا قائل ہو اس کے لیے مظاہر کائنات اور ان کے تفصیلی و گہرے علم و مطالعے سے اس ذات برتر کے وجود اور اس کی صفات عالیہ و صفات کمالیہ کا نظارہ بالکل عین الیقین اور حق الیقین کے درجہ میں ہو جاتا ہے۔ لہذا وحدت الشہود یا توحید شہودی کو کماحقہ سائنٹفک نقطہ نظر سے سمجھنے کے لیے جدید سائنس کا مطالعہ ضروری ہے اور یہ حاصل ہے قرآن اور سائنس کے مطالعے کا جو کہ مقصد المقاصد ہے۔

کائنات میں صفاتِ الہی کے جلوے :

اصل میں مظاہر فطرت کے گہرے مطالعے و تجزیے سے مادہ اور روح کے درمیان فاصلے کم سے کم اور ان کے درمیان حائل شدہ پردے ہٹتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ تصور میں ایک ہی چیز دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور وہ ہے ایک عظیم اور پر جلال ہستی کی کار فرمائی اور اس کی ربوبیت والوہیت کے آفاقی جلوے جو ایک ننھے سے ایٹم سے لے کر ایک بڑے سے بڑے جرم فلکی تک ہر چیز میں جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ اب آپ اس کا نام ”وحدت الشہود“ رکھ لیجیے یا مظاہر کائنات میں ربوبیت والوہیت کا آفاقی اور ہم گیر مشاہدہ، دونوں کا حاصل ایک ہی رہے گا۔ قرآن حکیم نے جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت اور اس کی دیگر جن صفات کے اثبات کی خاطر مظاہر فطرت اور ان کے نظاموں کا مطالعہ کرنے کی جو دعوت دی ہے اس کا اصل مقصد یہی ہے۔ وہ پورے جزم اور یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک ہی رب اور ایک ہی الہ ہے اور ہر طرف اسی کی کار فرمائیاں اور جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً :

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ط لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ وہی ہے جو تمہاری رحم (مادر) میں صورت گری جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے اس کے سوا کوئی دوسرا الہ (نہ لے اور حیرتناک افعال والا) موجود نہیں ہے۔ وہی دہر چیز پر

غالب اور حکمت والا ہے۔ (آل عمران: ۶)

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ حَ وَّهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ ذَٰلِكُمْ اللَّهُ مَرَبُّكُمْ ۖ حَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۝ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ یہی ہے اللہ تمہارا رب جس کے سوا کوئی مددگار نہ موجود نہیں ہے۔ ہر چیز کا وہی پیدا کرنے والا ہے پس تم اسی کی عبادت کرو اور ہر چیز اسی کے حوالے ہے۔ (انعام: ۱۰۱-۱۰۲)

اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں جہاں پر کائنات کے مختلف مظاہر اور ان کے نظاموں کا تذکرہ کرنے کے بعد خصوصیت کے ساتھ ربوبیت والوہیت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور سورہ انعام کی جو آیتیں ادنیٰ نقل کی گئی ہیں ان سے قبل عالم سماوی اور عالم ارضی سے تعلق رکھنے والی مختلف چیزوں مثلاً چاند، سورج، ستارے، رات، دن، برود، بھر، اور خصوصیت کے ساتھ نباتات اور ان کے چند خصوصی مظاہر کا ایک جامع تذکرہ آگیا ہے۔ پھر اس کے بعد اہر کی آیات مذکور ہیں۔ اس سیاق و سباق میں ربوبیت والوہیت کے تذکرہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام نظاموں کے بیان کرنے سے اصل مقصود نوع انسانی کے ذہن و دماغ میں ربوبیت والوہیت کی حقیقت کو اتار دینا ہے۔

چنانچہ لغوی المعیار سے ”الہ“ کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ یہ آئہ یا لہ مراب سمع سے مشتق ہے یعنی وہ ہستی جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگرداں ہو جائے بلکہ امام راغب تحریر فرماتے ہیں:

”اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ لفظ آئہ سے مشتق ہے۔ یعنی حیران ہونے کے معنی میں۔ اور یہ وجہ اشتقاق امیر المؤمنین (حضرت علی رضی) کے اس قول کی بنا پر ہے کہ ”اس ذات برتر کی

لے ملاحظہ ہو سیرت النبی از علامہ سید سلیمان ندوی، ۴/۵۰۵، اعظم گڑھ۔

صفات کے بیان سے تمام بہترین صفات اور تمام زبانوں کے الفاظ بھی عاجز اور ناکافی ہیں۔ اور یہ اسی بنا پر ہے کہ بندہ جب باری تعالیٰ کی صفات میں غور کرتا ہے تو وہ حیران و سرگرداں ہوتا ہے۔ اسی بنا پر مودی ہے ”تَفَكَّرُوا فِي اللَّهِ وَلَا تُفَكِّرُوا فِي اللَّهِ“ یعنی اللہ کی کرشمہ سازیوں (اس کی صفات کمالیہ) میں غور کرو اور اللہ کی ذات میں غور مت کرو۔

اس لحاظ سے ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ کے معنی یہ ہوئے کہ اس پوری کائنات اور کل عالم رنگ و بو میں ایک ہی ایسی بستی پائی جاتی ہے جس کے افعال حد درجہ نرالے اور حیرتناک ہیں اور جن کی اصل حقیقت و ماہیت کے سمجھنے سے عہد قدیم ہی کے نہیں بلکہ عہد جدید کے تمام انسان — اپنی ہمنہ جہتی تمام علمی ترقیوں کے باوجود — عاجز و درماندہ ہیں، جیسا کہ تفصیلات پہلے باب میں گزر چکیں۔ آپ نظرِ عالم کا طبیبی (Physical) کیمیادی (Chemical) عضریاتی (Morphological) فعلیاتی (Physiological) تشریحی (Anatomical) طبی (Medical) اور نفسیاتی (Psychological) کسی بھی حیثیت سے جائزہ لیجیے آپ کو یہ ایک اٹوٹ کلیہ نظر آئے گا۔ گویا کہ ہر حیثیت سے یہ اس عالم آب و گل کی ایک مسلمہ اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے جس میں دو رائیں نہیں ہیں۔

اس طرح تمام صفاتِ الہیہ کا جب اس قدر تفصیلی طور پر مطالعہ کیا جائے تو مجموعی اعتبار سے ان صفات کمالیہ کا ایک واضح تصور مجسم شکل میں ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے گا، پھر ہماری نظریں جس چیز پر بھی پڑیں گی اس کی ظاہریت کے خول کو توڑتے ہوئے ان صفاتِ عالیہ پر مرکوز ہو جائیں گی، گویا کہ ہم ان ظاہری مظاہر کو نہیں بلکہ



ان مظاہر میں پیوستہ کمالات الہی کے جمال نیرانی کو دیکھ رہے ہیں اور اس کے آفاقی جلوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

اس مطالعے و مشاہدے سے جو ایمان حاصل ہوتا ہے وہ محض علمی اور نظریاتی نہیں رہتا بلکہ وہ مشاہداتی ہونے کی بنیاد پر وجدانی اور جذباتی بن جاتا ہے۔ گویا کہ بندہ عین الیقین اور حق الیقین کی منزل تک پہنچ چکتا ہے۔ یہ بندے کی منزل مقصود اور اس کی معراج ہے۔ جس کے حصول کے بعد اس کو کارزار حیات میں بہکنے یا منظر ہر قطرت کی بھولی بھیلیوں میں بھٹکنے کا موقع ہی باقی نہیں رہتا۔ بلکہ وہ زندگی کی ہر منزل اور مقام نشیب و فراز میں برہان الہی کی روشنی میں چلتا ہے اور "نور الہی" اس پر سایہ فگن رہتا ہے، بشرطیکہ یہ مطالعہ و مشاہدہ صحیح اور خدا پرستانہ نقطہ نظر سے اور قرآن حکیم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کیا جائے۔ ورنہ دنیا میں کتنے ایسے سائنس دان اور ماہرین علوم طبیعی موجود ہیں جو ان علوم میں ماہر ہونے کے باوجود بالکل کورے اور اندھے بہرے بنے ہوئے ہیں۔

وحدت الوجود یا وحدت الشہود

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی چند صفات عالیہ کا بیان اس طرح کیا گیا ہے:

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ سَبَّحَ سَبْعِينَ مِائَةً مِائَةً

آخر، سب سے ظاہر اور سب سے چھپا ہوا ہے۔ (حدید: ۳)

اس کی تشریح میں علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: "دنیا کی ہر چیز کا ایک اول، ایک آخر، ایک ظاہر اور ایک باطن ہوتا ہے، یہاں تک کہ ایک لحظے اور ایک نفس کا بھی بگرا اللہ تعالیٰ کی ادلیت، اس کی قدامت ہے، اس کی آخریت اس کا دوام اور بقا ہے، اس کا ظاہر ہونا اس کی عظمت و برتری ہے اور اس کا پوشیدہ ہونا اس کا قرب اور ہر چیز کا احاطہ ہے۔" لے

لے طریق: البحرین و باب السعادتین، ص ۳۸-۳۹، مطبوعہ قطر

ظاہر اور باطن کا ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے حیرت انگیز صفات و کمالات کے باعث ہر چیز میں ظاہری و باطنی اعتبار سے نمایاں نظر آتا ہے یعنی کسی بھی چیز کے ظاہر و باطن میں اسی کے کمالات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، خواہ ایک بٹے سے بڑا نظام شمسی ہو یا ایک ننھا سا جوہر یا ایٹم حتیٰ کہ ظاہری آنکھوں کو نظر نہ آنے والے ایٹم کا اگر سینہ بھی چیرا جائے تو اس میں بھی اسی کے خالق کے کمالات کی ایک پوری دنیا نظر آتی ہے جس کا کلی احاطہ کرنے سے انسانی علم و دانش عاجز و بے بس دکھائی دیتے ہیں۔

ایک دوسرے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ وہ ایک حیثیت سے بالکل ظاہر ہے گویا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور دوسری حیثیت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ حد درجہ پوشیدہ اور مخفی ہے۔ گویا کہ کسی آنکھ کو نظر ہی نہیں آتا۔

بہر حال آپ صحیفہ فطرت میں جدھر بھی نظر ڈالیے آپ کو اس کے خالق و صانع ہی کی صفات کمالیہ کے نقوش دکھائی دیں گے اور اس کی ربوبیت والوہیت تمام مظاہر پر محیط نظر آئے گی۔ گویا کہ اوراق فطرت کی حیثیت محض کٹھ پتلیوں جیسی ہے اور ان کے پس پردہ شاہ حقیقی جلوہ افروز ہے۔ یا دوسرے لغتوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ خالق کا ظہور نمایاں اور مخلوقات کا ظہور غیر نمایاں اور دھندلا سا ہے۔ گویا کہ یہ سب کسی ڈرامے کے عارضی اور غیر مستقل کرداروں کی طرح پردہ سیمیں پر کھوڑی درجہ کے لیے نظر آتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔

مگر اس بحث سے مادہ یا جسمانیات کا انکار لازم نہیں آتا، جیسا کہ فلسفہ تصوریت کے قائلین نیز اہل باطن وغیرہ نے اپنی انتہا پسندی میں اختیار کیا ہے۔ اسی طرح اس موقع پر وحدت الوجود کے قائلین کی بھی کسی بھی درجے میں تائید نہیں نکلتی۔ کیونکہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ غالی "وجودیوں" کا دعویٰ ہے اور عقیدہ ہے کہ اس پورے عالم رنگ و بو میں صرف ایک ہی وجود ہے۔ مجرد شجر، آب و خاک،

مرغ و ماہی اور جن و بشر وغیرہ تمام مظاہر اسی وجود واحد کے مختلف روپ ہیں۔ اور مومن و مشرک، نیک و بد، عادل و جاہل اور اچھے اور برے سب اس میں برابر ہیں اور اپنے ان اہل عقائد کی تائید میں قرآن اور حدیث سے (عجیب اور اچھے انداز میں) تاویل کرتے ہیں۔

نیز ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ہر وقت کھلے بندوں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اس سے انبیاء بھی کی طرح فیض رسانی پاتے ہیں اور ان میں سے بعض تو مرتبے میں اپنے آپ کو انبیاء سے بھی افضل سمجھتے ہیں اسی طرح ان میں سے بعضوں کا ادعا ہے کہ وہ ولایت و معرفت کے مقامات طے کر لینے کے بعد شرعی قیود اور پابندیوں سے بھی آزاد ہو چکے ہیں۔

روایت باری کے سلسلے میں کتاب الہی میں صاف مذکور ہے کہ اس عالم تا سوت میں کسی بھی طرح باری تعالیٰ کا مشاہدہ حاسہ بصر کے ذریعہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ اور اس پر تمام علمائے اہل سنت کا اتفاق ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ۔ نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ وہ بڑا ہی باریک بین اور یا خبر ہے۔ (انعام: ۱۰۳)

مگر ”وجودی“ حضرات کہتے ہیں چونکہ وجود واحد ہے، جس کے مظاہر مختلف ہیں اس لیے یہاں بھی رویت ثابت ہوتی ہے اور رائی و مرئی رد کیجئے والا اور دیکھا جانے والا دونوں ایک ہی ہیں۔ یعنی رب عین بندہ ہے اور بندہ عین رب۔ اللہ خود اپنے آپ کو اپنے بندوں

۱۔ تفسیر المنار، ۹/۱۳۲، دارالمعرفۃ، بیروت۔

۲۔ ایضاً ۹/۱۳۱-۱۳۲۔

۳۔ ایضاً ۹/۱۳۹۔



اور دیگر مخلوقات کی شکل میں دکھاتا ہے۔ یہ ان لوگوں کا تناقض و ہدیان ہے جو بدیہی طور پر باطل ہے۔

اس سلسلے میں علامہ رشید رضا نے ”فتوحات مکیہ“ سے ابن عربی کی ایک طویل عبارت بھی نقل کی ہے جس میں بڑا تعارض و تضاد پایا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا موصوف ایک ہی سانس میں تائید بھی کر رہے ہیں اور تردید بھی۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ملاحظہ فرمائیے :

وان نحن لم نزل فيما نرى الا انفسنا فيه وصورنا وقد رفا ومنزلتنا  
فعلى كل حال ما رأينا قد توسع فنقول قد رأيناه وتصدق كما ان  
لو قلنا رأينا الانسان صدقنا في ان نقول رأينا من مضى من الناس ومن بقى  
ومن في زماننا من كونهم انسانا لا من حيث شخصية كل انسان ولما كان  
العلم اجمعه وحاده على صورة حق ورأينا الحق فقد رأينا وصدقنا  
ہم ہمیشہ اپنے آپ کو اپنی صورتوں کو اور اپنی قدیم منزلت کو اس میں برابر دیکھتے رہتے ہیں۔  
پس اس طرح ہم کسی بھی حال میں اس کو دیکھ نہیں سکتے اور تھوڑی سی وسعت کے ساتھ ہم  
کہیں گے کہ ہم اس کو دیکھ چکے ہیں اور ہم سچ کہتے ہیں جس طرح کہ اگر ہم یوں کہیں کہ ہم نے  
انسان کو دیکھا تو ہم نے اس بارے میں سچ کہا کہ ہم نے دیکھا اس شخص کو جو گزر گیا اور اس کو  
بھی جو باقی ہے اور جو ہمارے زمانے میں ہے، اپنے انسان ہونے کی حیثیت سے نہ کہ ہر  
انسان کی شخصیت ہونے کے لحاظ سے اور چونکہ تمام عالم اور اس کے پرزے حق (تعالیٰ)  
کی صورت میں ہیں اور ہم نے حق کو دیکھ لیا ہے تو ہم نے ضرور دیکھ لیا ہے اور ہم سچ کہتے ہیں

۱۶ تفسیر المنار، ۹/۱۶

۱۷ فتوحات مکیہ، باب ۱۰، سحر التفسیر المنار، ۹/۱۶

یہ عجیب و غریب اور مغالطہ انگیز کلام نظر آتا ہے۔ اصل میں یہ ”ہمدوست“ کے فلسفیانہ عقیدے کی ترجمانی ہے، چنانچہ اس سے مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے ”لا الہ الا اللہ“ کو لاموجود ”ان اللہ“ قرار دے دیا گیا ہے جو کتاب و سنت اور عربی لغت و ادب سب کے خلاف اور من مانی تاویل ہے۔ شیعہ حضرات بھی قرآنی نصوص کی اسی طرح اوجھی اور بے سرو پاتہ دیں کرتے ہیں۔ آخر ہم انھیں کس بنیاد پر گمراہ قرار دیں؟ حصولِ توسب کے لیے ایک ہوتا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ فلسفے کی راہ سے آیا ہے اور محققین کی نظر میں یہ ایک کشفی و اشراقی چیز ہے، جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہونے کے بجائے محض ذاتی مشاہدات اور کشف وغیرہ پر مبنی ہے جو شرعاً قابلِ حجت نہیں ہو سکتا بلکہ نہایت کتاب و سنت کے مفکر ہے، چنانچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس بارے میں بڑی وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں :

۱۵ ملاحظہ ہو کتاب ”وحدت الوجود“ از سحر العلوم عبدالعلی انصاری، ص ۵۶، دہلی، ۱۹۷۱ء  
 ۱۶ ”لغۃ کشف کے معنی کھولنے یا کسی حقیقت کو واضح کرنے کے ہیں۔ فلسفہ و تصوف کی اصطلاح میں اس سے مراد سار و سرمستی کے ایسے لمحے ہیں جب کسی شخص کی محدود ”انا“ بھیب کر غیر محدود ”انا“ سے اپنا رشتہ استوار کر لیتی ہے اور عجیب و غریب حقائق و کیفیات سے دوچار ہوتی ہے“ (دعقلیات ابن تیمیہ، از مولانا محمد حنیف ندوی، ص ۲۴۲، ۳، دارۃ التفانت اسلام آباد لاہور)

۱۷ ”اس تحریک کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حق اور رفیقین کی دریافت کے لیے حواس، عقل، علم، قیاس، استقرار، برہان و استدلال قطعاً مفید نہیں۔ حصولِ صداقت کے لیے مشاہدہ شرط ہے اور یہ مشاہدہ صرف نور باطن اور اندرونی حاسہ کو بیدار کرنے سے ممکن ہے (باقی صفحہ ۱۸ پر)

”مسئلہ وحدت الوجود میں شیخ اکبر (ابن عربی) اور شیخ مجدد (حضرت مجدد الف ثانی) کا جو اختلاف ہے، وہ سب کو معلوم ہے اور دونوں بزرگوں کی تحقیق ذاتی علم اور کشف پر مبنی ہے۔“ ۱۵

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں: ”در حقیقت جیسا کہ حضرت مجدد نے لکھا ہے انسان کی قوت عقلی ہو یا قوت روحانی، کوئی قوت اس کے حواس اور خارجی مؤثرات کے اثر سے بالکلیہ آزاد نہیں۔ اس کے ماحول، اس کے افکار و عقائد اور ان مقدمات کا جو اس کے یا اس کی جماعت اور قوم کے نزدیک مسلم ہیں، اس کی تحقیقات اور مشاہدات پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشراقیوں کو اپنے کشف و مشاہدے میں بہت سے یونانی اور مصری ادہام و خیالات کی تائید نظر آتی تھی اور مسلمان اشراقیوں کو فلسفہ یونان کے بہت سے مفروضات حقیقت بن کر نظر آئے تھے۔ وہ ”عقول“ کا مشاہدہ کرتے تھے اور عقل اول سے

(حاشیہ بقیہ ص ۱) جو مادہ رائے طبیعیات کا اس طرح ادراک کرتا ہے جس طرح یہ ظاہری آنکھیں ظاہری چیزوں کا ادراک کرتی ہیں۔ اور یہ حاشیہ اسی وقت بیدار ہو سکتا ہے جب مادیت کو بالکل فنا اور حواس ظاہری کو مردہ کر دیا جائے حقائق کی تحصیل (اس طرح) نفس کشی اور مراقبہ و تفکر سے پیدا ہوتی ہے۔“ (مخلص از مذہب و تمدن ۱۰ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۵، لکھنؤ ۱۹۸۰ء)

۱۵ مذہب و تمدن، ص ۳۳، مجالس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۸۰ء  
۱۶ عقول عشرہ جو یونانی فلسفہ میں واجب الوجود ہستی ہی کی طرح قدیم اور مستقل بالذات ہستیاں تسلیم کی جاتی ہیں، جنہوں نے افلاک تسعہ کو جنم دیا۔ گویا کہ یہ ۱۹ ”معززین“ ہیں جو کارکنانِ تضاد و قدر کہلاتے ہیں۔



بعض اوقات ان کا مکالمہ اور مصافحہ ہوتا تھا۔

کشف و مشاہدہ اگرچہ شرعاً ناجائز یا ممنوع نہیں ہے بشرطیکہ وہ کتاب و سنت کے مفائر نہ ہو اور شرعی حدود کے اندر اور نصوص دین کی تشریح و تبیین میں ضمنی حیثیت رکھتا ہو، مگر چونکہ بعض صوفیہ نے غلو اور تجاوز سے کام لیتے ہوئے اس کو اولیت دے دی اور قرآن و حدیث کو ثانوی درجہ دیتے ہوئے ان کے نصوص میں طرح طرح کی تاویلیں شروع کر دیں تو علامہ ابن تیمیہؒ نے ان پر تنقید کرتے ہوئے بہت صحیح اصول بیان فرمایا ہے۔

۲۔ محدث کو اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام و تحدیث کی نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ ان چیزوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لے اس لیے کہ صوتی کبھی مقام عصمت پر فائز نہیں ہوتا جیسا کہ ابوالحسن شاذلی نے تہترج کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کی عصمت کا ذمہ تو لیا ہے، کشف و الہامات کی عصمت کا نہیں۔

انہی تمام وجوہات کی بنا پر امام ابن تیمیہؒ ابن عربیؒ پر شدید جرح و تنقید کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ یہ فاسف زدہ لوگ اپنے ادیباء اللہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے فیض یاب ہوتے ہیں اور اس بنا پر وہ اپنے آپ کو نبی سے بھی افضل

۳۔ مذہب و تہذیب، ص ۳۵۔ ۴۔ محدث وہ غیر نبی ہوتا ہے جس کے دل میں

عالم بالا سے براہ راست کوئی بات ڈالی جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ تحریر فرماتے ہیں:

”محدث عالم ملکوت کے بعض علمی خزانوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور وہاں سے وہ علوم

حاصل کرتا ہے جو حق تعالیٰ اس کو فراہم کرتا ہے، تاکہ وہ نبی صلعم کی شریعت بنے اور نبی آدم کی

اصلاح کا باعث ہو۔ یہ بات شاہ صاحب نے خاص کر حضرت عمرؓ کے بارے میں تحریر

فرمائی ہے جن کے الہامات وحی کے موافق ہوا کرتے تھے۔ دلاحظہ ہو، حجۃ اللہ البالغۃ، ۲/۹۳،

رشیدیہ دہلی، ۴۔ عقلیات ابن تیمیہؒ از مولانا محمد صنیف صاحب ندوی، ص ۳۵۰، لاہور۔

تصور کرتے ہیں لہ

اسی طرح موصوف اس سلسلے کے ایک دوسرے سرکردہ اور کٹر ”وجودی“ تلمسانی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: ”جب ان کے سامنے ”نصوص“ پڑھی گئی تو ان سے کہا گیا کہ تمہاری یہ کتاب تو قرآن کے مخالف ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ قرآن تو پورے کا پورا شترک ہے اور توحید تو ہمارے کلام میں پائی جاتی ہے۔ پھر ان سے کہا گیا کہ جب وجود واحد ہے تو پھر بیوی حلال اور بہن حرام کیوں ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک تو سب حلال ہے لیکن ان مجربوں نے کہا کہ حرام ہے تو ہم نے کہا کہ ہاں تم پر حرام ہے“ ۱۲  
قرآن حکیم منصوص اور محکم طور پر بیان کرتا ہے کہ اس عالم ناسوت میں کسی بشر کے لیے ذات باری تعالیٰ کا مشاہدہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ خود ”حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اللہ سے یہ درخواست کی کہ ”ربِّ اِمرِني“ ”اے میرے پروردگار مجھے اپنی زیارت کروا دیجیے“ تو جواب میں ارشاد ہوا کہ ”لَنْ تَرَانِي“ ”آپ ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے“ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ حکیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب یہ جواب ملتا ہے تو پھر اور کسی جن بشر کی کیا مجال ہے“ ۱۳

مگر اس کے باوجود جب حضرت موسیٰؑ نے رویت پر اصرار کیا اور باری تعالیٰ نے ایک پہاڑ پر اپنی تجلی ظاہر فرمائی تو نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کو دیکھنے کے اور محض ظہور تجلی ہی کے باعث بے ہوش ہو گئے۔  
فَإِنَّمَا تَجَلَّىٰ رُوحُكَ عَلَى الْعَجَلِ جَعَلَهُ كَا وَحَرًا مُّوسَىٰ صَعِقًا ۖ لَئِنْ لَمْ يَرَهُ لَأَخَذَهُ الْوَيْلُ ۚ

۱۲ الفرقان بین اولیاء الرحمن واولیاء الشیطان ص ۱۳، دارالافتار، ریاض۔

۱۳ ایضاً ص ۱۲۲۔

۱۴ تفسیر معارف القرآن، از مفتی محمد شفیع، ۳/ ۱۱۴ دیوبند۔

رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی فرمائی تو اس کے پرچے اڑ گئے اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ (اعراف ۱۴۳)  
 اس بنا پر ”شہودیوں“ کا نظریہ اور عقیدہ یہ ہے کہ اس عالم ناسوت میں رویت باری  
 تو کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔ ہاں البتہ ”رب اپنے بندہ مومن کے لیے دنیا میں اس کی  
 رہنمائی کے لیے غیر کامل (ایک ملکہ درجے کی) تجلی (ذاتی نہیں بلکہ صفاتی) فرماتا ہے اور  
 آخرت میں کامل تجلی فرمائے گا۔ پس اس تجلی کے باعث بندہ اپنے رب کے ماسویٰ خود کو اور ہر  
 چیز کو فانی سمجھتا ہے (دیکھو یا کہ) اس ذات واحد کے سوا کسی دوسرے (کے جمالِ بیانی کا مشاہدہ  
 ہی نہیں کر رہا ہے اور وہ اس کو محض اپنی آنکھ سے نہیں بلکہ اپنی پوری روح مدرکہ کے ذریعہ  
 دیکھ رہا ہے“ ۱۵

چنانچہ علامہ ابن قیمؒ ”مدارج السالکین“ میں تحریر فرماتے ہیں:  
 ”ان کے نزدیک نور کشف ہی شہود کا مبداء ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنی  
 (صفات عالیہ) کے معانی کی تجلیات ہیں جو قلب پر ظاہر ہوتی ہیں اور اس کی تاریکی کو روشنی  
 سے منور کر دیتی ہیں اور اس طرح کشف کا حجاب دور ہو جاتا ہے، جب تمہارا یہ حال ہو جائے  
 تو پھر تم کسی غیر کی جانب توجہ نہ کر سکو گے اور تمہارے قدم ڈگمگا نہیں سکیں گے.....  
 اس کے نور ذات کی کوئی شے متعلیٰ نہیں ہو سکتی بلکہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے (اور مخلوق کے درمیان)  
 حجاب کو دور کر دے تو پھر پورا عالم تہہ وبالا ہو جائے جس طرح کہ پہاڑ اس کی تجلی کے باعث  
 ریزہ ریزہ ہو گیا۔“

۱۵ تفسیر المنار: ۹/ ۱۶۷ یعنی بندے پر جو تجلی ہوگی وہ اس کے صفاتی نور کی ہوگی نہ کہ  
 اس کے ذاتی نور کی۔ کیونکہ اس کا نور صفاتی اس کے نور ذاتی سے نسبتاً ہلکا ہونے کی بنا پر انسان اس کا  
 تحمل کرے گا، جب کہ وہ نور ذاتی کا تحمل کسی بھی طرح نہیں کر سکتا۔ خود سورج بطور ایک مثال ہمارے  
 سامنے موجود ہے جو اس کی مخلوقات کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے مگر بایں ہمہ ہم اس کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھ  
 سکتے تو پھر اس کے خالق و مالک کے نور اور اس کی تجلیات کی تاب کہاں سے لاسکتے ہیں؟



ایک حدیث میں مذکور ہے: ”اللہ تعالیٰ سوتا نہیں ہے، اور سوتا اس کے لائق نہیں ہے۔“ وہ (بندوں کی روزی سے متعلق) میزان کو کبھی جھکاتا ہے تو کبھی اٹھا دیتا ہے۔ اس کی بارگاہ میں رات کا عمل دن سے پہلے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا حجاب نور ہے (نور کے پردے میں رہتا ہے) اگر وہ اس پردے کو کھول دے تو اس کے چہرے کی شعاعیں ہر اس مخلوق کو جلا کر خاکستر کر دیں گی جہاں تک اس کی نگاہ جائے۔

اس حدیث کو نقل کر کے موصوف تحریر فرماتے ہیں: ”پس اسلام بندے کے لیے نور ہے اور ایمان بھی بندے کے لیے نور ہے جو پہلے سے زیادہ قوی ہے۔ اور احسان (تزکیہ نفس) بھی اس کے لیے نور ہے جو ان دونوں سے زیادہ قوی ہے۔ لہذا اسلام، ایمان اور احسان تینوں جب جمع لے کیونکہ سوتا دھسے جس کو اعضاء و جوارح کے باعث تھکاوٹ محسوس ہوتی ہو۔ پھر چونکہ وہ پوری کائنات کا نگہبان ہے لہذا اگر وہ سو جائے تو پھر پوری کائنات منتشر و پراگندہ ہو جائے اور تمام اجرام سماوی باہم ٹکرا کر فنا ہو جائیں۔ (لَا تَأْخُذُكَ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ: اس کو نہ تو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ بقرہ: ۲۵۵)

۵۲ صبح مسلم، کتاب الایمان، ۱/۱۶۲، مرتبہ محمد فواد عبدالباقی، دارالافتار، ریاض، ۱۹۸۰ء  
۵۳ یہ دین اسلام کے تین مختلف مدارج اور اس کے شعبے ہیں۔ اسلام محض احکام کی بجا آوری کا نام ہے خواہ عقیدہ و ایمان کمزور رہے یا قوی۔ ایمان شک کے مقابل ہے یعنی جن جن باتوں کو عقیدے کے لحاظ سے ماننا اور تسلیم کرنا ضروری ہے ان پر پوری طرح یقین کرنے کا نام ایمان ہے اور احسان یہ ہے کہ وہ ایمان کی طرح محض عقلی و استدلال نہ رہے بلکہ دجیلانی و مشاہداتی بن جائے۔ جیسا کہ حدیث جبریل میں آیا ہے: ”ان تعبد الله کانک تراه فان لم تکن تراه فانہ یراک“ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم اتنا تصور ضرور کر لو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ اس لحاظ سے احسان عبودیت کا اعلیٰ مرتبہ اور بندہ مومن کی مزاج ہے جو اصل مقصود ہے اور یہ مرتبہ انبیائے کرام کے بعد (باقی ص ۲۳ پر)

ہو جائیں اور اللہ کے درمیان رکاوٹ بننے والے خیالات نازل ہو جائیں تو قلب و جوارح اس نور سے بھر جاتے ہیں (نہ کہ اُس نور سے جو اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے) کیونکہ اس کی صفات مخلوقات کی کسی بھی چیز میں حلول نہیں کرتیں، جس طرح کہ خود مخلوقات اس میں حلول نہیں کرتے۔ لہذا خالق مخلوق سے اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے بالکل جدا ہے۔ نہ تو ان دونوں میں کوئی (مادی و جسمانی حیثیت سے) اتحاد ہے، نہ حلول ہے اور نہ کسی قسم کا ملاپ۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک کلمہ علواً کبیراً ۱۵

حاصل یہ ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں رویت باری تعالیٰ کا مشاہدہ قرآن حکیم کی واضح نصوص کی بنا پر ممکن نہیں ہے۔ اور یہ حقائق قرآن کے محکمات میں سے ہیں۔ ان کا انکار نصوص قرآنیہ اور محکمات کا انکار ہوگا، جس کے بعد حجت و استدلال کے لیے مزید کوئی چیز باقی نہیں رہ جائے گی۔ اور جیسا کہ یہ بھی اچھی طرح واضح ہو گیا کہ رویت و مشاہدہ جو کچھ بھی ہوگا وہ صرف باری تعالیٰ کی صفات یا اس کے کالات کا ہوگا، جن کی تجلیوں سے صفات فطرت اور اس کے اوراق روشن و تابناک نظر آ رہے ہیں۔ گویا کہ ایک ایک پتے اور ایک ایک بوٹے پر خلاق فطرت کی صنعت و کاریگری کے نقوش ثبت ہیں۔ اور یہ نقوش حسب ذیل عظیم آیات قرآنی کے مطابق ”نظام تخلیق“، ”نظام تسویر“، ”نظام تقدیر“ اور ”نظام ہدایت“ کی شکل میں مرسم ہیں جن کے مجموعے کو ”نظام ربوبیت“ کہا جاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَرًا فَهَدٰی ۝

یا کی بیان کراچے رب برتر کی جس نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا پھر دان میں سے ہر ایک کے اعضا بقیہ (شیہ ص ۲۲) اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں ہی کو حاصل ہوتا ہے جو اس کے مقرب اور صدیقین و صالحین کہلاتے ہیں۔ یہ اسلامی تصوف کی صحیح غرض و غایت ہے، جس کو قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ”احسان“ کہا جاتا ہے۔

۱۵ مدارج السالکین، شرح منازل السائرین، بحوالہ تفسیر المنار، ۹/۱۶۹-۱۷۰۔

جسمانی کو درست کیا۔ اور وہ جس نے (تمام موجوداتِ عالم کے طبیعی ضوابط) مقرر کیے اور (ان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے ضابطے کے مطابق چلنے کی) توفیق بخشی۔ (اعلیٰ: ۱-۳)

سائنسی علوم کے ذریعہ جن نظام ہائے فطرت کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہ درحقیقت ربوبیت کے انہی چار بنیادی ضوابط (تخلیق و تسویہ اور تقدیر و ہدایت) کی تشریح و توجہ ہے۔ یہ مظاہر کائنات کو قرآنی نقطہ نظر سے دیکھنے کے گویا یہ چار پیمانے ہیں جن کے تفصیلی جائزے سے تمام صفات الہی کی تنقیح اس طرح ہو جاتی ہے گویا کہ وہ ہمارے سامنے مجسم و مشکل طور پر موجود ہیں اور قرآن عظیم نوع انسانی سے اسی چیز کے مطالعے و مشاہدے کا مطالبہ کرتا ہے جو کہ گوہر مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات اور کائنات کا خالق، مسوی، مقدر اور ہادی ہے، نہ کہ خود ان موجودات کے اندر گھسا ہوا یا مختلف شکلوں اور رنگوں میں ظہور پانے والا۔ وہ ان اشیاء اور موجودات سے بالکل الگ تھلگ ہے جیسا کہ قرآن حکیم کی سیکڑوں جگہ یہ شمار آتیوں سے واضح ہوتا ہے۔ نیز اس کے مانند کوئی شے نہیں ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ اُس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی شے اس جیسی اور اس کے مثل ہے ہی نہیں تو پھر موجوداتِ عالم ہی کو خدا کا وجود قرار دینا بے دلیل و بے سند اور عقلاً سخت محال ہے۔ خالق ہمیشہ خالق ہے گا اور مخلوق ہمیشہ مخلوق۔ اور یہ بات عقلاً ناممکن ہے کہ ایک شے خود ہی اپنی خالق، خود ہی اپنی مسوی، خود ہی اپنی مقدر اور خود ہی اپنی ہادی آپ ہو، جب کہ قرآن حکیم میں اس پر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اشارہ تک موجود نہیں ہے بلکہ قرآن حکیم کی تمام آیات خالق و مخلوق کی وحدت کے بجائے ان کی دوئی اور تنوید پر دلالت کر رہی ہیں۔ تفصیل کے لیے تو ایک دفتر چاہیے۔ لہذا اس موقع پر اتنی ہی وضاحت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ (باقی آئندہ)

لہذا اس موقع پر تفصیل نیز ان آیات کریمہ کی مفصل تشریح و تفسیر کے لیے راقم سطور کا مقالہ ”قرآن مجید اور حیاتیات دیکھنا چاہیے“ جو ماہنامہ البلاغ کراچی میں قسط وار شائع ہو رہا ہے۔



# دور جدید میں اسلامی قانون (فقہ)

اثر: پروفیسر مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مترجمہ: ڈاکٹر مولوی ماجد علی خاں علیہ جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

(دوسری قسط)

مجتہد کون ہو سکتا ہے؟ | یہاں پر اب ایک اہم سوال ابھرتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر اس قسم کی تبدیلیوں کا میزان تبدیلیوں کی تصدیق و توثیق کا حق کس کو حاصل ہے مجتہد امید ہے کہ مسلمانوں میں اس معاملہ میں دورائیں نہیں ہو سکتیں کہ صرف مسلم فقہاء کو ہی ان معاملات کو دیکھنے کا اور فیصلہ دے گا ہی اختیار ہے یہی وہ حضرات ہیں جو قرآن کریم میں مذکور لفظ اولوا الامر کے مصداق ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ  
أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ج (النساء: ۵۸)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کر دو ان

(اللہ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں.....“

ایک دوسری جگہ قرآن کہتا ہے:

فَسَلُوا أَهْلَ الدِّينِ كُرَّانٍ مِّنْ مَّوَدَّةِ الْإِيمَانِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ ۝ وَالنَّحْدُ ۝ (۴۳)

لے عاجز مترجم کا فاضل مقالہ نگار مدظلہ کے تمام خیالات سے پوری طرح متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

(راجد)

”اگر تم لوگوں کو علم نہیں ہے تو اہل علم سے پوچھ دیکھو“

فقہاء کا یہ حق فطری ہے اور تمام جگہ اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ یہاں پر یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں صرف اس علم میں تخصص ہی کافی نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ تقویٰ اور پرہیزگاری بھی ضروری ہے اور اس سلسلہ کے بنیادی شرائط میں سے ہیں۔ کیونکہ قرآن صاف صاف یہ اعلان کرتا ہے کہ ”وَهْدَىٰ لِلْمُتَّقِينَ“ (پرہیزگاروں کے لیے راہ ہدایت) ہے۔

مندرجہ بالا سطوریں / جہاد کے بارے میں تفصیلی مطالعہ کے بعد راقم السطور یہ ضروری سمجھتا ہے کہ بطور مثال موجودہ دور کے مسلمانوں کے چند اہم مسائل پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ اس سلسلہ میں راقم السطور اس کا اظہار کرنا بھی ضروری خیال کرتا ہے کہ وہ اس جگہ فقہ اسلامی کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے گفتگو کر رہا ہے نہ کہ ایک حکم (ادبجج) کی حیثیت سے کسی مسئلہ میں فتویٰ دینا میرا کام نہیں ہے یہاں پر صرف جستجو اور تذکرہ ہی مقصد ہے۔

تعدد ازواج | تعدد ازواج ہمارے زمانہ کا سب سے زیادہ معرض بحث موضوع ہے لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس موضوع پر اتنا شور و غل اور ہنگامہ کیوں برپا کیا جا رہا ہے مسئلہ بہت آسان ہے اور اس کا بہت معقول جواب دیا جاسکتا ہے اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتیں سمجھنا ضروری ہیں :

- (۱) اسلام سے قبل نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سے دوسرے ممالک میں بھی تعدد ازواج پر عمل کیا جاتا تھا جیسا کہ امیر علی نے اپنی کتاب ”دی اسپرٹ آف اسلام“ میں بھی لکھا ہے۔
- (۲) اسلام سے قبل لوگ عام طور پر حالت جنگ میں رہتے تھے۔ مسلسل جنگ و پیکار کی وجہ سے آدمیوں کی تعداد عورتوں کے مقابلہ میں کہیں کم تھی۔ عورتوں کے سرپرستوں اور نگہداشت کرنے والوں کی کمی کی وجہ سے ان کو خستہ حالی اور محتاجی کی زندگی بسر کرنا پڑتی تھی۔ ان حالات کی وجہ سے تعدد ازواج کو زیادہ فروغ ہوا۔

(۳) اسلام کو ابتدائی تاریخ میں ان ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ مسلمان اپنے دشمن سے جو کہ اُن کو مٹانے پر تلا ہوا تھا مستقل حالت جنگ میں رہے۔ عورتیں اپنے محبوب شوہروں سے اور بچے اپنے پیارے والدین سے محروم ہو گئے۔ اسلام کو ان بیکس بیواؤں اور یتیموں کی مشکلات کا حل تلاش کرنا پڑا۔

(۴) ان ہنگامی حالات کی وجہ سے ہی اسلام کو اس بات کی اجازت دینی پڑی کہ ایک آدمی ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے۔ ہنگامی حالات اجتماعی اور انفرادی دونوں قسم کے تھے مثلاً کسی عورت کا کوئی ایسا جسمانی نقص جس کی وجہ سے وہ اپنے شوہر کی جنسی خواہشات پوری نہ کر سکے یا وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہے جیسا کہ نیپولین کی محبوب بیوی کو بپائسن کے ساتھ ہوا جس کو اُس ملک کے قانون کے مطابق نیپولین کو طلاق دینا پڑی۔ یہ مد نظر ہے کہ یک زوجی راجت میں ایک بیوی رکھنے کا راسول کی اجازت قرآنی نقطہ نظر سے عام ہے جبکہ تعدد ازواج کی اجازت صرف بطور رعایت دی گئی ہے۔ یہ بات اس آیت کے مطالعہ سے ہی معلوم ہو جاتی ہے جس میں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی ہے۔

(۵) تعدد ازواج کی مندرجہ بالا اجازت بھی غیر مشروط نہیں ہے۔ اس میں عدل و مساوات کی شرط ہے۔ پوری آیت اس طرح ہے:

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي النِّسَاءِ فَأُولَٰئِكَ مَخْرُجُكُمْ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ فَاذْكُرُوا اللَّهَ الَّذِي تَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ عَٰلِمُ السُّرُورِ ۚ (النساء: ۳)

”اور اگر تم کو ڈر ہو کہ یتیم رکھو کیوں کا حق برابر نہ دے سکو گے تو (دوسری غیر) جو عورتیں تم کو بھائی لگیں اُن سے نکاح کر لو دو دو تین تین چار چار (یعنی دو سے لے کر چار تک) پھر اگر تم کو (کئی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے میں)



ڈر ہو کہ برابر انصاف نہ کر سکو گے تو ایک پر ہی قناعت کرو یا لونڈی پر۔ یہ ظلم سے بچنے کی زیادہ نزدیک راہ ہے۔“

یہ بات قابل غور ہے کہ یہ آیت خروہ احد کے بعد نازل ہوئی تھی جب کہ مسلمانوں کے اندر جنگ کے نتیجے میں کافی تعداد میں بیوائیں اور یتیم بچے ہو گئے تھے۔ کچھ جنگی قیدی بھی تھے۔ اسی سورہ کی ایک دوسری آیت میں یہ مذکور ہے کہ اس سلسلہ میں دیانتداری اور تقویٰ سے باوجود عدل و مساوات کا اختیار کرنا الفاظ کے یا خابطہ معنی کے اعتبار سے ممکن نہیں۔

ان لیے عدل کے معنی یہ ہوں گے کہ کوئی اپنی (دوسری) بیوی کو بے یار و مددگار نہ چھوڑ دے جس کے لیے قرآن کے الفاظ تَفْذَرُفْہَا کَا مُعْتَقَةٍ یعنی دوسری کو بیچ ادھر میں لٹکائے رکھو (آئے ہیں)۔ اس لیے یہ آپسی سمجھوتہ پر موقوف کر دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وَ اِنْ تَصْلُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (یعنی اگر رستی سے چلو اور ظلم و زیادتی سے بچے رہو تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے)۔

(۶) اس سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ تعدد ازواج کا شمار احکامات کی ایک خاص قسم یعنی مباحات میں ہوتا ہے۔ اس طرح دوسرے مباحات کی طرح تعدد ازواج میں جہاں کچھ خوبیاں ہیں وہاں اذراط و تفریط کی وجہ سے اس کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جب کسی مباح کو ذاتی اغراض پورا کرنے کی وجہ سے غلط استعمال کیا جانے لگے اور اس کی وجہ سے اخلاقی و معاشرتی اقدار متاثر ہوتی ہوں تو اسلامی ایسٹ یا مسلمانوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اس میں مداخلت کرے اور اس کو عارضی طور پر روک دے یا کچھ پابندیاں عائد کر دے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہت سے فیصلوں سے اس نقطہ نظر کو مزید تقویت ملتی ہے۔ یہ مسئلہ سب کو معلوم ہے کہ مسلمان اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ عمل معاشرہ میں بہت عام (و مقبول) ہوتا جا رہا ہے تو انھوں نے یہ فرمایا ”گو کہ مجھے کسی حلال چیز کو حرام یا حرام چیز کو حلال کرنے کا

اختیار نہیں ہے لیکن مجھے اس کی فہم درنہم ہے کہ اگر تم رومی لڑکیوں کی خوبصورتی پر اسی طرح  
ریختے رہے تو عرب کی کنہاری لڑکیوں کا کیا حال بنے گا؟

۳۳۔ حال اس سلسلہ میں یہ صرف چند اہم نکات تھے جن کو اگر سامنے رکھا جائے تو ایک  
مجتہد یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ تعداد ازواج کی شرعاً اجازت ہے لیکن اس  
مسئلہ کی اباحت کے سلسلہ میں اسلام کی عائد کردہ کچھ قیود و پابندیاں دنیا میں انسانوں کی تیزی  
سے بڑھتی ہوئی تعداد دیگر معاشی اور معاشرتی مسائل کی وجہ سے اسلامی اسٹیٹ یا اس کی  
غیر وجودگی میں خود مسلمان اگر ایسا مناسب سمجھتے ہوں تو اس عمل پر کچھ پابندیاں عائد کر سکتے  
ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے اخلاقی اور معاشرتی اقدار متاثر نہ ہوں۔

**طلاق** طلاق مباحت میں سے ایک ایسا مباح عمل ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغض المباحات (یعنی حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز) بتایا  
ہے۔ اس سلسلہ میں مسلم معاشرہ کے کچھ غیر محتاط افراد کے طرز عمل سے مسلم معاشرتی نظام کو  
زبردست نقصان پہنچا ہے جس کی وجہ سے بہت سی بے گناہ اور مظلوم عورتوں کو سخت  
پریشانی اور کلفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کے کچھ حلقوں نے اس کی  
آواز اٹھائی ہے کہ فقہ کے اس خاص سلسلہ پر غور و خوض کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ  
کیا اس میں کچھ تبدیلی یا اصلاح ممکن ہے۔ میرے خیال میں اس مسئلہ میں اجمہاد کی کافی  
گنجائش ہے۔ اس سلسلہ میں یہ مد نظر رہے کہ قرآن نے زوج و زوجہ کے تمام اختلافات  
میں جن سے رشتہ ٹوٹنے کا اندیشہ ہو جائے ان میں کی طرف سے ایک حکم مقرر کر کے معاملہ طے کرانے  
پر زور دیا ہے۔ ارشاد ہے: ”وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعُوهُمَا حُكْمًا قَاتِلِ أَهْلَهُ  
وَحُكْمًا قَاتِلِ أَهْلَهَا“ (اور جو تم ڈرو کہ میاں بی بی میں کھٹ پٹ ہوگی ایک بیچ فائدہ کے کہنے  
میں سے اور ایک بیچ عورت کے کہنے میں سے مقرر کرو۔۔۔۔۔) ان حکموں کی پہلی کوشش  
صحیح کی ہوگی (رَبِّانِیُّ رَیْدُ الرَّحْمٰلِیِّ حَیْثُ نَفِیَ اللّٰہُ بَيْنَهُمَا۔ (النار: ۳۵) اور اگر صلح

نہ ہو سکی تو طلاق یا خلع کی گنجائش ہوگی۔ وَ اِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ عَنْ كُلٍّ مِّنْ سَعَتِهِ ط  
 ”اور اگر صلح نہ ہو سکے) میاں بیوی جدا ہو جائیں (طلاق یا خلع سے) تو اللہ تعالیٰ اپنی گنجائش  
 سے (فضل سے) کسی کو دوسرے کا محتاج نہ رکھے گا۔ (النساء: ۱۳۰)

اس میں شک نہیں کہ شوہر کو طلاق دینے کا اختیار دیا گیا ہے لیکن اس حق کو استعمال کرنے  
 کے لیے کچھ (اخلاقی و معاشرتی) پابندیاں ضروری ہیں اور اس کو من مانے (اور بے قاعدہ)  
 طریقے سے اس حق کو استعمال کرنے کا اختیار نہیں۔ خلیفہ رابع حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے  
 ایک شوہر کو جو کہ اس تصور میں تھا کہ اس کو (من مانے طریقے پر) طلاق دینے کا پورا اختیار حاصل  
 ہے بتایا کہ اس کو متعلقہ حکموں کے فیصلہ کا پابند ہونا پڑے گا جیسا کہ (مندرجہ بالا) آیت  
 میں کہا گیا ہے۔ کچھ مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شوہر کے ذریعہ دی گئی طلاق  
 میں مداخلت فرمائی ہے اور ایسی طلاق کو رد فرما کر مرد کو ازدواجی تعلقات کو بحال کرنے کا  
 حکم دیا ہے۔ یا کبھی تین طلاقیں کو ایک طلاق کے برابر ہی تسلیم کیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت  
 ہوتی ہے کہ طلاق دینے کے اختیار میں قانونی (فقہی) مداخلت کی جاسکتی ہے۔ اس طرح کسی بھی  
 زمانہ اور دور میں مسلم فقہاء کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ طلاق کے سلسلہ میں قوانین اس زمانہ کے حالات  
 و ضروریات کے تحت مناسب شرعی رد و بدل کے ساتھ نافذ کریں۔ اس سلسلہ میں تین باتیں  
 قابل غور ہوں گی (۱) کس شخص کی دی ہوئی طلاق شرعاً جائز ہوگی؟ (۲) وہ کیا حالات ہیں  
 جن میں طلاق دینا جائز یا ناجائز ہوگا؟ (۳) طلاق کے سلسلہ میں ادا کیے گئے الفاظ کس  
 حد تک صحیح مانے جائیں گے اور ان سے کس قسم کی طلاق مراد لی جائے گی۔ یہ وہ عین باتیں ہیں  
 جن پر ہمارے ائمہ اور اکابر فقہائے تفصیلی بحثیں کی ہیں جو کتب فقہ میں موجود ہیں۔ یہ مباحث

۱۔ امام رازی ”التفہیم الکبیر“ ج ۳ ص ۳۲۰۔

۲۔ الصحیح البخاری۔



موجودہ دور کے مجتہد کے لیے جدید حالات میں مسئلہ طلاق پر فیصلہ دیتے وقت ایک وسیع میدان فراہم کریں گے۔

فیملی پلاننگ | فیملی پلاننگ یا سادہ الفاظ میں برتھ کنٹرول (ضبط تولید) بھی ہمارے دور کے اُن مسائل میں سے ہے جن پر گرم بحثیں اور پر زور دلائل کے ساتھ مذاکرات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ مسئلہ بہت آسان ہے اور اتنا پیچیدہ اور مشکل نہیں ہے جیسا کہ تصور کیا جاتا ہے۔ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے مندرجہ ذیل باتیں مد نظر رکھنا ضروری ہیں:-

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں شادی کا مقصد صرف جنسی خواہشات کو درجائے طریقہ سے پورا کرنا ہی نہیں جو کہ اپنی جگہ بہت ضروری ہیں بلکہ انسانی آبادی کی نشوونما اور اس کی تعداد میں اضافہ بھی ہے اس لیے برتھ کنٹرول (ضبط تولید) کی عام حالات میں اجازت نہیں دی جاسکتی لیکن ایک فطری مذہب ہونے کی حیثیت سے اسلام واقعی صورت حال اور زندگی کے اُن حقائق سے جو کسی قوم کو درپیش ہوں کنارہ کشی اختیار کر کے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں باہم تناقض ہے۔ عرب میں عزل پر برتھ کنٹرول (ضبط تولید) کے سلسلہ میں عام طور سے عمل کیا جاتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ احادیث میں عزل کے سلسلہ میں ممانعت آئی ہے لیکن اس کے برخلاف بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک روایت میں فرمایا ہے کہ ”ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عزل کرتے اور وہی (بشکل قرآن) نازل ہوتی تھی“ اس بحث سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:-

- (۱) برتھ کنٹرول (ضبط تولید) کی اجازت بغیر کسی معقول عذر کے نہیں دی جاسکتی۔
- (۲) لیکن کسی حقیقی اور معقول وجہ سے برتھ کنٹرول (ضبط تولید) کی نہ صرف اجازت دی جاسکتی ہے بلکہ کبھی کبھی یہ عمل ضروری بھی ہو جاتا ہے۔ البتہ محض اغراض نفسانیہ کو پورا کرنے اور دل بہلانے کے مقصد سے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ میرے خیال سے ایسے مواقع پر مندرجہ ذیل آیات فقر کے خوف سے بچوں کے قتل کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھیں:-

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِمَّا قَدْ بَلَغُوا ذُلًّا ۖ إِنَّكُمْ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ ۚ إِنَّكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ بِمَآثِرِكُمْ حَسْبُكُمْ ۚ  
(الانعام: ۱۵۱)

”اور اپنی اولاد کو محتاجی کے ڈر سے نہ مار ڈالو۔ ہم (یہی) تم کو روزی دیتے ہیں اور اُن کو (بھی دیں گے)۔“

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةً إِمْلَاقٍ ۖ تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ إِنَّكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ بِمَآثِرِكُمْ حَسْبُكُمْ ۚ  
إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطَاً كَبِيراً ۝ (بنی اسرائیل: ۳۱)

”اور محتاجی و افلاس کے ڈر سے اپنے بچوں کو مار نہ ڈالو۔ ہم ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں۔ بے شک اُن کا مار ڈالنا بڑا گناہ ہے۔“

حقیقی اور معقول وجوہات جسمانی اور اقتصادی دونوں قسم کی ہو سکتی ہیں۔ امام غزالیؒ نے

اپنی کتاب اخیار العلوم اور شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے اپنی ”تفسیر“ میں آیت: فَإِذَا أُلْمُوا بِذُنُوبِكُمْ سَأَلْتُمُ الْمَنَاجِدَ (اور جب اُس رُک کی سے جو جیتی گاڑ دی گئی تھی پوچھا جائے گا کہ وہ کس تصور میں ماری گئی) کی تفسیر کے ذیل میں اس حد تک اجازت دی ہے کہ عورت کے حُسن کی حفاظت بھی اُن معقول وجوہات میں شامل کی جاسکتی ہے جن کی وجہ سے ضبط تولید کا عمل کیا جاسکتا ہے۔ دیگر جسمانی حالات تو دور کی بات ہیں یعنی اُن کی اجازت کو اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال اس سلسلہ میں دو چیزیں مد نظر رکھنا ضروری ہے: پہلا یہ کہ یہ شہر و دیہی کے درمیان ذاتی و منہجی معاملہ ہے اور اس سلسلہ میں وہ شرعی حدود کے اندر مناسب تدابیر اختیار کرنے کے مجاز ہیں۔ اسلام کے مطابق کسی گورنمنٹ کو اس میں مداخلت کا اختیار نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ برتن کنٹرول (ضبط تولید) کے سلسلہ میں استعمال کی گئی تدبیر صحت کے لیے کم سے کم مضر ہونا چاہیے۔

بنک کا سود | بنک کا سود بھی ان چند مسائل میں سے ایک ہے جن پر علماء اسلام نے کافی مباحث کیے ہیں۔ حالانکہ یہ کبھی بہت آسان مسئلہ ہے۔ ”بیع“ اور ”رہو“ دو ایسے الفاظ

ہیں جن پر قرآن نے مالی لین دین کے سلسلے میں اپنے صاف صاف احکامات دیے ہیں۔ اول اندک حلال چیز ہے جبکہ دوسری چیز (یعنی ”ربو“) حرام ہے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے لین دین بھی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”ربو“ میں شمار فرمایا ہے اس وجہ سے وہ بھی حرام ہیں۔ اس کے مقابلہ میں کچھ ایسے مالی لین دین ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”بیع“ میں شمار فرمایا ہے۔ اس لیے وہ حلال ہیں۔ اگر کوئی ان دونوں قسم کے مالی معاملات کا جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کیا ہے بغیر غائر مطالعہ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ ”ربو“ کا حقیقی مطلب ناجائز طور پر اقتصادی فائدہ حاصل کرنا (Economic Exploitation) ہے جس کی وجہ سے معاشرہ کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی غربت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے ذاتی مفادات اور مساوات کو سامنے رکھ کر نیز دوسرے کی خوشحالی یا تنگدستی سے قطع نظر کے بہت زیادہ زمین جاتا ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد پھر موجودہ بنکاری نظام کا بغور جائزہ لینا ہوگا اس کے بعد یہ طے کرنا ہوگا کہ بینک کا انٹرسٹ حقیقی معنی میں قرآن میں مذکور ”ربو“ کے تحت آتا ہے یا نہیں اور اگر آتا ہے تو پھر یہ کہیں ”ربو“ ہے یا جائز دی ربو کی یہ مفاربت اور شرکت کی ہی کوئی قسم ہے۔ مفاربت اور شرکت وہ تجارتی معاملہ ہے جس کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے۔ بہر حال یہ وہ راستہ ہے جس کو ایک مجتہد اختیار کرنے کے بعد کوئی نتیجہ نکال سکتا ہے اور اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل تلاش کر سکتا ہے۔

انشورنس (بیمہ) | انشورنس (بیمہ) بھی مسائل کی مندرجہ بالا قسم میں شمار ہوتی ہے۔ اس پر عرب دنیا کے دو مشہور عالم — شام کے شیخ مصطفیٰ اور مصر کے شیخ ابوزہرہ — کے زمین کافی گراں گرم بحث ہوتی ہے۔ یہ عالم نے اپنی کتاب الثامین میں انشورنس (بیمہ) کو جائز قرار دیا ہے جبکہ دوسرے عالم نے اس کا انکار کیا ہے اور اس کے ناجائز ہونے کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا ہے۔ پوری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ آیا انشورنس (بیمہ) ربو کی تعریف میں داخل ہوتی ہے اور اس کی ہی ایک قسم ہے یا نہیں۔



دنیا کے موجودہ سیاسی اور سماجی نظام نے جس کی وجہ سے انسانی تہذیب و تمدن کے ایک نئے دور نے جنم لیا ہے، علماء کو مجبور کیا ہے کہ وہ اس مسئلہ پر از سر نو غور کریں اور قدیم فقہاء کے نظریات کا جائزہ لیں جس طرح کہ پہلے ایک غیر مسلم ریاست کو دارالہجرت کہا جاتا تھا اور فقہاء نے دنیا کو دو قسموں میں منقسم کیا تھا — (۱) مسلم ریاست اور (۲) غیر مسلم ریاست مسلم ریاست کو دارالاسلام اور غیر مسلم ریاست کو دارالہجرت کہا تھا۔ چند سال قبل راقم السطور نے اس موضوع پر ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو ”برہان“ میں کئی قسطوں میں چھپا تھا اور بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ”ہندوستان کی شرعی حیثیت“ کے عنوان سے ایک کتابچہ کی شکل میں ایک دوسرے مقالہ ”نفثہ المصدر“ کے ساتھ طبع ہوا تھا۔ اس میں راقم السطور نے قرآن، حدیث، اور تاریخ اسلام کی روشنی میں یہ بتایا تھا کہ مندرجہ بالا تقسیم موجودہ حالات میں منطبق نہیں ہوتی۔ مختلف ممالک کا موجودہ سیاسی ڈھانچہ، جمہوری نظریات اور ان پر عمل، بنیادی شہری حقوق اور کسی ملک میں رہنے والے کو وطنی (شہری) حقوق کا حاصل ہونا وغیرہ ایسے نظریات ہیں جو عالمی طور پر قبول کیے جا چکے ہیں۔ اور مسلم و غیر مسلم تقریباً تمام ممالک میں اس پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس وجہ سے مندرجہ بالا تقسیم کے اعتبار سے مسلم و غیر مسلم ممالک میں حد فاصل قائم کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے اور مذہبی اعتبار سے اس کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

عورتوں کی عوامی مشاغل میں شرکت و سرگرمی | یہ حقیقت ہے کہ مسلم عورتیں ماضی میں الگ تھلگ زندگی گزارتی رہی ہیں۔ چاہے پردہ ہو یا نہ ہو۔ یہ ماضی میں اچھائیوں نہ سمجھا گیا ہو لیکن اگر موجودہ دور میں مسلمان حالات کے تقاضے کے تحت فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں تو وہ یقیناً ناقابل تلافی خسارہ میں رہیں گے۔ وہ قوم و سماج جس کی آدھ سے زیادہ آبادی اس کی زندگی کے مرکزی دھارے سے کٹ جائے تو موجودہ دور میں جبکہ دوسری قومیں ترقی کے میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں اور اس دور میں سب کی سب شریک ہیں، یقیناً پیچھے رہے گی

اور نشوونما نہیں پاسکے گی تعلیم طب (میڈیسن) اور کسی حد تک قانون (فقه) ایسے میدان ہیں جن میں ہماری بہنیں اور بیٹیاں شرکت کر سکتی ہیں۔ ان میدانوں میں شرکت نہ صرف یہ ممکن ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی ہے اور اسلامی قانون میں پسندیدہ بھی جیسا کہ میں اس موضوع پر تحریر بھی کر چکا ہوں۔

مغربی ممالک میں گوشت کا مسئلہ | آخر میں اسی قسم کے ایک اور مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے جو بہن بھائی یورپ و امریکہ وغیرہ جاتے ہیں ان کو اس مسئلہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان ممالک میں ایک خاص انداز سے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے کیا وہ اسلام کے نزدیک جائز ہے۔ اس سوال کا جواب دو باتوں پر غور کرنے کے بعد ہی سامنے آسکے گا۔

(۱) جانور اللہ کے نام کے بغیر ذبح کیا جائے۔ (۲) ذبح کرنے کا طریقہ مشہی ہے جو اسلام کے ذریعہ تسلیم شدہ طریقہ سے بالکل مختلف ہے۔ پہلی بات کے سلسلہ میں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اللہ کا نام لیے بغیر جانور کا ذبح کرنا قطعاً ناجائز ہے (یعنی ایسے جانور کا گوشت حلال نہیں) ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیت میں صاف طور سے اُس جانور کے گوشت کو کھانے سے جس کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا جائے منع فرمایا ہے :

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ مِّنْ طَرَفٍ (الانعام ۱۲۱)

اور جس جانور پر (کاٹتے وقت) اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے اس کو مت کھاؤ۔ اور اس میں سے کھانا فسق ہے۔

اس کے بالمقابل امام شافعی فرماتے ہیں کہ صرف اس جانور کا گوشت کھانا حرام ہے جس کو اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کا نام لے کر ذبح کیا جائے۔ وہ جانور جس کے ذبح کرتے وقت کسی کا نام نہ لیا گیا ہو، نہ اللہ کا نہ کسی دوسرے کا، اس کو کھانا ان کے نزدیک جائز

ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس مسئلہ پر کئی آیات میں گفتگو کی گئی ہے جن میں سے کچھ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اُن جانوروں کا گوشت کھانا جن پر اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کا نام لیا گیا ہو حرام ہے (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۷۳؛ اور سورۃ الانعام، آیت نمبر ۱۲۱) کچھ آیات میں اس کا حکم دیا گیا ہے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔ اُن میں سے ایک آیت مندرجہ بالا آیت (سورۃ الانعام، آیت نمبر ۱۲۱) ہے جس میں ”وَ اِنَّہٗ لَفِیْشِقٍ“ کے الفاظ ہیں یعنی ایسے گوشت کا کھانا فسق ہے۔ انہی الفاظ (وَ اِنَّہٗ لَفِیْشِقٍ) کے ساتھ سورۃ الانعام کی ایک اور آیت، نمبر ۱۴۵، بھی ہے جس میں ایسے جانور کا گوشت کھانا فسق بتایا گیا ہے جس کو اللہ کے نام کے علاوہ کسی دوسرے کے نام پر ذبح کیا گیا ہو کیونکہ دونوں جگہ فسق کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے اس لیے امام شافعی کہتے ہیں کہ صرف ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے جس کو ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو جس کے نتیجہ میں باقی دو صورتوں میں گوشت حلال رہے گا۔ اگر ہم آسانی کی غرض سے ”شافعی“ کے اس قول پر عمل کر لیں تو جہاں تک پہلے معاملہ کا تعلق ہے یورپ و امریکہ میں ذبح لیے گئے جانور کا گوشت حرام نہیں رہے گا۔

جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے علما کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ اسلام کی پوری تاریخ میں اب تک مسلمان جس طریقہ سے جانور کو ذبح کرتے چلے آ رہے ہیں وہ کیا مذہبی اقدار میں کوئی قدر ہے، یا محض رسم و رواج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس کی حیثیت صرف رسم و رواج کی ہے اور اس کے پیچھے قرآن و حدیث کی صریح دلیل نہیں ہے تو ایک دوسرا بہتر اور زیادہ ترقی یافتہ طریقہ اپنانے سے شرعی حدود کی خلاف ورزی نہیں سمجھی جائے گی۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فقہ اسلامی ایک جامد بے حرکت و غیر متحرک قانون نہیں ہے بلکہ متحرک، تغیر پسند، پراز حیات قانون ہے جو پوری قوت اور اعتماد و بھروسہ کے ساتھ کسی بھی دور کے حالات کے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔



# قاضی ضیاء الدین شامی (م ۱۹۸۶ء)

ایک اجمالی تعارف

از جناب مولوی محمد ارشد صاحب اعظمی (مقیم بنارس)

فاضل مدرسہ وصیۃ العلوم خالقہ اللہ آباد

حضرت محبوب الہی خواجہ نظام الدین قدس اللہ سرہ العزیز کی ذات والاصفات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدح سرائی فرماتے ہوئے کتنا وجد آفریں بیان دیا ہے کہ:

لقب او سلطان المشائخ ونظام اولیاست۔  
دے از محبوبان ومقربان بارگاہ الہیست  
دیار ہندوستان ملوست از آثار برکات  
اولیاء کے برکات کے انوار سے پُر ہیں۔  
”سلطان المشائخ“ و ”نظام اولیاء آپ کا  
لقب گرامی ہے، بارگاہ الہی کے مقرب و محبوب  
ہندوں میں سے ہیں ہندوستان کی بستیاں نظام  
اولیاء کے برکات کے انوار سے پُر ہیں۔

سلطان المشائخ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے خلیفہ اقدس ہیں، خود ہی فرماتے ہیں کہ:  
جب شیخ فرید الدینؒ کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کی تو سب سے پہلا کلام جو  
شیخؒ نے ارشاد فرمایا ہے وہ یہ شعر تھا۔  
اے آتشِ فراق و لہا آبیاب کردہ سیلابِ اشتیاق جانہا خراب کردہ

۱۵ ۱۶ اخبار الاخیار ص ۶۲۔

بابا فریدؒ نے نظام اولیاءؒ کے بارے میں فرمایا کہ :

”علم سینہ من بہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ بدایہ فی رسید“ ۱۵

مرشدؒ کی اجازت و خلافت کے بعد محبوب الہیؒ نے دہلی کی غیاث پور نامی بستی میں سکونت اختیار فرمائی جو رشد و ہدایت کا مرکز بنی اور جہاں سے آپ کا فیض سارے ہندوستان میں رواں ہوا، عوام الناس نے نفع اٹھایا، علماء نے زانوئے مکتبہ پر کیا اور امرام نے جبین نیاز خم کی۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے عروج بخشا تو آپ کی روحانی بارگاہ عالی سے نسیم سر کے وہ جھوٹے چلے جس نے بے شمار بندگانِ خدا کے مشامِ جاں کو معطر و مغیر بنایا، سلطان المشائخ کے اصلاحی پیام کی باد بہاری نے رہ نور دانِ دادی سلوک کو فرحت و سرور کا جام بخشا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ: سلطان الاولیاءؒ کے سعادت آفرین دور کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ :

گویند کہ در زمان شیخ نظام الدین اولیاءؒ  
 سلسلہ ضیاء ربودند، یکے ضیاء ستامی کہ  
 منکر شیخ بود و دیگر ضیاء برنی کہ معتقد  
 مرید اولیاء دیگر ضیاء بخششی کہ نہ منکر بود  
 و نہ معتقد۔ ۱۶

شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے زمانہ اقدس میں تین  
 ضیاء نامی شخصیتوں کا پتہ ملتا ہے، ایک تو ضیاء  
 ستامیؒ جو کہ شیخؒ کے منکر تھے، دوسرے ضیاء  
 برنیؒ کہ شیخؒ کے مرید و معتقد تھے تیسرے ضیاء  
 بخششیؒ جو شیخؒ کے نہ منکر تھے نہ معتقد، —

اسی طرح مولانا محمد غوثی بن حسن مائٹ دی نے شعر لکھا ہے کہ : ۱۷

برنی و بخششی و ستامی ہر سہ تن ضیاء ربود  
 اولین معتقد پسین منکر ثنائی از ہر دین اولیاءؒ ۱۸

۱۵ سیرالقطاب ص ۱۷۸۔ ۱۶ اخبار الاخیار ص ۱۱۱۔ ۱۷ گلزار ابرار، یہ کتاب اقبالؒ کے عہد  
 جہانگیری اور انتہائے عہد اکبری کی یادگار ہے اور ۱۸ ص ۱۷ میں موجود ہے۔

خواجہ ضیاء الدین نخشیؒ سلطان اتارکین خواجہ حمید الدین ناگوریؒ کے پوتے شیخ فرید الدین چاک پراں ناگوریؒ کے خلیفہ گرامی ہیں۔ مفتی غلام سرور لاہوریؒ نے لکھا ہے کہ:

از مشاہیر اولیاء ہندوستان است  
در شہر بدایوں بزاویہ فحول بکار خود  
مشتغول، وے از صحبت خلق متنفر  
و با اعتقاد و انکار کے کارے ندارد۔  
خواجہ ضیاء الدین نخشیؒ ہندوستان کے  
مشاہیر اولیاء اللہ میں سے ہیں، شہر بدایوں  
میں عزت نشینی کے ساتھ اپنے کام میں  
مشتغول تھے، آپ مخلوق کی صحبت سے نفرت  
فرماتے تھے اور کسی کے اعتقاد و انکار کے

۱۷

در پے نہیں ہوتے تھے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ خواجہ نخشیؒ کا مزاج ہی ایک طرح سے الگ تھلک عزت نشینی و غموشی پسندی کا تھا اسی لیے عام مخلوق سے ملنا جلنا بھی نہیں تھا اسی بنا پر آپ کے تعارف میں جملہ ”نہ منکر بود نہ معتقد“ جز و تار تیغ بن گیا ہے۔

کئی تصنیفات آپ کی یادگار ہیں جس میں ”سلک السلوک“ فن تصوف میں زیادہ مشہور ہے اس کی اردو ترجمانی حضرت الاستاذ مولانا عبدالرحمن صاحب جامی مدظلہ العالی فرما رہے ہیں اور سیدی حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقہ کے آستانہ خالقاہ الزبائر سے نکلنے والے مشہور ماہنامہ ”وصیۃ العرفان“ میں ”ترغیب الفقراء و الملوک“ کے نام سے قسط دار شائع ہو رہا ہے، تاثرین رسالہ اس سے واقف ہوں گے۔

۱۷ شیخ کو ”چاک پراں“ کا لقب دینے کی وجہ یہ ہے کہ: قریب ایک من وزنی چاک جو ناگور کے لال پتھر کا بنا ہوا تھا شیخ فرید الدین گلاب میں ڈال کر بے سکر، کی حالت میں ناگور سے دہلی تشریف لائے تھے (اخبار الاخیار ص ۱) آپ شیخ عبدالعزیز ناگوریؒ کے صاحبزادے ہیں، اپنے دادا خواجہ ناگوریؒ کے ظل عافیت و تربیت میں پروردان چڑھے ہیں اور درجہ کمال کو پہنچے ہیں۔ حکمران کے وصال فرمانے کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے،

محمد ارشد اعظمی۔

۱۷ خزینۃ الاصفیاء ص ۱۵۳



دوسرے مولانا ضیاء الدین برنیؒ "تاریخ فیروز شاہی" کے مصنف اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید مسجید و خلیفہ مگرامی ہیں، اور بارشاد شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ "دلقول مفتی غلام سرور لاہوریؒ" :-

"مجموعہ لطائف و طرائف اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے عنایات کے مورد و عطایات کے مصدر تھے"

تیسرے حضرت مولانا ضیاء الدین سنائی قدس سرہ العزیز ہیں جو ایک باکمال اور جید عالم دین و شریعت مطہرہ کے ماہرین میں سے تھے، ایک کتاب "نصاب الاحساب" نامی بھی مولاناؒ نے تصنیف فرمائی جس میں "احساب" (محاسبہ اعمال، شرعی گرفت، روک ٹوک وغیرہ) کے آداب بدعت کے اقسام، اور سنت کے احکام بیان فرمائے ہیں، مولانا سنائیؒ کے تعارف میں شیخ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ :

خواجہ ضیاء الدین سنائی رحمۃ اللہ علیہ	خواجہ ضیاء الدین سنائیؒ در دیانت
دیانت و پرہیزگاری میں اپنے وقت کے	و تقویٰ مقتدائے وقت بود و یربائیہ
پیشوا اور رہنما تھے، مقام شریعت و اتباع	شریعت بغایت قدم راسخ داشت.
احکام میں مضبوط قدم رکھتے تھے،	لے

مولانا رحمان علی خراج عقیدت پیش کرتے ہیں کہ :-

قاضی ضیاء الدین سنائیؒ صاحب دانش	قاضی ضیاء الدین سنائیؒ دانشمند و متبحر
ودیانت اور تقویٰ میں باکمال و زمانہ	در دیانت و تقویٰ مقتدائے وقت الخ
کے مقتدا تھے، قاضی سنائیؒ کے وعظ	و تذکیر ضیاء الدین سنائی زائد از سہ
کے محفل میں مین ہزار سے زیادہ لوگ حاضر ہوتے تھے۔	ہزار مردم حاضر می شدند الخ لے

لے اخبار الاخبار ص ۱۱۵ ، لے تذکرہ علمائے ہند ص ۹۷ و ۹۸ ،

نیز محدث دہلویؒ مزید تعارفی انداز میں حاضر ریز ہیں کہ :-

معاصر شیخ نظام الدین اولیاءؒ بودو  
مولانا ضیاء الدین سنائیؒ شیخ نظام الدین  
دائم بشیخ از جہت سماع احتساب  
اولیاءؒ کے ہم زمانہ تھے، اور "سماع"  
کے وجہ سے شیخ کا احتساب درودک  
کردے و بشیخ باوئے جز بہذرت  
ٹوک) کیا کرتے تھے، لیکن حضرت شیخ  
والنقیاد پیش نیامدے و در تعظیم مولانا  
موائے معذرت اور سر تسلیم خم کرنے کے  
دوسری روش اختیار نہیں فرماتے تھے، اور حضرت مولانا کی تعظیم و تکریم میں کسی طرح  
کوئی کمی باقی نہیں رکھتے تھے۔

اسی طرح عمر حاضر کے بھی ایک محقق مؤرخ و صاحب قلم نے لکھا ہے کہ :-  
حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے یہاں جو غفل سماع ہوتی رہتی اس کو (مولانا  
ضیاء الدین سنائیؒ قدس سرہ) پسند نہ کرتے اور ان سے سماع پر احتساب کرتے  
رہتے، اس سلسلہ میں مولانا سنائیؒ نے) شد و مد سے ان کی مخالفت کی، ۱۷  
اس سلسلہ میں شیخ محدث دہلویؒ نے دونوں کے احترام و اکرام کا ایک معروف واقعہ  
بائیں طور رقم فرمایا ہے کہ :-

شیخ نظام الدین اولیاءؒ در مرض موت  
مولانا ضیاء الدین بعبادت رقت،  
مولانا دستارچہؒ خود را پہلے انداز  
تو شیخ نظام الدین اولیاءؒ مولانا کی  
مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گئے جب  
شیخ افلاختؒ شیخ دستارچہؒ پر حیدر  
قرب ہوئے تو مولانا سنائیؒ نے اپنی  
برہنہم نہاد چوں پیش مولانا پر نشست  
وہ کہ شیخؒ کے قدموں تلے بچا دیا۔

مولانا بادی چشم دو چار کمر و چوں برخاست  
 و بیرون آمد آواز فوت مولانا برخاست  
 شیخ میگرفت و تاسف می کرد کہ یک  
 ذات بود "حامی شریعت" حیف کہ  
 آن نیز نہانہ رحمۃ اللہ علیہا۔  
 نے آپ سے آنکھیں نہیں ملائیں، اور جب شیخ اولیاءؒ نے یہ ہدایت دیکھی تو جلد  
 اٹھ کر باہر تشریف لے آئے، ادھر مولانا سنا میؒ کی روح نفس غصہ سے پردہ دار  
 کر گئی (ان اللہ اعلم) جب انتقال پر ملال کی خبر شیخ کے کانوں میں پڑی تو شیخ  
 مگر یہ کناں اظہار افسوس فرما رہے تھے کہ ایک ذات تھی "حامی شریعت"  
 حیف کہ وہ بھی نہ رہی۔

اس تاریخ کی روشنی میں جہاں یہ ثبوت عیاں ہو کر رہا کہ سلطان الاولیاءؒ محبوب الہی  
 شریعت مقدمہ کا بہت احترام اور علمائے دین کی از حد تعظیم و اکرام فرماتے تھے وہیں یہ واقعیت  
 و اہمیت بھی صداقت کے صاف و شفاف آئینے میں آشکارا ہو کر رہی کہ مولانا ضیاء الدین سنا میؒ  
 حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مقام و مرتبہ کا کامل طور پر لحاظ اور ان کی توقیر و عزت فرماتے  
 تھے کیونکہ انہی دستار کو شیخ المشائخ کے استقبال میں فرش راہ کر دینا اعتراف عظمت کی  
 دلیل ہے اور سلطان الاولیاءؒ کے چشم کا اشکیار ہونا اور اس حقیقت پر اظہار تاسف کرنا  
 کہ "حامی شریعت" ایک ذات تھی، آہ وہ بھی نہ رہی، اس کا روشن ثبوت ہے، مگر اس کے باوجود  
 تذکرہ نگاروں نے مولانا ضیاء الدین سنا میؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ "ضیاء سنا میؒ منکر  
 شیخ بود"



مقارن گار محمد اوشدا عظمیٰ کے خیال میں چونکہ مولانا ضیاء الدین سنائیؒ بقول شیخ محدث دہلویؒ:

شیخ اولیاء کو ہمیشہ "سماع" کی وجہ سے روک ٹوک کرتے تھے۔ لیکن شیخؒ سوائے معذرت و اطاعت کے مولانا ضیاء الدین سنائیؒ کے آگے دوسری مدش سے نہیں پیش آتے تھے۔

تو اس محاسبہ ہی کی وجہ سے یہ بات عام دشائے ہو گئی کہ منکر شیخ تھے اور مؤرخین نے بھی اس تاریخ میں جگہ دے دی مگر جیسا کہ ابھی آخری ملاقات کا واقعہ تحقیقی طور پر سامنے آیا کہ دونوں بزرگوں نے عظمت و احترام کا معاملہ فرمایا اختلاف صرف "سماع" کے بارے میں تھا، لہذا مولانا ضیاء الدین سنائیؒ "منکر فیخ" نہیں بلکہ "منکر سماع" تھے اور احتساب کا تعلق بھی حضرت شیخؒ کی محفل سماع سے تھا، جس کی مخالفت فرماتے تھے۔

اس کے علاوہ ایک دوسرا واقعہ بھی قاضی ضیاء الدین سنائیؒ کا احتساب ہی کے سلسلہ میں معروف ہے وہ یہ کہ:-

حضرت شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م ۱۲۴۵ھ) پر --- جذب و مستی کی ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ آپ عالم مشاہدہ میں غرق ہو جاتے چنانچہ اس توجہ باطن اور استغراقی محویت کی وجہ سے ظاہری امور کا خیال نہ رہتا، حضرت مولانا ضیاء الدین سنائیؒ جو ایک متشرع عالم تھے اور اپنے دور میں احتساب میں بڑی شدت سے پیش آتے، ان کو معلوم ہوا کہ حضرت بوعلی قلندرؒ شریعت کی ظاہری پابندی سے بے نیاز معلوم ہوتے ہیں، تو حضرت مولاناؒ دار و گیر کے لیے ان کے پاس حاضر ہوئے، حضرت بوعلی قلندرؒ نے ان کی طرف دو تین بار تیز نگاہیں اٹھائیں لیکن مولانا سنائیؒ پر ان نیم باز آنکھوں کا کوئی اثر نہیں ہوا، مولانا سنائیؒ واپس چلے گئے تو لوگوں نے حضرت بوعلی قلندرؒ سے کہا کہ

مولانا ضیاء الدین سنائیؒ نے آپ پر بڑی سختی فرمائی۔ یہ سُن کر حضرت بوعلی قلندرؒ نے فرمایا کہ میں نے دو تین بار اُن پر حملہ کیا لیکن انہوں نے شریعت کی زرہ ایسی پہن رکھی ہے کہ میری تیر چشم نے اُن پر اثر نہیں کیا۔ یہ

حضرت شرف الدین بوعلی قلندرؒ ہی کا ایک واقعہ شیخ عبدالحی محدث دہلویؒ نے بیان فرمایا ہے کہ :-

دو تہے موئے شوارب او (شرف الدین  
بوعلی قلندرؒ) بغایت دراز شدہ بود  
پس کس را مجال آں نبود کہ بوی از بقیص  
آنها کند، مولانا ضیاء الدین سنائی  
رحمۃ اللہ علیہ کہ جوش شریعت در برداشت  
مقراض بر گرفت و محاسن شریفش  
در بردست گرفتہ قص شوارب کرد،  
گویند کہ بعد ازاں شیخ ہمیشہ محاسن  
خود را بوسیدے و گفے کہ ایں در راہ  
شریعت محمدی گرفتہ شدہ است یہ  
دیتے اور فرماتے کہ: یہ ریش ہا کیسی مبارک ریش ہے کہ یہ شریعت محمدیؐ کی راہ  
میں پکڑی گئی اس لیے بوسہ اور قدر و منزلت کے قابل ہو گئی ہے)

۱۔ ہندوستان کی بزم رفتہ ص ۱۰۳ و ۱۰۴ ملخصاً، ۲۔ سیر الاقطاب و اخبار الابرار ص ۱۳۵  
حضرت اقدس حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ العزیز اس واقعہ کے تحت حضرت شرف الدین  
بوعلی قلندرؒ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: (باقی صفحہ ۴۵ پر)

اس تاریخی واقعہ سے جہاں حضرت شرف الدین بوعلی قلندرؒ کا احترام شریعت اور اتباع سنت سے مسرور ہوتا ثابت ہوتا ہے وہیں یہ حقیقت بھی مخفی نہیں رہی کہ مولانا ضیاء الدین سنہی قدس سرہ العزیز شریعت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم) پر شدت کے ساتھ عمل کرنا اور کرانا بھی اُن کا خصوصی کردار تھا، یہی وجہ ہے کہ ظاہر شریعت کے خلاف ہونے والے معاملہ میں جستی کے ساتھ حاضر ہو کر نہ صرف جذبہ عمل بیدار فرماتے بلکہ عملی نمونہ پیش فرما کر آئندہ عمل کے لیے شریعت کی نورانی مشعل جلا دیتے تھے، اسی جوہر اور کمال کی طرف حضرت بوعلی قلندرؒ نے ارشاد فرمایا کہ :

”میں نے دو تین بار اُن پر حملہ کیا لیکن انھوں نے شریعت کی زرہ ایسی پہن رکھی ہے کہ میری تیر چشتم نے اُن پر اثر نہیں کیا۔“ (واللہ تعالیٰ اعلم) (ختم شد)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴) ”باوجود مجذوب ہونے کے شریعت کی کس قدر محبت و عظمت ان کے قلب میں تھی“ (السنتہ الجلیہ ص ۷۲)

حضرت سیدی و مرشدی مولانا شاہ ولی اللہ صاحب الہ آبادی قدس سرہ العزیز ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

بسمان اللہ! ان حضرات کو شریعت محمدی کے ساتھ کس درجہ شغف تھا کہ جو چیز اس کی جانب منسوب ہو جاتی اس کا بھی یہ حضرات اس درجہ احترام فرماتے چنانچہ ان کا حال ہی یہ تھا کہ :

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است      افتم بیائے خود کہ بکویت رسیدہ است  
ہر دم ہزار بوسہ زخم دست خویش را      کو زامنت گرفتہ بسویت کشیدہ است

(نسبت صوفیہ ص ۴۳)



# اسلام اور قومی یکجہتی

مولوی اسعد صاحب اسرائیلی (فاضل دیوبند)

ملک میں جب بھی کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے، ہمارے رہنما بڑی تیزی کے ساتھ قومی یکجہتی کے مسئلے پر سوچنے لگتے ہیں۔ ایک ایسا ملک جو مختلف تہذیبوں اور مذاہب کا ایک حسین گلدستہ ہو اور جس کی یہ انفرادیت اس کی ایک خوبی سمجھی جاتی ہو اس کے اندر اس طرح کے واقعات کا اعادہ اس کے ماتھے پر کلنک کا ایک ٹیکہ ہے، اور ہر مذہب، ہر سیاسی جماعت، اور ہر مکتب فکر سے وابستہ لوگوں کے لیے ایک لمحہ فکر یہ ہے۔

جو لوگ اسلام کے لیے کام کر رہے ہیں ان کے لیے تو فرقہ وارانہ کشیدگی کی صورت حال اور بھی زیادہ افسوسناک اور تشویش انگیز ہے، ایک ایسے ماحول میں جہاں جذباتی ہم آہنگی مفقود ہو چکی ہو اور جہاں دوسرے کو شک و شبہ یا نفرت کا نگاہ سے دیکھا جا رہا ہو ایک اچھی بات کو بھی منوالینا یا سمجھا دینا بہت مشکل ہوتا ہے، دعوت حق کے لیے ایک ایسا ماحول بہت ضروری ہے جہاں اسلام اور ملت اسلام کو قدر اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو نہ کہ نفرت اور شک و شبہ کی نگاہ سے۔

ہر بار جب ہندو مسلم فساد ہوتا ہے طرح طرح کے نظریات نام نہاد مفکرین کی فطرت سے سامنے آتے لگتے ہیں کچھ انتہا پسند حضرات ان فسادات کو ”اسلام کی فرقہ وارانہ ذہنیت“ کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک اسلام اپنے پیردکاروں کی جذباتی

و ذہنی تربیت کرتا ہی اس انداز میں ہے کہ وہ دوسرا نقطہ نظر رکھنے والے لوگوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کے نظریہ کے مطابق قومی یک جہتی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اسلام کی علیحدگی پسندانہ ذہنیت باقی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ قومی یک جہتی کے لیے مسلمانوں کا ”بھارتیہ کرن“ اور ”قومی دھارے“ میں ان کی شمولیت ضروری ہے اور یہ وہ کم از کم مطالبہ ہے جو ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں سے کیا جاسکتا ہے، قومی دھارے میں مسلمانوں کی شمولیت کا مفہوم ان کے نزدیک یہ ہے کہ مسلمانوں کو اگر اپنی انفرادیت برقرار رکھنے پر اتنا ہی اصرار ہے تو وہ اپنی عبارت کے طریقے عام ہندوستان سے مختلف رکھ سکتے ہیں، لیکن تہذیبی و فکری سطح پر انھیں اس ملک کی اکثریت کے ساتھ چلنا ہوگا۔ انھیں اپنی تاریخ کے میر و ہندوستانی مآخذ تاریخ سے لینے ہوں گے، انھیں اسلام کا ایک ہندوستانی ایڈیشن تیار کرنا ہوگا اور ”ٹی ر و ایٹ“ کو ”وطنی قرآن“ کے مقابلے میں ثانوی اہمیت دینا ہوگی۔ انھیں پہلے ”بھارتی“ بننا ہوگا اور بعد میں مسلمان“ کچھ ترقی پسند لوگ اس سے بھی آگے بڑھ کر سرے سے مذہب ہی کو خدا کی جڑ قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مذہبی جنون ہمیشہ ہی بے گناہ عوام کا خون بہاتا رہا ہے، اس جنون نے صدیوں تک عوام کو برسرِ پیکار رکھا ہے۔ اور یہ مذہبی وابستگی، جو ایک نسلی نقص سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی جب تک ختم نہیں ہو جائے گی لوگ امن چین سے نہیں رہ سکتے۔ اس کے برعکس کچھ لوگ مذاہب کی نفی نہیں تمام مذاہب کا اثبات کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ تمام مذاہب کو ختم کرنے کے بجائے ایک عالمگیر مذہب میں تحلیل کر دیا جائے جس کا عنوان ”انسائنت“ ہو اور تمام مذاہب کو اس کی مختلف تعبیریں قرار دیا جائے۔ اس مختصر مقالے میں، میں اس مسئلہ پر اسلامی نقطہ نظر سے روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مذہب اور خاص طور سے اسلام ہرگز ہرگز سماج کے لیے فرقہ دارانہ کشیدگی جیسے مسائل کھڑے نہیں کرتا، بلکہ اس کے برعکس وہ لوگوں میں برادرانہ جذبات کو

فروغ دیتا ہے، وہ سماج کے مختلف طبقات میں میل ملاپ اور محبت کی پرورش کرتا ہے ؟  
 فی الواقع یہ مذہب نہیں، مذہب کی غلط تعبیر ہے جو اس طرح کے مسائل پیدا کرتی ہے۔  
 اس بے فرقہ دارانہ ہم آہنگی کے لیے مذہب کو بدنام کرنے، اسے ختم کرنے کی تدابیر سوچنے،  
 ایک نیا مذہب ایجاد کرنے اور مذہبی تحریکوں کو خلاف قانون قرار دینے کی ضرورت نہیں  
 ہے، اس کے برعکس ان مذہبی تحریکوں کو مذہب کا صحیح تعارف کرانے کی کوششوں میں زیادہ  
 سے زیادہ تعاون دینے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک فرقہ دارانہ تعصب کا تعلق ہے، اسلام اس کا شدید مخالف ہے، ہمارے  
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ لیس منا من دعا الی العصبیۃ۔ ومن  
 عاش علی العصبیۃ۔ ومن مات علی العصبیۃ (او کا قال) وہ شخص ہم میں  
 سے نہیں ہے جو تعصب کی طرف لوگوں کو بلائے، جو تعصب کے ساتھ زندہ رہے، اور  
 جو تعصب کی راہ میں جان دے۔ اس واضح حدیث کی موجودگی میں اسلام پر تعصب اللہ  
 فرقہ پرستی کا الزام لگانا قطعاً بددیانتی ہے۔

اسلام واحد مذہب ہے جس نے ۱۴۰۰ سال پہلے دنیا کے سامنے آزادی فکر  
 و خیال کا نعرہ بلند کیا، جب کہ ۴۰۰ برس پہلے دنیا اس تصور سے بھی نا آشنا تھی۔ اور قرآن  
 میں کہا گیا۔ لَا اِکْرَآکَ فِی الدِّیْنِ۔ قَدْ تَبَیَّنَ السُّرْمَتُ الْمُغِیُّ (لقرآن کا پٹا)  
 مذہب کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے، ہدایت اور گمراہی دونوں چیزیں بالکل  
 کھلی ہوئی ہیں اور ہر شخص جو راستہ چاہے اپنا سکتا ہے۔

”وحدتِ نسلِ انسانی“ اسلام کا بنیادی نظریہ ہے اور اس بارے میں اسلام  
 کا نقطہ نظر حسب ذیل نکات میں سمٹ آتا ہے۔

۱۔ قرآن کے مطابق یہ کائنات ایک ایسے خدا کی بنائی ہوئی ہے جس کا رشتہ



تمام انسانوں سے برابر ہے وہ سب بنی کا پروردگار ہے (الحمد لله رب العالمین لغاتہ) اور اس کی ہدایت تمام انسانوں کے لیے ہے۔ (إِنَّمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ اَسِيْدُكُمْ حَيْثُ مَلَاحِرَافٍ ۙ) یہ اسلام کی بتائی ہوئی پہلی نشانی بنیاد ہے جس کی بنیاد پر سارے انسان ایک ہی خدا کا خاندان قرار پاتے ہیں۔ (اخلاق عیال اللہ - مشکوٰۃ)

۲۔ قرآن بتاتا ہے کہ دنیا کے سارے انسان ایک آدم اور ایک حوا کی اولاد ہیں (يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ ۖ وَالْحَبْرَاتُ لِيٰ) تمام انسانوں کے ماں باپ ایک ہیں اور اس رشتہ سے وہ آپس میں بھائی بھائی بن جاتے ہیں۔ (كونوا عباد الله اخوانا، مشکوٰۃ) اس حقیقت کی طرف رسول کریمؐ نے اپنے خطبہ غزوات میں اشارہ فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "لا فضل لعربي على عجمي ولا عجمي على عربي ولا اسود على احمرو ولا احمرو على اسود، ان انسان كلهم بنو ادم وادم من تراب (او كما قال) کسی عربی کو کسی عجمی پر کسی عجمی کو کسی عربی پر کسی گورے کو کسی کالے پر کسی گورے کو کسی پرکڑی برتری حاصل نہیں ہے۔ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔

یہ اسلام کی بتائی ہوئی دوسری بنیاد ہے جس کی بنا پر ساری نسل انسانی نسب کی بنیاد پر برادر نہ رشتہ میں بندھ جاتی ہے۔

۳۔ قرآن بتاتا ہے کہ دین صرف اسلام ہے اور جتنے بھی لوگ خدا کے پیغمبر کے روپ میں دنیا میں آئے ان سب کی تعلیم ایک ہی تھی (وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنْهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاسْبُدْ وَبِرَّيْ) یہ کہ صرف خدا کو کارساز مطلق مانا جائے اور اسی کی عبادت کی جائے۔ حضرت موسیٰؑ ہوں، حضرت یسعیؑ ہوں، یا ادر کوئی نبی جو کس بھی ملک اور کسی بھی نسل میں پیدا ہوئے ہوں، سب ایک ہی بات کہتے تھے، ایک ہی نیاں نیاں سفر کے نتیجے میں وہ تعلیم مختلف

..... نماز، ہیکے روپ میں آتے ہمارے سامنے ہے ورنہ درحقیقت یہ ساریت

ہو یہ یہودیت ہو، ہندو مذہب ہو یا اور کوئی مذہب، یہ سب تاریخ کے مختلف ادوار میں ایک ہی سچائی کی طرف بلا تے رہے ہیں۔

شَمَاعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى رَبِّهِ

”اے محمد! ہم نے تمہاری طرف وہی چیز بھیجی ہے جو تم سے پہلے نوح، ابراہیم، موسیٰ و عیسیٰ کی طرف بھیجی تھی“

اسی لیے قرآن میں تمام پیغمبروں پر بلا تفریق ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔ یہودیت موسیٰ علیہ السلام کو مانتی ہے لیکن عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں، عیسائیت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتی ہے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں، لیکن اسلام حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور تمام پیغمبروں پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے وہ خواہ کسی بھی نسل میں کوئی بھی زبان بولتے ہوئے اور کسی بھی ملک میں پیدا ہوئے ہوں جس میں ہندوستان بھی یقیناً شامل ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے ”لِكُلِّ قَوْمٍ مَّعَادٍ“ (پ ۲۴) ہر قوم میں ایک نبی پیدا ہوا ہے۔

ظاہر ہے یہ چیز نسل انسانی کو نسب اور رشتہ کی وحدت کے علاوہ ایک نظریاتی وحدت بھی فراہم کرتی ہے اور قرآن کے مطابق انبیاء اسی لیے مبعوث کیے جاتے ہیں تاکہ اس نظریاتی وحدت اور اس یکپہتی کو بنائے رکھیں۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً - فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِيُحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (پ ۲)

”لوگ پہلے ایک ہی قوم تھے، پھر اللہ نے نبیوں کو خوش خبری سنانے والا اور انجام بد سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے جھگڑے میں ایک جہتی پیدا کر سکیں“

قرآن کے مطابق یہ دنیا خدا کا ایک حسین شاہکار ہے، اس کی ہر ہر چیز میں ایک توازن اور ایک سلیقہ ہے۔ خدائے کائنات کے دست قدرت سے تراشی ہوئی یہ دنیا

انسان کے پاس ایک امانت ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا کو اسی طرح خوبصورت، متوازن، اور خوشگوار بنائے رکھے جس طرح اس کے خدائے اے سونپا ہے اور اپنی کسی حرکت سے اسے انتشار، بدمستی، اور بے چینی کا شکار نہ بنائے قرآن کے الفاظ ہیں:

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا - (پ ۸) "اور زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو جب کہ خدائے اے سنوار کر تمہیں سونپا ہے" قرآن کہتا ہے کہ زمین میں انتشار، بدمستی اور بدمستی خود انسان کے بنائے ہوئے اور بدمستی سے نظریات کا نتیجہ ہے یہ خود اس کی کارستانی ہے جو زمین میں بگاڑ پیدا کرتی اور اس کا سکون برباد کر دیتی ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (پ ۲۶) خنکی اور تری میں بگاڑ خود انسان کے اپنے اعمال کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔

یہ ہے قرآن کے نظریات کا ایک خلاصہ۔ ظاہر ہے کہ ان نظریات کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہے جو "فساد فی الارض" کا موجب بن سکتا ہو جو مذہب "فساد فی الارض" کا سب سے بڑا دشمن ہوا اور جس کا نام "اسلام" خود اس کی سلامت روی اور امن پسندی کی طرف اشارہ کرتا ہو وہ کبھی بھی ایسی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا جو زمین میں بگاڑ پیدا کرنے والی ہوں۔ لیکن اسلام جب اپنی دعوت لوگوں کے سامنے رکھتا ہے تو بہت سے وہ لوگ جو اسلامی نظریات سے اتفاق نہیں رکھتے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس طرح تصادم کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تصادم آگے بڑھ کر "قَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ" تک منتج ہوتا ہے لیکن اسلام اس صورت حال کو ٹالنے کی انتہائی حد تک کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ وہ سلامتی کا مذہب ہے اور "فساد فی الارض" اسے پسند نہیں ہے۔

قرآن کے نزدیک خیر پسندی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔  
وَأَقِمُّوا حَقَّ الدِّينِ حَنِيفًا - فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ  
عَلَيْهَا - (پ ۲۱)



”تو اپنا منہ یک سو ہو کر خدا کے بتائے ہوئے ضابطہ حیات کی طرف رکھ، کیونکہ یہ دین انسانی فطرت کا ترجمان ہے اور خدا نے لوگوں کے خیر میں اسے ڈال دیا ہے۔“

اس لیے عام لوگ کبھی بھی خدا کے عطا کیے ہوئے ضابطہ حیات میں رکاوٹ نہیں بن سکتے، قرآن کے نزدیک دو گروہ ہی دعوت حق کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ یہ دو گروہ ہیں: ۱۔ سرمایہ دار۔ ۲۔ برسر اقتدار لوگ یا عوامی ٹاپ کے لیڈر جن کی قیادت کا دار و مدار عوام کے استحصال پر ہوتا ہے۔ یہی دو گروہ ملک کی سلامتی کے اصل دشمن ہوتے ہیں۔

۱۔ سرمایہ دار طبقہ اسلام کی دعوت حق کا اس لیے مخالف ہوتا ہے کہ یہ دین اسے آزاد معیشت کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ اس کے لیے حلال اور حرام کی قیدیں لگاتا ہے، اسلام کے بتائے ہوئے نظام معیشت سے آزاد ہو کر آدمی جب سرمایہ داری کی راہ پر چل نکلتا ہے تو سارا سماج فساد سے بھر جاتا ہے، کیونکہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کا دار و مدار رقابتیں، ہوس اضافہ (سکانرپ ۳۰) مدہوشی (علق پ ۳۰) اور استحصال (بقرہ پ ۳) پیدا کرتی ہے، جس کے نتیجے میں انسانی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ قرآن نے اسے معیشتاً ضنکاً گھسی ہوئی زندگی (پ ۱۷) کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ سماجی امن کی بربادی میں سرمایہ داروں کا رد و واضح کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَدْ صُفِّرْتُ بَيْنَهُمُ الْغُلُوبَ ۚ  
فَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَدْ صُفِّرْتُ بَيْنَهُمُ الْغُلُوبَ ۚ  
فَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَدْ صُفِّرْتُ بَيْنَهُمُ الْغُلُوبَ ۚ

”جب ہم کسی بستی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو آزاد کر دیتے ہیں۔ وہ حد سے گزر جاتے ہیں، خدا کا کہا پورا ہوتا ہے اور بستی برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔“

ب: برسر اقتدار گروہ اور عوامی ٹاپ کے لیڈروں کو صحیح اسلامی دعوت سے اپنے تخت اقتدار کے لیے خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اس لیے وہ دعوت حق کے مخالف

ہو جاتے ہیں، وہ دعوتِ حق کو دبانے کے لیے عوام میں طبقاتی کش مکش کا ماحول پیدا کرتے ہیں جس کے نتیجے میں زمین فساد سے بھر جاتی ہے، اس ضمن میں فرعون کی مثال دیتے ہوئے قرآن نے کہا ہے :

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضَعِفُ طَائِفًا مِنْهُمْ يُدَبِّرُ لَكُمْ أَسْنَاءَهُمْ وَتَبْتَحِي نِسَاءَهُمْ، رَأَيْتُمْ كَانِ مِنَ الْمُفْسِدِينَ (پا) ”فرعون زمین میں بڑا مغرور ہو گیا تھا۔ اس نے زمین کے باشندوں میں طبقاتی کش مکش پیدا کر دی تھی، وہ ایک طبقہ کو جان بوجھ کر بیک ورڈ بنا رہا تھا، ان کے بچوں کو ذبح کر رہا تھا اور ان کی عورتوں کو چھوڑ رہا تھا، یقیناً وہ زمین میں فساد پھیلا رہا تھا۔“ اسلام ہر انسان کو مذہب کی آزادی کا حق دیتا ہے (لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ) (پا) لیکن وہ اپنے لیے بھی یہ حق مانگتا ہے کہ وہ ہر انسان تک خدائی پیغام کے روپ میں پہنچ سکے۔ قرآن کے نزدیک ”دعوتِ حق“ میں جو لوگ رکاوٹیں کھڑی کرتا چاہتے ہیں اور سچائی کی تبلیغ کا حق چھین لینا چاہتے ہیں وہ دراصل زمین میں فساد پھیلانے کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔ اور اس کا انجام خود ان کے حق میں بہتر نہیں ہو سکتا۔

شاید قرآن مسٹر تیاگی (جنہوں نے گزشتہ پارلیمنٹ میں تیاگی بل پیش کیا تھا) جیسے لوگوں کو ہی مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے :

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ۔

”وہ لوگ جنہوں نے دعوتِ حق کا انکار کیا اور تبلیغِ حق کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی ہم اس کی سزا پر سزا انہیں دیں گے چونکہ وہ زمین میں جھگڑا کر رہے ہیں۔“

میں نے اوپر کہا ہے کہ اسلام اپنے اس دعوے سے باز نہیں آ سکتا کہ تمام انسانیت

کے لیے صحیح ضابطہ حیات صرف وہی ہے، وہی انسانیت کے لیے مرکز امید اور اس کے درد کا درماں ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو لوگ اسلام کی دعوتِ حق کو نہیں مانتے وہ اسلام کے نزدیک نفرت اور انتقام کے مستحق ہیں۔ اس کے برعکس وہ ہماری ہمدردی، غم خواری اور ہماری محبت کے مستحق ہیں کیونکہ وہ اس عظیم نعمت سے محروم ہیں جو انھیں ابدی ہلاکتوں سے بچانے والی ہے، انھیں دیکھ کر ہماری آنکھیں غصے سے سرخ نہیں ہونی چاہئیں بلکہ ان میں حقیقی ہمدردی اور غم خواری کے آنسو جھپک آنا چاہئیں، ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ہر انسان تک اس دعوتِ حق کو پہنچا دینے کا ایسا غم تھا کہ آپ کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ خود خدا کو یہ توجہ دلاتا پڑی تھی:-

طه - مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ - (طہ ۱۶)

”ہم نے یہ قرآن اس لیے تو نہیں اتارا تھا کہ آپ دکھ میں ہی ڈوب کر رہ جائیں“

دعوتِ حق کے علمبردار جب دنیا کے سامنے اسلام کے داعی بن کر آئیں گے تو انھیں غیر مسلم دنیا کی طرف سے مزاحمت اور سخت و جدال کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ ایسی حالت میں کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے بچنے کے لیے اسلام نے درج ذیل ہدایات دی ہیں:

۱۔ دوسروں کے جذبات کا خیال رکھا جائے، اور اسلام کی دعوت پیارا اور محبت کے ساتھ ان تک اس انداز میں پہنچائی جائے کہ ان کی قومی غیرت، یا انا کو کوئی ٹھیس نہ لگے۔

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ - (طہ ۱۶)

”اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور اچھی نصیحت سے بلاؤ۔ اور ان سے اس

طریقے سے بحث کر دو جو ان کے لیے سب سے زیادہ قابلِ قبول ہو۔



۲۔ دوسروں کے مذہبی عقائد ان کے مبرودوں، اور ان کی قابل احترام شخصیات کا مذاق نہ اڑایا جائے، ان کی عبادت گاہوں کا نہ صرف احترام بلکہ تحفظ کیا جائے، اور تمام پیغمبروں پر بلا کسی تفریق کے ایمان لایا جائے۔

(۱) وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ - (ب ۷)

”اور وہ خدا کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں برا بھلا نہ کہو۔“

(ب) وَلَا تَقْعُ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ لَهْدٍ مَتَّ صَوَامِعَ وَصَلَوَاتٍ وَصَلَّحُوا رَا لِحْجَ بِآيَتِ ۴۰

”اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خالق ہیں، مگر جے، معابد اور مسجدیں مسمار کر دی جائیں۔“

(ج) لَا تَفَرِّقْ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رَّبِّكَ، (د) ہم رسولوں پر ایمان لانے میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

۳۔ دوسروں کے حقوق تسلیم کیے جائیں، اور ان کے حقوق پر دست درازی نہ کی جائے، ہر انسانی جان کا احترام کیا جائے اور ایک انسانی جان کی قیمت تمام انسانی زندگی کے برابر سمجھی جائے۔

وَاللَّهُ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (د ۱)

”اللہ تعالیٰ انصاف کرنے، احسان کرنے اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے، اور بُرے کاموں، فحش چیزوں اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرنے کو منع کرتا ہے۔“

(ب) مَن قَتَلَ نَفْسًا لِّغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا (ب ۱)

”جس نے بلا کسی جرم کے یا صرف زمین میں فساد پھیلانے کی غرض سے

کسی ایک انسان کو قتل کر دیا گو یا اس نے ساری نسل انسانی کو قتل کر دیا۔

(ج) میدان عرفات میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اَصْوَالَكُمْ وَرِدِّ مَاءَكُمْ حَرِّصَتْ عَلَيْكُمْ (اد کا قال)

”اے لوگو، تمہارے مال اور تمہارا خون ایک دوسرے پر حرام کر دیے گئے ہیں۔

۳۔ اسلام کے علمبرداروں کو دوسروں کی طرف سے اگر کوئی رکھ پیچھے، ان کی جان، مال یا عزت پر حملہ ہو تو اسلام کی ہدایت ہے کہ:

(۱) اس کا بدلہ صرف بقدر ضرورت لیا جائے۔ انتقامی جذبہ میں حد سے آگے نہ بڑھا جائے، بلکہ بہتر ہے کہ معاف کر دیا جائے۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ۔ وَجَنَآءُ سَيِّئَاتِهِمْ سَبِيلًا  
مِّمَّنْهُمْ، فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ۔ اِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ۔  
(۲) ”مومن لوگ، جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو مقابلہ کرتے ہیں۔ برائی کا بدلہ  
وہی ہی برائی ہے، پھر جو کوئی معاف کر دے، اور رفع دفع کرنا چاہے تو اس کا اجر خدا  
کے ذمہ ہے اور خدا ظالموں کو یقیناً پسند نہیں کرتا۔

(ب) ناخوشگوار صورت حال کو خوش اسلوبی سے ٹال دیا جائے:-

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ اِنِّیْ مِنَ  
الْمُسْلِمِينَ، وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ۔ اِذَا فَعَلْتَ بِالنَّفْسِ اِحْسَنًا  
فَاِذَا الَّذِیْ۔۔۔ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَیٌّ حَمِیمٌ (پ)

”اگر شخص سے بہتر بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے، اچھے کام کرے اور

کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ برائی اور بھلائی ہرگز برابر نہیں ہو سکتی۔ تم برائی کو

خوش اسلوبی سے ٹال دو تو تم دیکھو گے کہ جو تمہارا دشمن تھا گہرا دوست بن گیا ہے۔

(ج) برائی کے جواب میں بھلائی کی جائے۔

أُولَٰئِكَ يُدْعَوْنَ أَجْرَهُمْ مِمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِأَحْسَنَةِ  
السَّيِّئَةِ (القصاص)

وہ ان لوگوں کو دہرا اجر دیا جائے گا۔ کیوں کہ انھوں نے برائی پر صبر کیا، بلکہ برائی کے بدلے بھلائی کی۔

(د) صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہو جائے تو وطن چھوڑنا گوارا کیا جاسکتا ہے لیکن فساد فی الارض نہیں۔

يُعَاذِي الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ أَرْضِيَّ وَاسِعَةٌ فَإِنِّي فَاعِيْدُونَ - كُلُّ  
نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ، وَالَّذِينَ آمَنُوا وَتَتِمُّوا الصَّلَاةَ  
كَلْبَتِمْ لَنُثَبِّتَهُمُ مِنَ الْجَنَّةِ غُرًا فَاتَجَرَّيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَلِدِ فِيهَا  
وَأَجْرُ الْعَالَمِينَ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (عنكبوت)

”اے میرے مومن بندو! میری زمین بہت بڑی ہے تم میرے ہی پرستار بنے رہو،  
بالآخر ہر ایک کو مرنا ہی ہے، تم بھی ہماری طرف لوٹ کر آؤ گے۔ نیک مومنوں کو ہم ایسے  
محلوں کی خوشخبری سناتے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔  
ان کے لیے کیسا اچھا انعام ہے جنھوں نے مشکلوں پر صبر کیا اور اپنے خدا پر بھروسہ کیے۔“  
(۵) اشتعال انگیز پروپیگنڈے کا جواب نہ دیا جائے۔

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَكَلَّمُوا أَعْمَالَكُمْ  
عَلَّامٌ عَلَيْكُمْ لَا تَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ (القصاص)

”اور مومنین جب بے بنیاد باتیں سنتے ہیں تو نظر انداز کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہارے  
کام تمہارے لیے اور ہمارے کام ہمارے۔“ لیے تم اسکی میں خوش رہو۔ ہم تو جاہلوں کا  
سارویہ اختیار نہیں کریں گے۔

۶۔ انتہا پسندوں کی قیادت تسلیم نہ کی جائے۔



وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (الشعراء)

”اور انتہا پسندوں کی قیادت تسلیم نہ کرو یہ لوگ زمین میں صرف فساد پھیلاتے ہیں، اور کوئی تعمیری کام نہیں کرتے۔“

۷۔ ہمیشہ حق بات کی طرفداری کی جائے خواہ یہ طرفداری اپنے ہی خلاف جاتی ہو۔

۱۔ كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُحِبُّوا أَنْ تَكُونَ لَكُمْ أَلْفَاظٌ (النساء پ)

تم انصاف کے علمبردار بنو۔ چاہے انصاف تمہارے خلاف جاتا ہو۔

(ب) وَلَا يَجْعَلْ لَكُمْ شَنَّاتُ قَوْمٍ عَلَى أَنْ لَا تَعْدُوا (المائدہ پ)

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم نا انصافی پر اتر آؤ۔

۸۔ کسی ناخوشگوار صورت حال میں انوار بازوں کی حوصلہ شکنی کی جائے اور افواہیں

اڑانے کی اجازت نہ دی جائے۔

لَنْ يَنْفَعَكَ الْغَضُّ بِكَ بِهَمِّ قَوْمٍ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَأَمْرٌ جَعُولٌ

فِي الْمَلِكِ بَيْنَكَ كَغَضِّ بَيْتِكَ بِهَمِّ قَوْمٍ لَا يُجَادِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا مَلْعُونِينَ  
أَيُّهَا الْفُقَرَاءُ آخِذُوا وَقْتَكُمْ قَلِيلًا سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ۔

(پ ۲۲) ”اگر منافق لوگ اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور وہ جو مدینہ میں ہیجان

انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی

کرنے کے لیے تمہیں اکٹھا کھڑا کریں گے، پھر وہ مشکل ہی سے تمہارے ساتھ رہ سکیں گے۔

ان پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوگی، پکڑے جائیں گے اور مارے جائیں گے، مافی

میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔“

(۹) اچھے کاموں میں سب کے ساتھ تعاون کا رویہ رکھا جائے۔

تَعَاذَ نُوْرُ الْعَلِيِّ وَالْبِرِّ وَالْتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاذُ نُوْرُ الْعَلِيِّ وَالْعُدْوَانِ۔

رامائند کا، پٹ)

”نیکی اور بھلائی کے کاموں میں دوسروں کا ساتھ دو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں نہیں۔“

(۱۰) ناکافی اور غیر مصدقہ ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کی بنا پر کوئی رائے نہ قائم کی جائے کیونکہ اس قسم کی جذباتیت دعوت حق کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔  
(۱۱) **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِمِثْلِ الَّذِي تَصِيبُونَ** اعلیٰ مَا فَعَلْتُمْ فِي مِلَّةِ الْبِجَارِ (۶)  
اگر کوئی غلط آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو بے جا بوجھ نقصان پہنچا دو اور پھر اپنے کیے پر پچھتاؤ۔

(ب) **وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ** - (ص: ۲۶)

اور محض اپنی خواہش نفس کی تسکین نہ کرو کیونکہ یہ چیز تمہیں راہ حق سے بھٹکا دے گی۔

۱۱۔ ایک شخص یا ایک گروہ کے اعمال کے لیے دوسرے غیر متعلق لوگوں کو ذمہ دار قرار نہ دیا جائے۔

**لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ** (الانعام: ۶۴)

ہر انسان صرف اپنی غلط کاری کا ذمہ دار ہوگا اور دوسرے کا بوجھ اس کے سر نہیں ڈالا

جائے گا۔

اسلام ہر قسم کے نسلی، قومی، لسانی، حتیٰ کہ وطنی تعصب کا بھی سخت مخالف ہے۔ اور اس مخالفت کے اظہار میں اس نے کوئی جفا نہیں رکھا ہے، اس کے باوجود ترقی پسند اور کمیونسٹ حضرات فرقہ وارانہ کشیدگی کے لیے مذہب کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام وحدت انسانی میں یقین رکھتا ہے جب کہ کمیونزم کی بنیاد ہی طبقاتی کشمکش اور جذباتی مادی پر ہے۔ دنیا میں کمیونزم ہی ایک ایسا نظام حیات ہے جو اپنے فروغ کے لیے طبقاتی جدوجہد کو

لازمی قرار دیتا ہے اور آج کمیونزم کے نام پر دنیا جس طرح ٹکڑوں میں تقسیم ہے، بے گناہ عوام جس طرح ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں، اور کمیونزم کی مختلف تفسیریں جس طرح فساد فی الارض کی موجب بن گئی ہیں، اس کے بعد بھی مذہب کو امن و سلامتی کا دشمن قرار دینا بدترین قسم کی ڈھٹائی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام ”قتال فی سبیل اللہ“ کی بھی اجازت دیتا ہے۔ لیکن یہ دعوت دین کا بالکل آخری مرحلہ ہے جب کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا ہو۔ قرآن کے الفاظ میں ”قتال فی سبیل اللہ کی یہ اجازت خود ”فساد فی الارض“ کو ختم کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ (پ ۱ بقرہ آیت ۲۵۱)

”اور اگر اللہ کچھ لوگوں کے ذریعے کچھ لوگوں کو باز نہ رکھے تو زمین فساد سے بھر جائے، لیکن اللہ درحقیقت سب کے لیے بڑا مہربان ہے۔“

”قتال فی سبیل اللہ“ کا یہ مرحلہ اجتماعی سطح پر اصلاح حال کی تمام تدبیریں ناکام ہو جانے کے بعد دوبار آتا ہے اور اس کا کوئی بھی تعلق ”مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی روابط“ سے نہیں ہے۔ قتال فی سبیل اللہ کا یہ مرحلہ کسی ظالم اور خدا کی راہ سے روکنے والی سلطنت کے مقابلے میں پیش آتا ہے اور عوام سے اس کا کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

اس مقالہ کے اندر میں فرقہ دارانہ یکجہتی کے لیے اسلام کی ہدایات ہی کا ایک مختصر جائزہ لے سکا ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے تمام مذاہب انسانی زندگی کی بنیادی اقدار پر متفق ہیں۔ سچائی، انصاف، صبر و تحمل، ضبط نفس، غمخواری و ہمدردی۔ فیاضی و فراخ دل۔ امداد یا ہمدردی یہ ساری اقدار تمام مذاہب کی تعلیم میں موجود ہیں۔ ہر مذہب رحم دلی، سلوک اور محبت کا درس دیتا ہے۔ ہر مذہب ایک آن دیکھی طاقت کو ہمارے تمام اعمال کی نگران قرار دیتا ہے۔ ہر مذہب اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ انسان کو اپنی اچھائیوں اور برائیوں کا بدلہ



ضرور سمجھنا پڑے گا۔

یہ ساری تعلیمات ایک سچے مذہبی انسان کو ایک فرض شناس، ایک ذمہ دار اور غم خوار فرد بنانے کے لیے بہت کافی ہیں۔

ہندوستان میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا آپ جائزہ لیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ کسی بھی فرقہ کے مذہبی حضرات ان فسادات کے پیچھے کبھی نہیں ہوتے بلکہ سماج کا وہ تیسرا طبقہ جسے مذہب تو کیا کسی بھی چیز سے سروکار نہیں ہوتا، ان ہنگاموں کے پیچھے لٹا ہے۔ قتل ہونے والے اور مرنے والے لوگ بھی مذہبی لوگ نہیں ہوتے بلکہ وہ عام لوگ ہیں جن کی ذاتی زندگی پر مذہب کی گرفت کچھ ایسی مضبوط نہیں ہوتی۔

میں نہیں سمجھتا کہ صحیح مذہبی تعلیمات پر اگر عمل کیا جائے تو فرقہ وارانہ تناؤ کیسے پیدا ہو سکتا ہے، اس کی ایک مثال سمجھیے۔ ایک مسلمان غنڈہ کسی ہندو لڑکی کو چھیڑتا ہے اور جب اسے گرفتار کیا جاتا ہے تو مسلمان اس کے طرفدار بن جاتے ہیں، ظاہر ہے ایسی صورت میں جوابی اشتعال ضرور سمجھڑکے گا۔ صحیح اسلامی تعلیمات کے مطابق اگر مسلمان اپنے لڑکے کو سمجھاتے اور اسے سزا دیتے، اسے بتاتے کہ کسی کی بہو بیٹی کی عزت اپنی بہو بیٹی سے کم نہیں ہوتی۔ تو یہ رویہ یقیناً فرقہ وارانہ خیر سگالی کی فضا پیدا کرتا۔ اسی طرح ایک ہندو لڑکے کی غلط حرکت پر جب اسے گرفتار کیا جاتا ہے اور ہندو سجائے اس کی گرفتاری کا خیر مقدم کرنے کے سٹھانہ کا گھیراؤ کر لیتے ہیں تو دوسری طرف اس کا رد عمل ہونا لازمی ہے۔

قرآن نے مسلمانوں کو سمجھایا ہے کہ تم انصاف کے علمبردار بنو چاہے اس کی زد تمہارے خلاف ہی پڑتی ہو۔ درحقیقت ایسے لوگ کسی فرقہ وارانہ کشیدگی کے لیے کبھی ذمہ دار نہیں ہو سکتے جنہیں اپنی ذات کی جگہ ”انصاف“ عزیز ہو۔

”نظریہ وحدتِ ادیان“ فرقہ وارانہ کشیدگی کا حل ہرگز نہیں ہے جیسا کہ بعض

دانشور سوچتے ہیں ”تمام مذاہب کو ختم کر کے ایک مذہب بنا دیا جائے تاکہ فرقہ وارانہ کشیدگی بنیادی ختم ہو جائے“ یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی یوں کہنے لگے کہ تمام زبانوں کو ختم کر کے ایک زبان بنادی جائے تاکہ لسانی عصبیت کا کوئی مسئلہ باقی نہ رہے۔ تمام سیاسی جماعتوں کو ختم کر کے ایک ہی جماعت بنالی جائے تاکہ کسی سیاسی تضاد کا اندیشہ ہی ختم ہو جائے، تمام سرمایہ داروں کو ختم کر کے ایک ہی سرمایہ دار بنادیا جائے تاکہ کوئی کمپنیشن ہی موجود نہ رہے وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ کشیدگی کے اسباب مذہب میں نہیں بلکہ چند سیاسی غلط فہمیوں میں پوشیدہ ہیں۔ اس ملک کے بہت سے لوگ مسلمانوں کو اس ملک کا جائز شہری نہیں مانتے۔ وہ انھیں باہر سے آئے ہوئے حملہ آور سمجھتے ہیں، انھوں نے دل سے مسلمانوں کو اس ملک کا شہری تسلیم نہیں کیا ہے، وہ انھیں برابر کے حقوق دینے کو تیار نہیں، برابر کی ملازمتیں دینے کو تیار نہیں، باہر سے آئے ہوئے ان لوگوں کو وہ اسی بشرط پر ان کے حقوق دینے کو تیار ہیں کہ وہ اس ملک کی اکثریت کے آگے سر جھکا دیں۔ اس کی تاریخ کو اپنی تاریخ، اس کے ہیروں کو اپنا ہیرو اور اس کے کلچر کو اپنا کلچر قرار دیں، حالانکہ یہ نظریہ انتہائی غیر معقول ہے، باہر سے آنا اگر کوئی جرم ہے تو ہم سے پہلے وہ لوگ باہر سے آئے ہیں جو خود کو اس ملک کا جائز حقدار کہتے ہیں۔ درحقیقت یہی تنگ نظری تمام بے انصافیوں کی پیداوار ہے اور ان ہی بے انصافیوں نے فرقہ وارانہ کشیدگی کو جنم دیا ہے۔ مسلمان اس ملک میں مسلمان کی حیثیت سے جینا چاہتے ہیں، اور جس طرح دوسروں کے لیے اپنا پسندیدہ مذہب اختیار کرنے، اسے پھیلانے، اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق وہ جائز تسلیم کرتے ہیں اسی طرح اپنے لیے بھی وہ اس حق پر اصرار کرتے ہیں، اس پس منظر میں جب ان سے پوچھا

جاتا ہے کہ تم پہلے مسلمان ہو یا ہندوستانی تو انھیں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ یہ سوال جو مسلمانوں کی طرف سے بے اعتمادی اور شک و شبہ کا واضح ثبوت ہے درحقیقت قطعاً بے معنی ہے۔ یہ ایسا ہی سوال ہے جیسے کوئی پوچھے کہ تم آدمی ہو یا بلی ماراں کے باشندے۔ یہ درحقیقت ان دونوں سوالوں میں کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔ اس حیثیت سے کہ اسلام ہمارا دین ہے اور اس کی دی ہوئی ایک ایک ہدایت پر عمل کرنا ہمارا ایمان ہے، ہم صرف مسلمان ہیں اور ہمارے ہندوستانی ہونے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اس حیثیت سے کہ ہم ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں یہاں کی فضاؤں میں سانس لیتے ہیں، یہاں کے باشندوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، ہم ہندوستانی ہیں اور ہمارا مسلمان ہونا اس حقیقت پر کوئی فرق نہیں ڈالتا۔

اگر اس سوال کا منشا یہ ہے کہ اگر کہیں اسلام اور وطن میں ٹکراؤ ہوا تو تم کس کا ساتھ دو گے۔ یہ تو ہمارا جواب ہے کہ یہ قطعاً ایک فرضی سوال ہے۔ اسلام سلامتی کا مذہب ہے، اس کا خدا رب العالمین اور اس کا رسول رحمۃ للعالمین ہے، وہ کسی بھی انسان یا علاقے کا مخالف نہیں، وہ صرف ظلم اور نا انصافی کا مخالف ہے اور مسلمان ہر نا انصافی کا اور ہر ظلم کا مقابلہ کرنے کے پابند ہیں، خواہ یہ نا انصافی خود ان کے وطن کے باشندے کر رہے ہوں یا دوسرے ملک کے لوگ، خواہ یہ نا انصافی خود ان کی ملت کے لوگ کر رہے ہوں یا دوسری ملتوں کے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ پہلے مسلمان یا پہلے ہندوستانی یہ یہ کوئی سوال ہی نہیں ہے، یہ صرف کچھ لوگوں کی جہالت اور نادانیت کا آئینہ ہے، یہ سوال کرنے والے لوگ نہ مسلمان کا مفہوم جانتے ہیں اور نہ ہندوستانی کا۔ مذہب یا اسلام کا ملک کے مفادات کے ساتھ کوئی ٹکراؤ نہیں، اس کے برعکس ایک صالح، ایمان دار، خیر خواہ قابل اعتماد، مستحکم اور پرامن معاشرہ کے لیے مذہب کی وہ نمائی ناگزیر ہے۔



(بقیہ نظرات ص ۶) فقہ اسلامی کا یہ مسئلہ شاید بہت سے مسلمانوں کو بھی معلوم نہ ہو کہ اگر ایک پاک صاف، نکلی اور صواک کیا ہوا غیر مسلم ہر بچن ایک کٹورے میں پانی پیے تو اسی کٹورے سے خاص اس کے منہ کی جگہ منہ لگا کر حرم کا امام پانی پی سکتا ہے، اور اگر ایک قدیم مذہبی خاندان کا فرد معاذ اللہ شراب پی کر اسی منہ سے ایک برتن میں پانی پی لے تو اس پانی کا پینا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں، وہ پانی اور برتن دونوں ناپاک ہو گئے، اسلام کی نظر میں ناپاکی کسی انسان میں ذاتی اور نسلی نہیں ہوتی، اس کے نزدیک انسان اصلاً پاک ہے خواہ وہ ہر بچن ہو یا پندت ہو یا مسلمان، اس چیز میں سب یکساں ہیں مگر آج کا مسلمان — بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں — آج کا ہندوستانی مسلمان مسئلے کا نام سن کر خواہ احتراماً اس بارے میں اپنی زبان بند رکھے مگر وہ اپنی طبیعت کو اس بات کے لیے شاید آمادہ نہ کر سکے کہ، ہر بچن کا جھوٹا پانی پی لے، چنانچہ کھیلے دنوں یہ افسوسناک خبر بھی سننے میں آئی کہ کسی نادان اور بے علم مسلمان نے ہر بچنوں کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ انھوں نے آکر ہمارا مذہب گندہ کر دیا، اندازہ کیجئے کہ خود مسلمان اسلام سے کس قدر بے گانہ ہے۔

ع امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں۔

ہمارے لیے اس واقعے میں عبرت کا بڑا سبق یہ پوشیدہ ہے کہ جب اس ملک کے ہزاروں سال پہلے معاشرے کا شیرازہ اپنی خرابیوں کے باعث اپنے مضبوط بندھنوں کے باوجود منتشر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تو اور کونسا معاشرہ ہو سکتا ہے جو فطرت کے آہنی پنجوں سے اپنی خرابیوں کے باوجود اپنے کو شکست درجنت سے بچا سکے؟ یہ فطرت کی تعزیر ہے، فطرت کو نہ ہمدرد سے دشمنی ہے نہ مسلم سے اس کا کوئی رشتہ ہے، وہ صرف حق و انصاف، ہمدردی، انسان دوستی اور سچائی پسند ہے اور بس۔ ع

حذر اے چہرہ دستان بخت ہیں فطرت کی تعزیریں

- ۱۹۵۳ء - مہاتما جواہر لال نہرو کی تقریریں - اعظم دانشور - اسلام آباد اسلام آباد پبلشرز
- ۱۹۵۵ء - تاریخ صقلیہ و تاریخ ملت جلد ہفتم
- ۱۹۵۶ء - اسلام کا زریں شام، تاریخ اوریات ایران، تاریخ علم فقہ و تاریخ ملت جلد ہفتم سلاطین ہند
- ۱۹۵۶ء - تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث دہلی
- ۱۹۵۶ء - ترجمان اللہ جلد ثالث، اسلام کا نظام حکومت و طبع جدید پذیر ترقیب، جدید انقلاوی
- ۱۹۵۶ء - سیاسی حلوں و جملہ دہم حلقے رشیدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات
- ۱۹۵۶ء - دعوت النور جلد ہفتم صدر اکبر تاریخ ملت جلد ہفتم سلاطین ہند و تقابلیں سر اور اہل خانہ کے بعد
- ۱۹۵۶ء - دعوت النور جلد ششم سلاطین ملی کے مذہبی و جماعتی گجرات، جدیدین الانووی سیاسی و معاشی
- ۱۹۵۶ء - حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط و دستاویز، تاریخی ریز، چھ جلدیں، آزادی و شہداء کے معاشی و سرکاری
- ۱۹۶۱ء - تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ - ۳۰ - حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
- ۱۹۶۱ء - امام غزالی کا فلسفہ مذہب و اخلاق - عروج و زوال کا الہی نظام
- ۱۹۶۱ء - تفسیر مظہری اردو جلد اول، برزخ مظہریان جہان کے خطوط اسلامی کتب خانہ عربیہ
- ۱۹۶۲ء - تاریخ ہندوستانی و ششی
- ۱۹۶۲ء - تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں، معارف الآثار
- ۱۹۶۲ء - خیال سے فرات تک
- ۱۹۶۳ء - تفسیر مظہری اردو جلد سوم، تاریخ ریدہ پسر کی ضلع بکینور، علماء ہند کا شاندار ماضی اول
- ۱۹۶۳ء - تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط عرب و ہند و ہندوستان میں
- ۱۹۶۵ء - ہندوستان شاہان مظہر کے عہد میں
- ۱۹۶۵ء - ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول - تاریخی ثقافت
- ۱۹۶۶ء - لائیکہ نوادہ کا تاریخی پس منظر، ایشیا میں آخری نو باریات
- ۱۹۶۶ء - تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، میر عشق - خواجہ عبدہ نواز کا تصوف و سلوک
- ۱۹۶۶ء - ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں
- ۱۹۶۶ء - ترجمان اللہ جلد چہارم تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت محمدؐ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ
- ۱۹۶۶ء - تفسیر مظہری اردو جلد ششم، تین تذکرے - ماہ ولی اللہ کے سہ ماہی مکتوبات
- ۱۹۶۶ء - اسلامی جہد کی عظمت و فتنہ
- ۱۹۶۶ء - تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تاریخ الفری حیات و کارنامے - دین الہی و دین کا پس منظر
- ۱۹۶۶ء - حیات مذہبی تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، آثار و معارف - حق تعالیٰ میں ذات ربانہ کی رعایت
- ۱۹۶۶ء - تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، بی بی و س کا روحانی علاج، خلافت راشدہ اور ہندوستان
- ۱۹۶۶ء - فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، انتخاب الترفیع و الترمیم، اخبارات اسلامی
- ۱۹۶۶ء - عربی و شیعہ میں قدیم ہندوستان

نمبر ۱۹۸۱ء

مَدَوَّةُ اَيِّين دِلِي كَارِي دِلِي مَاهِنَا

مُرَكَّاز

قیمت سالانہ : بیس روپے

مُرَاتَبِع  
سَعِيد احمد کسرا آبادی



# برہان

جلد نمبر ۸ : محرم الحرام ۱۴۲۸ھ مطابق نومبر ۱۹۸۶ء شماره نمبر ۵

نظرات سعید احمد اکبر آبادی ۲

## مقالات

۵ - خلافت ارض اور علماء کی ذمہ داریاں : جناب مولوی شہاب الدین صاحب ندوی

تاظم فرقانیہ اکیڈمی - نیگلور

۲۶ - وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام : جناب ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب

ایم۔ اے۔ - ایل ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

پروفیسر دینیات سنی تھیالوجی مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ۔

۳۸ - دشا بھارتی یونیورسٹی کے فارسی عربی اور

اردو مخطوطات : دشا بھارتی شانتی کمیتہ منوبی بنگال۔

۵۴ - مجمع البرکات : جناب محمد عتیق الرحمن صاحب قاسمی، ایم، اے، پی، ایچ۔ ڈی۔

خدا بخش لائبریری (دہلی)

# نظرات

ہم کو پاکستان سے ایک ضخیم کتاب موصول ہوئی ہے جس کا نام ہے ”سیرۃ النبی بعد وصال النبی“ ہماری نظر کتاب کے اس نام پر پڑی تو ہم اچانک چونک پڑے اور مطلب کچھ سمجھ میں نہ آیا لیکن کتاب کھول کر پڑھنا شروع کی تو معلوم ہوا کہ لائق مرتب نے بڑے تفحص اور تلاش کے بعد وہ تمام خواب بھی کر دیے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ سے متعلق مختلف افراد و اشخاص نے دیکھے ہیں، اگرچہ متعدد علماء نے اس کتاب پر تقریظیں لکھیں اور اس کی تعریف کی ہے لیکن افسوس ہے کہ ہم اس کی تحسین نہیں کر سکتے، کیونکہ خواب بہر حال خواب ہے، وہ اچھا ہو یا برا، اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں تک کہ خواب کے معنی ہی ایک بے حقیقت شے کے ہو گئے۔ ایک شاعر کہتا ہے:

دقت پیری شباب کی باتیں      ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

ایک ادب مصرع ہے: خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا: پھر خواب میں آدمی جو کچھ دیکھتا ہے اس کے مزاج کے سوداوی، صفاوی اور بطنی ہونے اور سوتے دقت اپنے ذاتی خیالات و افکار کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے، علاوہ ازیں خواب کی تعبیر کا معاملہ بھی بڑا پیچیدہ اور مبہم ہے، ایک شخص بہت بُرا خواب دیکھتا ہے جس سے اس پر دہشت اور خوف کا غلبہ ہو جاتا ہے لیکن اس کی تعبیر بڑی خوش آئند اور محمود ہوتی ہے اور اس کے برعکس ایک شخص اچھا خواب دیکھتا ہے لیکن اس کی تعبیر اچھی نہیں ہوتی۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ نے خواب میں دیکھا کہ عوام و خواص ہر ایک اس سے بدکاری کر رہا ہے۔ آنکھ کھلی تو سخت سرا سیمہ اور پریشان بھی لکھیں

حضرت ابن سیرین جو تعبیر خواب میں بڑی ہمارت رکھتے تھے ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے مبارکباد دی اور فرمایا کہ بیگم سے کوئی ایسا کار خیر سرزد ہوگا جس سے ہر شخص، چھوٹا ہو یا بڑا فیضیاب ہوگا۔ چنانچہ بیگم کے نہایت مہیب اور پریشان کن خواب کی تعبیر ہرزیدہ کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، اسی طرح ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ بادشاہ وقت اپنے حشم و خدم کے ساتھ اس کے گھر آیا اور اس میں فردکش ہوا ہے، بیدار ہوا تو بڑا خوش تھا لیکن جب حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کو اس کا علم ہوا تو اسی شخص کو حکم دیا کہ فوراً گھر چھوڑ دے، یہ شخص گھر سے باہر آیا تھا ہی کہ اچانک چھت بیٹھ گئی اور مکان گر گیا۔

اس بنا پر خواب اچھا ہو یا برا، احتیاط اور ورع و تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا چرچا نہ کیا جائے اور دیکھنے والا اسے اپنی ذات تک محدود رکھے، علی الخصوص وہ خواب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہو اس کا اخطار اور کبھی ضروری ہے، کیونکہ خواب میں کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے جس کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ شریعت کے کسی حکم پر پڑے اور ضعیف الایمان لوگوں کے لیے شریعت سے انحراف کا موجب بنے، اور صرف یہ ایک اندیشہ اور وہم و گمان نہیں بلکہ تصوف کے عنوان سے مسلمانوں میں جو گمراہیاں پیدا ہوئی ہیں ہمارے نزدیک اس کے بنیادی سبب دو ہی ہیں: (۱) ایک خوابوں کا کثرت سے نقل ہونا اور ان پر بھر دس کرنا اور (۲) دوسرے صوفیاء کا اپنے احوال و مقامات کا بار بار اپنے مکتوبات و ملفوظات میں چرچا کرنا جس سے احکام و آداب شرع کی بنیادیں متزلزل ہو گئی ہیں، پھر مصنف نے کتاب کا نام رکھا ہے: ”سیرۃ النبی بعد صال النبی“ یا درکھنا چاہیے کہ یہ نام بذات خود نہایت ناموزوں اور نامناسب ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ و طیبہ جس کے مطابق عمل عین ایمان ہے صرف وہ ہے جو قرآن و سنت سے ثابت ہے؛

افسوس ہے ایک دن کے فرق سے یعنی ۲۴ مارچ اور ۲۵ اکتوبر کو بمبئی میں دو ممتاز شخصیتوں مسٹر ایل۔ کے گابا اور پروفیسر اصغر علی فیضی کا انتقال سیاسی برس کی عمر میں ہو گیا۔ ا دل الذکر اصل پنجابی ہندو اور لاہور کے نائی گرامی بیرسٹری تھے، تقسیم کے بعد ہندوستان آ کر بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور



ایک مدت سے گمنام تھے، لیکن ایک زمانہ تھا جب انھوں نے اسلام قبول کیا اور ایک مسلمان قانون سے شادی کی اور پھر اس کے بعد اسلام کی حمایت میں نہایت پر زور مضامین لکھے اور جگہ جگہ تقریریں کیں اُس زمانہ میں اُن کا نام سچے سچے زبان پر تھا، انگریزی کے بڑے اچھے انشا پرداز تھے۔ اسی زمانہ میں رسوائے زمانہ کتاب مادر ہند (Mother India) کا انھوں نے دندان شکن جواب لکھا تھا جس کا بڑا چرچا ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی کتاب (Prophetaf the Desert) بھی بہت مشہور ہوئی۔

پروفیسر فیضی آکسفورڈ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، ان کا اصل مضمون قانون تھا، مشرقی علوم و فنون میں بھی ان کو دسترس تھی۔ اسلامی قانون پر ان کی کتابیں حوالہ کی کتاب (Book of Reference) کی حیثیت رکھتی ہیں، عرصہ تک لا کالج، بمبئی کے پرنسپل رہے، انڈیا کے مصداق شام میں سیفر بھی رہے اور کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے، وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کناڈا، یورپ اور امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں لکچر دیے۔ برہان کے خریدار شروع سے تھے اور اس کی بڑی قدر کرتے تھے، برہان کا کوئی مقالہ یا نظرات ان کو زیادہ پسند آتا تھا تو اس کی داد تحریراً دیتے تھے۔ عرصہ سے ان کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ بعض خانگی معاملات اور مسلسل ضعف و عیال کے باعث سخت پریشان تھے۔ اب اچانک اخبارات میں ان کے انتقال کی خبر نظر سے گزری تو دیرینہ تعلق کے باعث سخت صدمہ اور افسوس ہوا۔ اللہ ہمہ اغفر لہما واسحہما۔

راقم الحروف کا سفر نامہ، جس میں اب پاکستان کے ساتھ جنوبی افریقہ بھی شریک ہو گیا ہے اور جس کے شدید تقاضے ہر طرف سے آرہے ہیں انشاء اللہ آئندہ ماہ کی اشاعت سے اس کا سلسلہ شروع ہوگا۔ قارئین کرام مطمئن رہیں۔

# خلافتِ ارض اور علماء کی ذمہ داریاں

عصرِ جدید کا ایک اہم تجدیدی کام اور اس کی نوعیت

از مولوی شہاب الدین صاحب ندوی، ناظمِ قانیہ اکیڈمی بنگلور ۵۶

قسط (۳)

تصوف اور سائنس:

یہ موضوع ختم کرنے سے پہلے ایک غلط فہمی دور کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ سائنس اور تصوف دونوں ایک درجہ کی چیزیں نہیں ہیں، جن کو میں نے اس موقع پر گلے ملانے اور دونوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اصل میں دونوں کا بنیادی مقصد متحد ہے اور وہ ہے حقیقت کی تلاش۔ اور موجودہ دور میں تجدید و اصلاح کے لیے مختلف مگر صحیح نقطہ ہائے نظر کو ایک عظیم تر مقصد کی خاطر اکٹھا کر دینا ضروری ہے تاکہ باہمی غلط فہمیاں دور ہوں اور فاصلے کم سے کم تر رہ جائیں۔

سائنس اور تصوف کی منزل — اپنی اصل غرض و غایت کے اعتبار سے —

ایک ہے مگر طریقے جدا جدا ہیں۔ وہ ”شہود“ جو تصوف کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور وہ ”شہود“ جو سائنس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے ان دونوں میں مقصد کا اشتراک ہونے کے باوجود ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلا کشفی و اشراقی ہے جب کہ دوسرا علمی و استدلالی، البتہ دونوں وجدانی ضرور ہیں۔ اور محنت بھی دونوں طریقوں میں خوب کرنی پڑتی ہے۔ پہلے طریقے میں مجاہدہ اور نفس کشی کے ذریعہ تو دوسرے طریقے میں ”علم اسرار“ کی اعلیٰ تحصیل اور اس میں رسوخ پانے کے ذریعہ۔

بہت خوش نصیب ہوں گے وہ لوگ جن کی ان دونوں طریقوں میں تکمیل ہو جائے، جو نور علی نور کے مصداق ہوں گے۔ موجودہ دور میں نوع انسانی کی عموماً اور امت مسلمہ کی خصوصاً صحیح رہنمائی اور اصلاحِ حال کے لیے ان دونوں طریقوں کا جامع یا کم از کم ان کے کوچوں کا رمز شناس ہونا ضروری ہے۔ اور اس طریقے سے دیئے تصوف کی موجودہ بہت سی خرابیوں کا علاج بھی ممکن ہو سکتا ہے۔

بہر حال اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے کہ تصوف اصولی حیثیت سے بہت مفید بلکہ ضروری و ناگزیر ہے۔ کیونکہ وہ دین کی تکمیل کا ایک شعبہ ہے۔ مگر اس کو فلسفیانہ اثرات سے پاک ہو کر کتاب و سنت کی خالص بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے، اور جو چیز شریعت کی ضد یا اس کے مغائر ہو وہ تصوف نہیں بلکہ گمراہی ہے۔

”تصوف شریعت سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں بلکہ حقیقتاً وہ شریعت ہی کا خادم ہے تصوف نام ہے تزکیہ نفس اور اصلاحِ باطن کا جس کے باعث انسانی اخلاق و اعمال درست ہوتے ہیں اور برائیوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ تصوف کا منہا نے مقصود سوزِ جگر کو جلا دینا اور ”عشق“ کی آگ کو بھڑکانا ہے جس کی بددلت ہنگامہ ہائے وجود میں حسنِ اخلاق کے سوتے پھوٹتے ہیں، محبت و مروت اور امن و امان کے شگوفے نمودار ہوتے ہیں بقول اقبالؔ

عشق کے مضراب سے نغمہ تارِ حیات      عشق سے نورِ حیات عشق سے نارجیا۔ ۱۷

فلسفہ یونان مجموعہ اغلاط :

ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کے دل و دماغ پر فلسفہ یونان کی سمیت چھائی ہوئی تھی اور بہت سے لوگوں کے نزدیک تو ان کا مرتبہ وحی و الہام سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ اس کے توڑ کے لیے اہل اسلام نے اس کو اپنایا اور کلامی نقطہ نظر سے اسے داخلِ نصاب کیا مگر اس کا



زمانہ اب لہجہ کا ہے لیکن ہم اس سے برابر چپے ہوئے ہیں۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یونانی فلسفے کے جو مسائل اب تک ہمارے ذہنوں پر چھائے ہوئے ہیں ان کے غلط اور بے بنیاد ہونے کی حقیقت پر کھڑی سی روشنی ڈال دی جائے اور فکر و نظر کی دنیا میں جو عظیم انقلابات رونما ہو گئے ہیں ان کا ایک مختصر خاکہ بھی پیش کر دیا جائے تاکہ ہمارے علماء کو اپنے منصب و کردار کو سچا پاتے اور ”خلافتِ ارض“ کے تعلق سے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں سہولت رہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے علماء اور دانشور جدید سے جدید تر تمام فکری و نظریاتی تبدیلیوں سے غافل اور بے پروا ہو کر اب تک برابر اسطوار اس کے ہمنواؤں کے سر میں اپنا سر ملاتے جا رہے ہیں؛ اور انھیں کوئی خبر نہیں ہے کہ انکار کی دنیا میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں اور دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔

### ابطالِ ہیولی :

مثال کے طور پر بیسویں صدی کے آغاز تک تمام فلسفیانہ مسائل کی بنیاد اس نظریہ پر تھی کہ مادہ ”غیر فانی“ ہے مگر جدید سائنس نے جب یہ ثابت کر دیا کہ مادہ (Matter) نہ صرف فانی ہے بلکہ توانائی (Energy) ہی کی دوسری شکل ہے۔ تو اس نظریے کی بنیاد پر جتنے بھی مسائل — قدیم اور جدید فلسفوں میں — گھڑے گئے تھے وہ سب کے سب باطل ہو گئے۔ مگر ہمارے علماء ان جدید تحقیقات و اکتشافات سے بے خبر ہو کر اب تک برابرا ثبات ”ہیولی“ اور ابطال ”اجزائے لائتجزی“ یا مادہ جدید نظریہ کے مطابق مادہ ”مجموعہ توانائی“ کا دوسرا نام ہے۔

قدیم فلاسفہ ہیولی (مادہ) کو ازلی وابدی اور غیر فانی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ اجزاء (جو ہر ذرہ) سے مرکب نہیں ہیں۔ بلکہ چھوٹے بڑے تمام اجسام صرف دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہیں: ایک ہیولی اور دوسرے صورتِ نوعیہ۔ گویا کہ ان کی نظر میں ہر جسم متصل و احد ہوتا ہے۔ یعنی وہ اپنی جگہ پر گویا ایک مکمل یونٹ ہوتا ہے جو اجزاء کا مجموعہ نہیں ہے۔ (باقی صفحہ پر حاشیہ ۳۳ بھی دیکھیں)

جو ہر فردہ کی بے کار اور لا طائلی بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں اور ان کی تعلیم و تدریس سے اب تک ہمارے عربی و اسلامی مدارس کو چھٹکا را نہیں مل سکا ہے۔ حالانکہ سائنٹفک نقطہ نظر سے ہیولی اور جزو لای تجزی دو نوں سے متعلق نظریات غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ جزو لای تجزی یا جوہر فردہ کی تعریف میں متکاہین اگر یہ قید نہ لگائے کہ وہ قطعی، کسری، وہی اور فرضی کسی بھی حیثیت سے ناقابل تقسیم ہے تو یقیناً ان کا نظریہ آج صحیح ہوتا۔ مگر بھر بھی مجموعی اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ متکاہین کا نظریہ مفرد عناصر (Elements) کی حد تک آج بھی صحیح ہے، جن کی تعداد آج ۹۲ ہے اور جن سے کائنات کی تمام اشیاء مرکب ہیں۔ البتہ ایٹم کی مزید تقسیم کے لحاظ سے (الکٹران، پروٹان اور نیوٹران کی دریافت کے بعد) یہ نظریہ غلط ہو جاتا ہے۔ مگر اس موقع پر

(بقیہ حاشیہ ۱ و ۲، از صفحہ ۷) اس لحاظ سے جب کسی چیز کے دو ٹکڑے کیے جائیں تو اس نظریہ کے مطابق کہا جائے گا کہ جس چیز نے تقسیم قبول کی ہے وہ صرف ہیولی نے قبول کی ہے کسی اور چیز نے نہیں۔ اسی طرح صورت شکل کی تبدیلیوں کے باعث ہیولی کا محض قالب بدلتا رہتا ہے یعنی مختلف تبدیلیوں کے باوجود وہ ہر شکل و صورت میں بے کم و کاست اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے۔ مثلاً اگر لکڑی جلانی جائے تو جو ہیولی پہلے لکڑی کی شکل میں تھا اس نے اب راکھ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ گویا کہ ہیولی ختم نہیں ہوا بلکہ اس نے صرف اپنے قالب کو بدل لیا ہے۔ یہی نظریہ مادہ کے غیر فانی ہونے کی بھی دلیل رہا ہے۔ بہر حال ہیولی کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے: وہ جو ہر بالذات قابل اوستعد ہو۔“

۱۳۔ یہ جزو لای تجزی کی صحیح ہے۔ یعنی مادے کا وہ آخری چھوٹے سے چھوٹا ذرہ جو اپنی مزید تقسیم قبول نہ کرے، اس کو جوہر فردہ بھی کہتے ہیں جس کی جمع جوہر فردہ ہے۔

۱۴۔ ملاحظہ ہو قدیم فلسفے کی کتاب ”میزد ہی“ ص ۱۰، مطبوعہ رحیمہ دیوبند۔ ان اصطلاحات کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو ان اجزاء کو کاٹ کر تقسیم کیا جاسکتا ہے، نہ وہ ٹوٹ پھوٹ کر منقسم ہو سکتے ہیں اور نہ فرضی و وہی اعتبار سے ان کی تقسیم عمل میں آ سکتی ہے۔

یہ حقیقت ملحوظ رہتی چاہیے کہ ایٹم کی مزید تقسیم سے کوئی ایٹم نہیں رہتا بلکہ وہ چند برقی اجزاء کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ تمام عناصر میں بنیادی طور پر الیکٹرانوں، پروٹانوں اور نیوٹرانوں کا متحدہ نظام پایا جاتا ہے۔ الیکٹرانوں میں منفی برقی چارج ہوتا ہے اور پروٹانوں میں مثبت برقی چارج، جب کہ نیوٹران بے چارج ذات ہوتے ہیں۔ اس طرح ایٹم کے یہ اندرونی اجزاء اپنی اصل ہیئت و ماہیت کے اعتبار سے غیر مادی ہیں۔

اسی طرح نہ صرف ایٹم بلکہ ایٹم کے اجزاء بھی مزید تقسیم ہو گئے، چنانچہ جدید ترین تحقیق کے مطابق ایٹم کے مرکز (Nucleus) سے تین قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں، جن کو الفا شعاعیں، (Alphas) بیٹا شعاعیں (Betarays) اور گاما شعاعیں (Gamma Rays) کہا جاتا ہے۔ الفا شعاعیں دو پروٹانوں اور دو نیوٹرانوں کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ گاما شعاعیں جو تابکار عناصر (Radioactive Elements) سے خارج ہوتے ہیں۔

۱۔ ایٹم کو توڑ کر پھر دوبارہ ایٹم نہیں بنایا جاسکتا۔ اصطلاح میں مادہ جس چیز کا نام ہے وہ صرف ذرّہ یا عناصر کا نام ہے۔ ہر مفرد عنصر کی اپنی ایک علیحدہ خصوصیت ہوتی ہے جو اس کو (اس کے مرکز سے کو) توڑ دینے کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور وہ بجلی کے چند ذرات کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً آکسیجن یا کاربن کے مرکزے کو توڑ دیا جائے تو پھر آکسیجن، آکسیجن نہیں رہتا اور کاربن، کاربن نہیں کہلاتا۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے کیمیائی تعامل سے پانی کا جو سالمہ (Molecule) وجود میں آتا ہے ان کے مرکزوں کو توڑ دینے کے بعد پھر ان سے پانی کا سالمہ دوبارہ وجود میں نہیں آسکتا۔ یہی حال دیگر تمام عناصر اور سالموں کا ہے اور اس میں بہت بڑی حکمت ربانی کا راز نظر آتی ہے۔

۲۔ ایٹم آپ کا خادم، ص ۱۶۴، مطبوعہ انڈین اکیڈمی نئی دہلی۔

۳۔ سیمہ (Lead: ایٹمی نمبر ۸۲) کے بعد یورینیم (ایٹمی نمبر ۹۲) تک جتنے بھی درمیانی عناصر ہیں۔ سب تابکار عناصر کہلاتے ہیں، جن سے یہ شعاعیں مسلسل خارج ہوتی رہتی ہیں۔

۴۔ اے ڈکٹری آف سائنس، ص ۱۸، پنگوئن بکس، لندن، ۱۹۷۷ء۔



بیٹا شعاعیں الکٹرانوں کو کہا جاتا ہے۔ مگر یہ وہ الکٹران نہیں ہیں جو ایٹم کے مرکزے کے گرد چکر لگاتے ہیں؛ بلکہ وہ جوہری مرکزے کے اندر تحلیل شدہ نیوٹرانوں سے (ٹوٹ ٹوٹ کر) نکلتے ہیں۔ یہ شعاعیں الفا شعاعوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ خارج ہوتی ہیں۔ اور بعض حالات میں ان کی رفتار روشنی کی رفتار کا ۹۸ فی صد ہوتی ہے۔ جب کہ روشنی کی رفتار ۲۸۱,۷۸۶,۱۸۶ میل فی سکنڈ ہے۔ اور گاما شعاعیں برقی مقناطیسی لہروں (Electromagnetic Radiation) کو کہا جاتا ہے۔ جو ایٹموں کے مرکزوں سے نکلتی ہیں؛ مگر وہ ذرات نہیں ہیں۔ بلکہ کوانٹم یونٹوں کے مطابق خارج ہونے والے فوٹان (Photons) ہوتے ہیں۔

ان شعاعوں کی دریافت کے بعد مادے کے غیر فانی ہونے کا نظریہ باطل ہو گیا۔ کیونکہ یہ شعاعیں ایٹموں کے مرکزوں سے مسلسل ٹوٹ ٹوٹ کر کائنات کی تمام وسعتوں میں گم رہتی ہیں۔ اسی طرح ان شعاعوں کی دریافت کے بعد "ہیولی" کا بے بنیاد نظریہ بھی باطل اور وہ ساری دلیلیں بھی مردود قرار پاتی ہیں جو قدیم فلاسفہ نے جزو دلائل تجزی کے بطلان پر قائم کی تھیں۔ مثلاً: کسی جزو کو دو اجزاء کے درمیان یا دو اجزاء کے ملتی پر فرض کر کے یہ سوال اُٹا کہ آیا یہ جزو دونوں اجزاء کے درمیان گھرا ہوا اور ان دونوں سے ملا ہوا ہے یا نہیں؟ اگر ملا ہوا ہے تو تقسیم ثابت ہو گئی اور اگر نہیں ملا ہوا ہے تو گویا وسط وسط نہیں رہا جو محال ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

۱۔ ایٹم آپ کا خادم، ص ۱۶۵۔

۲۔ اے ڈکشنری آف سائنس، ص ۴۶۔

۳۔ ایٹم کی کہانی، ص ۷۷، مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی۔

۴۔ ایٹم آپ کا خادم، ص ۱۶۹، اے ڈکشنری آف سائنس، ص ۱۶۲۔

۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیں قدیم فلسفے کی کتابیں ہدایۃ المحکمۃ اور میبذی وغیرہ۔

تو اب جیسا کہ تجربے و مشاہدے سے ثابت ہو گیا کم از کم گاما شعاعیں ایسے اجزائے ذرات نہیں ہیں جن کو دو اجزاء کے درمیان یا دو اجزاء کے ملتی پڑتی کرنے کا سوال پیدا ہو، بلکہ وہ تو برقی مقناطیسی لہریں ہیں۔ اب ان لہروں کو ملتی پڑتی کہنے اور انھیں مزید تقسیم کرنے کا مسئلہ ہی خارج از بحث ہے۔ کیونکہ وہ درحقیقت نہ مادہ ہے اور نہ مادی اجزاء کا مجموعہ۔ ان لہروں پر اجزاء کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔

حاصل یہ کہ اس مسئلے میں فلسفہ یونان اور متکلمین دونوں کا مسلک غلط ہے بلکہ ایک حیثیت سے متکلمین کا مسلک کھوڑی سی ترمیم کے ساتھ قابل اعتناء اور حقیقت واقعہ کے عین مطابق ہے، جب کہ فلسفہ یونان کا مسلک غلط درغلط بلکہ بالکل مہمل ہے۔

**یونانی نظریہ افلاک کا ابطال:**

قدیم فلاسفہ کا ایک گروہ ہماری زمین کو کائنات کا مرکز قرار دیتے ہوئے سات سیاروں کو جن میں ہمارا سورج بھی داخل ہے۔ کر دی شکل کے سات افلاک میں جڑے ہوئے مانتا ہے۔ نیز وہ کہتا ہے کہ یہی افلاک گردش کرتے ہیں اور زمین اُن کے درمیان ساکن ہے۔

۵۔ اگر در قدیم میں عقل سے کام لیا جاتا تو بالکل اسی کے مشابہ دھوئیں یا بھاپ کی مثال دی جاسکتی تھی جو کسی مادے کو جلائے یا گرم کرنے کے باعث اس سے خارج ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ مادے ہی کا جزو ہیں۔

۶۔ یہی سات افلاک یا سات سیاروں کو بعض علماء نے سات آسمان قرار دے دیے۔

لاحظہ قدیم فلکیات کی کتاب "تصریح" ص ۸، مطبوعہ رحیمیہ دیوبند۔

یہ سات سیارے حسب ذیل ہیں: (۱) چاند، (۲) عطارد، (۳) زہرہ، (۴) آفتاب، (۵) مریخ، (۶) مشتری، (۷) زحل، اُن میں سے چاند ہماری زمین سے سب سے زیادہ قریب ہے، پھر اُس کے بعد عطارد، پھر زہرہ، پھر مریخ، پھر مشتری اور پھر زحل ہیں۔ (شرٹ جینی، ص ۲۲)

۷۔ شرٹ جینی، ص ۲۰، مطبوعہ رحیمیہ دیوبند۔

اسی طرح ان فلاسفہ کا نظریہ ہے کہ یہ افلاک ایک کے اوپر ایک پیاز کے چھلکوں کی طرح تہہ بہ تہہ ہیں اور اپنا ٹھوس جسم رکھتے ہیں۔ مگر وہ شیشے کی طرح شفاف ہیں، جن کے پار دیکھا جاسکتا ہے۔ ان سات کے علاوہ دوسرے افلاک ہیں۔ آکھویں کو ”فلک البروج“ یا ”فلک ثوابت“ اور لوہیوں کو ”فلک اطلس“ یا ”فلک الافلاک“ یا ”فلک اعظم“ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ تمام ستارے (سات سیاروں کے علاوہ) آکھویں فلک میں جڑے ہوئے ہیں اور افلاک چونکہ شفاف ہیں اس لیے وہ سب ہم کو پہلے فلک میں جڑے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔ اور نواں فلک محدود جہات ہے اور وہ تمام (افلاک و) اجسام کو محیط ہے اور اس کے اور کوئی چیز نہیں ہے نہ کسی قسم کا خلا اور نہ ملائکہ (یعنی خالی اور بھری جگہ) اور یہ غیر کموکب یعنی غیر مخلوق ہے۔ یہ تمام افلاک و ثوابت گردش کرتے ہوئے دن رات میں ایک چکر پورا کر لیتے ہیں اور یہ اجرام متحرک بالارادہ ہیں۔

۱۵۔ تصریح (شرح تشریح الافلاک) ص ۶، رحیمہ دیوبند۔ ۱۶ شرح چغنی ص ۲۳۔

یعنی قدیم اور غیر فانی ہے جو فزق والقیام کو قبول نہیں کرتا۔ اور تمام افلاک کے بارے میں بھی یہی نظریہ ہے، چنانچہ علامہ شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

”افلاطون اور ارسطو وغیرہ کا مذہب ہے کہ آسمان سخت اور ٹھوس ہے اور وہ کسی طرح ٹوٹ یا پھٹ نہیں سکتے، اس کے ساتھ ان میں روح اور عقل ہے اور ان کی روح اور عقل ہم سے بہ مراتب اعلیٰ اور افضل ہے۔ تمام عالم کا انتظام انہی کے دست قدرت میں ہے اور دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے انہی کے اشاروں سے ہوتا ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں شعراء جو ہر موقع پر آسمان کے ظلم و ستم کا دکھڑا روتے ہیں، یہ محض شاعری نہیں بلکہ اسی قدیم یونانی خیالات کا پرچہ ہے۔ آسمانوں کے عاقل اور صاحب روح ہونے پر یونانیوں کا استدلال یہ ہے کہ آسمان دوری حرکت کرتا ہے یعنی گھومتا اور چکر لگاتا ہے۔ اور جو چیز دوری حرکت کرتی ہے وہ صاحب عقل و شعور ہوتی ہے۔“

(مقالات شبلی، ۱/۳۲-۳۳، اعظم گڑھ، ۱۹۶۵ء)



ابھی افلاکِ سبعہ کو ہمارے بعض علماء نے سات آسمان (سبع سماوات) قرار دیتے ہوئے بقیہ دو افلاک کو عرش اور کرسی کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔<sup>۱۷</sup> اور ہندوستان کے اکثر عربی مدارس میں آج تک اسی کی تعلیم و تدریس ہو رہی ہے۔ فلاسفہ یونان کے یہ تمام مسائل و مباحث آج علم و تحقیق کی روشنی میں اوہام و خرافات اور بالکل افسانے معلوم ہوتے ہیں۔

نیز اسی طرح ان افلاک کی ساخت و پرداخت کے بارے میں یہ نظریہ بلکہ عقیدہ ہے کہ وہ مختلف اجسام و لمبات سے مرکب نہیں ہیں بلکہ اور یہ شق عناصر کو بھی شامل ہے۔<sup>۱۸</sup> یعنی افلاک کا مادہ کسی بھی حیثیت سے ہماری زمین کے مادے سے مشابہ نہیں ہے۔ اور اسی بنا پر وہ کون و فساد اور خرق و التیام کو قبول نہیں کرتا۔<sup>۱۹</sup> یعنی ان کے اجزاء نہ تو (ٹوٹ پھوٹ کر) الگ ہو سکتے ہیں اور نہ (ایک بار ٹوٹ جانے کے بعد دوبارہ) جڑ سکتے ہیں۔<sup>۲۰</sup> ان نظریات کی صحت پر جو دلائل پیش کیے گئے ہیں وہ حد درجہ مضحکہ خیز ہیں جو محض قیاسی گھوڑے دوڑانے کے مترادف ہے۔

### قرآن کا نظریہ سماوات :

جدید نظریات و تحقیقات کے مطابق ”افلاک“ کوئی چیز نہیں ہیں۔ اس موقع پر یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرآنی نظریہ سماوات اور فلاسفہ یونان کے نظریہ افلاک میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور تحقیقات جدیدہ کی رو سے فلاسفہ یونان کے نظریات کا ابطال

۱۷ تصنیف، ص ۷۔

۱۸ چند نچہ فلسفے کی بنیادی کتاب ”ہدایۃ الحکمۃ“ میں ہے: ”إِنَّ الْفَلَکَ یَسِیْطُ أُمٌّ لَمْ یَلْزَمْ مِنْ أَجْسَادٍ مُّخْتَلِفَةِ الطَّبَائِعِ“

۱۹ ملاحظہ ہو ”ہدایۃ الحکمۃ“ کی شرح میبذی، ص ۶۸، مطبوعہ دیوبند۔

۲۰ إِنَّ الْفَلَکَ لَا یَقْبَلُ الْکَوْنُ وَالْفَسَادَ وَالْخُرْقَ وَالِإِلْتِیَامَ (ہدایۃ الحکمۃ)

۲۱ میبذی، ص ۷۷۔

اور قرآنی نظریات کا اثبات ہوتا ہے تفصیل کے لیے تو ایک مستقل تصنیف درکار ہے لہذا اس موقع پر محض اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جدید فلکیات (Astronomy) کی رو سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہماری کائنات سبع سیارات (سات سیاروں) اور تسعہ افلاک (نوا فلک) میں محدود نہیں ہے بلکہ اربوں کہکشوں اور لاتعداد ستاروں اور سیاروں کا مجموعہ ہے۔ اور یہ تمام اجرام سماوی بے کراں خلاؤں میں بغیر کسی سہارے کے تیرتے پھر رہے ہیں۔ اور اُن کا مادہ بھی وہی ہے جو ہمارے کرۂ ارض اور نظام شمسی کا مادہ ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ستارے بھی جیسے مرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ہمارا سورج ایک سکندڑ میں سے لاکھ ٹن کی رفتار سے اپنی توانائی کھوتا جا رہا ہے۔ اور

۱۵۔ قدیم فلکیات میں زمین کو مرکز قرار دیا گیا تھا جب کہ جدید فلکیات میں سورج کو مرکز قرار دیتے ہوئے زمین کو ایک تابع سیارہ قرار دیا گیا ہے۔

۱۶۔ اور یہ قرآنی بیان ہی کی تصدیق و تائید ہے۔ ملاحظہ ہو تیسرے باب میں آیت کریمہ: ”لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَا أَصْغَرُ وَلَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ“ کی تشریح (در بحث الٹیم اور قرآن) یہ آیت کریمہ ”نص“ ہے اس بات پر کہ ہماری زمین آسمان کا مادہ متحد ہے۔ یعنی اجرام سماوی میں بھی اُسی طرح کا عنصری اور جوہری نظام کارفرما ہے جس طرح کا عنصری اور جوہری نظام خود ہماری زمین میں ہے۔

۱۷۔ ملاحظہ ہو امریکی سائنس دان جارج گیمو کی مشہور کتاب ”سورج کی پیدائش اور موت“ (The Birth and death of the Sun) اس کتاب کے ملاحظے سے: ”إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَإِذَا النُّجُومُ هُتِّكَتْ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ“ جب سورج لپٹ دیا جائے گا اور جب ستارے جھڑ پڑیں گے) وغیرہ قسم کی قرآنی آیات کی ایک نئی تفسیر سامنے آتی ہے اور قیامت سے متعلق قرآن حکیم کے حیرت انگیز اکتشافات کی حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

۱۸۔ زمین اور خلائی کھوج، از مارگریٹ او ہائیڈ، ص ۵۴، انڈین اکیڈمی نئی دہلی۔

ہمارا چاند شہاب ثاقب (Meteorites) اور کائناتی شعاعوں (Cosmic Rays) وغیرہ کی بمباری سے مسلسل کٹ پٹ رہا ہے، اور اسی بنا پر چاند میں بے شمار گڑھے، کھائیاں اور شگاف وغیرہ نمودار ہو چکے ہیں۔ یہ ان اکتشافات کے ملاحظے سے قدیم فلاسفہ کا یہ نظریہ باطل ہو جاتا ہے کہ اجرام سماوی کون و فساد اور خرق و القیام قبول نہیں کرتے اور یہ کہ ان کا مادہ ہمارے عنصریات سے مختلف ہے۔<sup>۱۵</sup>

موجودہ فلکیات کی ایک شاخ فلکی طبیعیات (Astrophysics) بھی ہے۔ اور یہ کب یا کبھی نیا علم ہے۔ اس علم کے تحت اجرام سماوی کے طبیعی خواص اور ان کی ساخت و پرداخت کے درمیان پائے جانے والے، وہ اور توانائی کے روابط کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔<sup>۱۶</sup> ہمارا چاند اس طرح مسلسل چاند مارن کی بدولت کٹنے پٹنے، ایک نہ ایک دن بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر سکتا ہے جو ”سب ذی آیت کریم کی حد تک مسدود ہو گا: ”وَأَقْلَوْنَ بَابَ الْجَنَّةِ وَالْجَنَّةُ ابْقَتْ“ (مذہب آگنی) کیونکہ، باندھ بیٹھیں۔

۱۷۔ بعد یہ تحقیقات سے منکشف ہوئے کہ سورج میں ہیلیم اور ہائیڈروجن اور ہیلیم رومنہ صہ پائے جاتے ہیں۔ سورج کی توانائی اور پیش کاراز یہ ہے کہ اس میں موجود ہائیڈروجن گیس ہیلیم (Helium) میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس طرح ایک نہ ایک دن اس کی ہائیڈروجن ختم ہو جائے گی اور وہ ایک بے جان کرے کی طرح سرد اور ٹھنڈ پڑ جائے گا۔ (ملاحظہ ہو سورج کی پیدائش اور موت)

اسی طرح چاند سے خدا باز مٹی اور تیلوں کے جو نمونے کرائے ہیں ان کے کیمیائی تجزیے سے بھی وہی خلاصہ نکلا گیا ہے۔<sup>۱۸</sup> — تیسے ہیں جو ہمارے زمین میں پائے جاتے ہیں۔

A Dictionary of Science, P. 32. Fourth edition, Penguin Books, London, 1977.



اور اس علم نے آج اتنی ترقی کر لی ہے کہ اجرام سماوی کے بہت سے راز ہائے ربوبیت کا ایک حد تک یقینی علم حاصل ہو چکا ہے۔ اگرچہ بعض نظریات میں رد و جواب کی پوری طرح ثابت نہیں ہو سکے ہیں یا جن کی صحت پر تمام سائنس دانوں کا اتفاق نہیں ہوا ہے (ترمیم و اضافے کی بھی گنجائش موجود ہے۔

اس علم کی رو سے ہمارے نظام شمسی میں تین قسم کے کڑے یا اجرام پائے جاتے ہیں :

۱۔ ہماری زمین جیسے ٹھوس سیارے، سیارچے (چاند کی طرح کے) چھوٹے چھوٹے اجسام اور شہابیے وغیرہ۔

۲۔ وہ کڑے یا اجرام جو چٹانی اور برقیاتی دونوں قسم کے مادوں پر مشتمل ہوں۔

۳۔ سورج اور مشتری جیسے کڑے (Jovian Planets) جو زیادہ

گیسی مادوں پر مشتمل ہیں۔ اصل میں تمام اجرام سماوی کی تخلیق ایک مشترک کہکشانی مادے سے عمل میں آئی ہے، جس کو قرآن حکیم ”دخان“ (دھوئیں) کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور جدید سائنس اس قرآنی بیان پر ہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے کہتی ہے کہ پوری کائنات ابتداءً گیس (Gas) کی حالت میں تھی۔

یونانی فلسفہ کا یہ نظریہ بھی غلط اور باطل ہے کہ اجرام سماوی متحرک بالارادہ ہوتے ہیں۔ یہ تمام نظریات بطلمیوس<sup>۱</sup> دور کی نشانی اور یادگار ہیں جن کو خود قرون وسطیٰ میں مسلم محققین اور سائنس دانوں

*New Frontiers in Astronomy (Readings from scientific American.) P. 57, San Francisco, 1975.*

<sup>۲</sup> اِنَّ الْفُلْكَ مُتَمَحَّرٌ لِّیْ بِالْاَدَاۃِ (ہدایۃ الحکمت)

<sup>۳</sup> ”بطلمیوس (Ptolemy) مشہور یونانی ہیئت داں، جو اسکندریہ میں دوسری صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ اس کی شہرت کا باعث اس کی وہ زبردست کتاب ہے جو ”المجسطی“ (Almagest) کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کتاب یونانی فلکیات کے بارے میں معلومات (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نے بدلائل غلط ثابت کیا ہے۔ اور متکلمین اسلام نے ان بے بنیاد نظریات کو مردود قرار دیا ہے چنانچہ امام غزالی اپنی معرکہ الآراء کتاب ”مہافت الفلاسفہ“ میں فلسفہ یونان اور اس کے مسائل پر تنقید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وَالْأَنَّهُمْ قَدْ يَحْكُمُونَ بِظُنُونٍ وَتَخْمِينٍ مِنْ غَيْرِ تَحْقِيقٍ وَكَفَيْتُمْ : یہ لوگ بغیر کسی تحقیق یا یقین کے محض ظن و تخمین کے باعث فیصلہ کر دیتے ہیں۔

اسی طرح موصوف اپنی ایک دوسری مشہور کتاب ”مقاصد الفلاسفہ“ میں فلسفہ یونان اور اس کی شاخوں پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”فلسفے کی چار قسمیں ہیں: ریاضیات، منطقیات، طبیعیات، الہیات۔ جن میں ریاضیات بالکل عقل کے مخالف نہیں اس لیے ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا، البتہ الہیات میں فلسفیوں کے اکثر عقائد حق کے خلاف ہیں، اور ان میں صحیح بات بہت کم ہے۔ منطقیات کا اکثر حصہ بھی صحیح ہے اور اس میں غلطی بہت کم ہے۔ طبیعیات میں حق و باطل دونوں مخلوط ہیں اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں کون غالب ہے اور کون مغلوب“

امام صاحب کے دور میں سائنس نے چونکہ اتنی زیادہ ترقی نہیں کی تھی اس لیے وہ اپنے بقیہ صفحہ گذشتہ: کا سب سے بڑا مآخذ تھی جو درعہ دراز تک (تروہ وسطیٰ کے اذہان پر چھان رہی)“

(اے شارٹ ہسٹری آف اسٹرائی، از آر تھریری، ص ۶۲، نیویارک، ۱۹۶۱ء)

۱۔ حکمائے اسلام، از مولانا عبدالسلام ندوی، ۱/۳۱۳-۳۱۵، اعظم گڑھ، ۱۹۵۳ء۔  
 ۲۔ دور قدیم میں سائنس اور فلسفہ دونوں مخلوط تھے جن کو دور جدید میں الگ الگ کیا گیا ہے۔  
 اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں: ”یونان میں فلسفہ ایک مجموعے کا نام تھا جس میں طبیعیات، عنصریات، فلکیات، الہیات، مابعد الطبیعیہ سب کچھ شامل تھا۔ لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصے کر دیے۔ جو مسائل مشاہدہ اور تجربے کی بنا پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے ان کو سائنس کا لقب دیا (اور) جو مسائل تجربہ و مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے ان کا نام فلسفہ رکھا“  
 (الکلام، ص ۶، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۳۴۰ھ) ۱۷

دور کی ”طبیعیات“ کے متعلق کوئی واضح اور دو لوگ فیصلہ نہیں فرما سکے۔ اگر موصوف آج موجود ہوتے تو عجب نہیں کہ یونانی طبیعیات کے مہل امدانہ کار رفتہ ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیتے۔ بہر حال جدید تحقیقات و اکتشافات کی بدولت جہاں ایک طرف یونانی سائنس اور فلسفے کے نظریات مردود قرار پاتے ہیں تو دوسری طرف قرآنی بیانات و تصریحات پوری طرح اُجاگر ہو جاتی ہیں اور اس کی صداقت و حقیقت اور اس کا علمی و تاریخی اعجاز کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ اس نے یہ تمام اکتشافات اس دور میں کیے تھے جب کہ عوام تو عوام اُس دور کے عقلاً اور دانشور تک ہتہ بہتہ جہالتوں میں مبتلا تھے۔ مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

سورہ انبیاء میں پہلے زمین اور اس کے متعلقات کا ذکر کرنے کے بعد چاند اور سورج کا تذکرہ کیا گیا اور پھر فرمایا گیا کہ یہ اجرام سب کے سب (خلاؤں میں) تیر رہے ہیں:

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رِجًا وَمَعِیَہِمْ جِبَالًا تَمُودُ بِہِمْ وَجَعَلْنَا فِیْہَا فِجَاجًا سُبُلًا  
لَّعَلَّہُمْ یَهْتَدُونَ ۝ وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ مَسْقُوفًا تَحْفُوظًا ۖ وَہُمْ عَنْ آٰیٰتِہَا  
مُعْرِضُونَ ۝ وَہُوَ الَّذِیْ خَلَقَ النَّیْلَ وَالنَّہَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ ط ۝ کُلٌّ فِی  
فَلَکٍ یَّسْبَحُودُنَّ ۝

اور ہم نے زمین میں (توازن قائم کرنے کے لیے) پہاڑ بنائے تاکہ وہ لوگوں کو لے کر دھل نہ جائے۔ اور ہم نے اس میں کشادہ راستے بنائے تاکہ وہ (اپنے مطلوبہ مقامات کو) پاسکیں۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت

۱۵۔ یہ ”سمائے دنیا“ کی چھت کا تذکرہ ہے۔ اسی کے اندر ستارے و سیارے اور تمام کہکشائیں (Galaxies) جن کی تعداد اربوں تک ہے، سب کی سب واقع ہیں (اس سلسلے میں بعض دلائل رگلے صفحات میں مذکور ہیں)۔ یہ چھت یونانی نظریات کے برعکس غیر شفاف (Opaque) ہوگی جیسا کہ مراجع سے متعلق حدیثوں سے واضح ہوتا ہے۔ اس چھت کی حقیقت اگرچہ آج سائنٹفک نقطہ نظر سے مستور ہے۔ مگر کوئی دیر نہیں ہے کہ زمانہ مستقبل میں اس کا انکشاف نہ ہو جائے۔ تمام حقائق ابھی سائنس کی دسترس میں کہاں آئے ہیں!



بنادیا ہے اور یہ لوگ اس کی نشانیوں سے روگردانی کر رہے ہیں اور وہی ہے جس نے رات دن اور آفتاب و مہتاب کو پیدا کیا ہے۔ یہ سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔  
(انبیاء: ۳۱-۳۳)

یہاں پر ”فلک“ سے مراد یونانی نظریہ کے مطابق کھٹوس، مجسم اور دوری حرکت کرنے والا مستطیر فلک نہیں بلکہ ایک فرضی دائرہ مراد ہے۔ جیسا کہ جدید سائنس کا نظریہ ہے۔ ورنہ تیرنے کا مفہوم بالکل بے معنی ہو جائے گا۔ اور تیرنے یا گردش کرنے والے ان اجرام میں خود ہمارا کرہ ارض بھی شامل ہے، جس کا تذکرہ اس موقع پر انتہائی بلیغ اسلوب میں موجود ہے۔

اصل میں یہ سارے حقائق خدائی منصوبے کے مطابق اشاروں کنایوں کی زبان میں

۱۔ لغت کی رو سے فلک کسی بھی چیز کے گول دائرے کو کہتے ہیں: و فلک کل شیء مستدائرہ و معظمہ: کسی چیز کا فلک اس کا گول اور بڑا حصہ ہے۔ اور اس بنا پر سمندر کی گول اور چلتی ہوئی موج کو بھی فلک کہا جاتا ہے: و فلک البحر: موجہ المستدیر المتردد۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن مسعودؓ کے پاس آکر عرض کیا ”انی ترکت فرسک کا قتلہ ویدورہ فی فلک“ میں نے آپ کے گھوڑے کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ گویا وہ ایک (فلک) دائرے میں گھوم رہا ہے۔ (لسان العرب، ابن منظور، ۱/۴۷۸، بیروت ۱۹۶۸ء)

یہ فلک کا اصل مفہوم ہے جو کلام عرب میں رائج تھا۔ مگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب یونانی علوم عباسی دور میں ترجمہ ہو کر عربی میں منتقل ہوئے تو اس وقت ”یونانی آسمانوں“ کی تعبیر کے لیے عربی میں نہ جانے کیوں فلک ہی کی اصطلاح اختیار کر لی گئی جس کی وجہ سے بعد کے ادوار میں یہ اشتباہ پیدا ہو گیا کہ یونانی فلک اور قرآنی فلک گویا ایک ہی چیز ہے، حالانکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

مذکور ہیں تاکہ چودہ سو سال قبل کے سائنسی حقائق سے نابلد معاشرے کو قرآنی آیات کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری بھی نہ رہے اور وقت آنے پر یہ اشارات واقع اور معنی خیز بھی بن جائیں یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں قرآن حکیم نے نظام کائنات سے متعلق غلط خیالات و نظریات کی پوری طرح تردید نہیں کی بلکہ ایک حکیمانہ اور دانشمندانہ اسلوب اختیار کیا تاکہ لوگوں کو کسی قسم کی دشواری نہ پیش آئے۔ یا وہ کسی اور قسم کی غلط فہمی میں نہ پڑ جائیں۔ نیز اس میں حکمت بھی ملحوظ رکھی کہ قرآن حکیم کا جو اصل موضوع تعمیر اخلاق اور درس انسانیت ہے اس سے ہٹ کر اس کے متبعین کو اُس دور کے غیر ترقی یافتہ معاشرے کے لیے قرآن کے ان ”نئے دعوؤں“ کی تفہیم کرانا اور ان کا ثبوت فراہم کرنا مشکل ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ منکرین اسلام فوراً یہ اعتراض کرتے اور کہتے کہ قرآن تو ایسے حقائق کا ادعا کر رہا ہے جو مردجہ نظریات کے خلاف ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ اس کے ماننے والے پہلے ان دعوؤں کا ثبوت پیش کریں اور یہی اصول مابعد کے تمام ادوار میں بھی صادق آتا ہے۔

زمین کی حرکت حسب ذیل آیت کریمہ سے بھی ثابت ہوتی ہے:

وَنَرَى الْجِبَالَ تَحْسِبُهَا جَمَادًا وَهِيَ كَالْعِصْفِ الْمُنْفُوشِ ۚ وَاللَّهُ  
الَّذِي أَنْشَأَ كُلَّ شَيْءٍ ط اور تم پہاڑوں کو ٹھہرے ہوئے گمان کرتے ہو حالانکہ وہ بادلوں  
کی سی تیزی سے گزر رہے ہیں۔ یہ اللہ کی صفت ہے جس نے ہر چیز کو استحکام بخشا ہے (سورۃ النجم)  
جدید تحقیقات کے مطابق جتنے بھی ستارے (Stars) سیارے (Planets)  
اور کہکشائیں (Galaxies) دریا ت ہوتی جا رہی ہیں وہ سب سمائے دنیا یا آسمان  
اول کا حصہ ہیں:

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ ۖ وَادْرَجْنَاهَا فِي قُرْبَى الْآسْمَانِ (آسمان اول)

کو چراغوں سے آراستہ کر دیا ہے۔ (صلک: ۵)

چراغوں سے مراد ہر قسم کے ستارے اور سیارے ہیں جو دور سے روشن چراغوں یا

قندیلوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔

إِنَّا زَيْنًا أَسْمَاءُ ۖ إِنَّ الْكُوفِرَ ۖ هُمْ نَ قَرِيبِ آسْمَانِ كُو  
ستاروں سے رونق بخشی ہے (صافات: ۶)

دوربینوں (Telescopes) کے ذریعہ وسیع اور بے کراں خلاؤں میں  
لاکھوں کروڑوں اور اربوں نوری سال (Light years) کے فاصلے پر نظر آنے  
والی کہکشاؤں بھی دراصل ستاروں ہی کے مجموعے ہیں۔ اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک ایک  
کہکشاں میں کم از کم ایک کھرب ستارے (ہمارے سورج جیسے) ہو سکتے ہیں۔ قرآن حکیم کی  
تصریح کے مطابق یہ تمام کہکشاؤں بھی سوائے دنیا ہی کا حصہ ہیں۔ کیونکہ ستاروں کے ان  
جھرمٹوں کو وہ ”بروج“ سے تعبیر کرتا ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّظَرِ ۖ هُمْ ۖ  
آسمان میں (بہت سے) بروج بنائے ہیں اور انھیں بنظر غائر دیکھنے والوں کے لیے سنوار دیا ہے۔

(جمہ: ۱۶)

بروج سے مراد جس طرح مشہور بارہ بروج ہو سکتے ہیں، اسی طرح اس سے مراد کہکشا  
بھی ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ یہ سب ستاروں ہی کے جھرمٹ اور ان کے مجموعے ہیں۔ یہاں پر قابل غور  
بات یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کے شروع میں ”لقد“ کے ذریعہ تاکید بیان ہے اور پھر  
”الناظرین“ کا لفظ لایا گیا ہے ”نظر“ کے معنی محض دیکھنا نہیں بلکہ بنظر غائر یا بنظر تامل  
دیکھنا اور آنکھ کے ذریعہ غور و فکر کرنا بھی ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ دور بینوں سے نظر  
لے اس میں رد ہے فلسفہ یونان کا جو تمام ستاروں کو آکھویں فلک میں جڑا ہوا مانتے ہیں۔

۲۔ بروج بُرج کی جمع ہے جس کے معنی محل کے ہیں۔ اسی وجہ سے ستاروں (کے مجموعے) کو بروج کہا گیا کیونکہ  
یہ ان کی مخصوص منزلیں ہوتی ہیں۔ (المفردات فی غریب القرآن، ص ۳۱)

۳۔ اس کی تفصیل اور ائمہ تفسیر و لغت کے اقوال تیسرے باب میں گزر چکے ہیں۔



آنے والے ستاروں کے ”شہروں“ یا ”کائناتی جزیروں“ پر بیروج کا اطلاق نہ ہو سکے۔  
 پھر دوسری حقیقت یہ ہے کہ ان تمام آیات میں ”السماء“ اور ”السماء الدنیا“ کے  
 الفاظ لائے گئے ہیں، سبع سموات (سات آسمانوں) کے الفاظ نہیں لائے گئے۔  
 اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ دور بینوں سے نظر آنے والے یہ تمام بیروج اور کہکشاؤں میں محض  
 سمائے دنیا یا آسمان اول کا حصہ ہیں۔ اور اس قسم کے چھ آسمان اور ہیں جو ”سمائے دنیا“  
 سے پرے واقع ہیں۔ اور وہ چونکہ انسانی آنکھوں سے مستور ہیں اس لیے ان کی اصل حقیقت  
 کا علم صرف خداوند جل و علا ہی کو ہو سکتا ہے۔ مگر جہاں تک ان کے وجود کا سوال ہے  
 اس سے کم از کم اہل ایمان کو انکار نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ معراج سے متعلق حدیثیں اس  
 مسئلے پر بخوبی روشنی ڈال رہی ہیں۔ چنانچہ معراج کے موقع پر حضرت جبرئیلؑ سرور کونین حضرت  
 محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر ایک ایک کر کے ساتوں آسمانوں تک پہنچے اور ہر ایک  
 کا دروازہ کھلوا دیا۔ اس موقع پر قابل غور بات یہ ہے کہ جبرئیلؑ سے ہر جگہ پوچھا گیا کہ آپ  
 کون ہیں اور آپ کے ساتھ کون ہے؟ اس مکالمے سے بھی یونانی نظریہ کے مطابق افلاک  
 کے شفاف (شفیٹے کی طرح) ہونے کا نظریہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ جن کا نظریہ یہ ہے کہ  
 آکھویں فلک کے ستارے بقیہ افلاک سے گزرتے اور انھیں پار کرتے ہوئے ہم کو پہلے

۱۵ *Island of Universe* دور بینوں کے ذریعہ ان کہکشاؤں کی بہت واضح  
 تصاویر اتاری جا چکی ہیں۔ چونکہ وسیع اور بے کراں خلاؤں میں ان کہکشاؤں کی حیثیت کسی بڑے  
 سمندر کے درمیان چھوٹے چھوٹے جزیروں یا دھبوں جیسی ہے اس لیے انھیں ”کائناتی جزیروں“ کے  
 نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

۱۶ یہ تصور بھی یونانی تصور کے مغائر ہے جو ”فلک الافلاک“ کے اس پار کسی قسم کے ”خلایا ملاء“  
 (خلایا بھرتی جگہ) کے نامکون ہونے کا مدعی ہے۔ اور اس بے بنیاد نظریہ کی صحت پر کوئی دلیل  
 نہیں ہے۔

فلک پر دکھائی پڑتے ہیں۔ بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آسمان شفاف نہیں بلکہ غیر شفاف (opaque) ہے جن کے آر پار دیکھنا ممکن نہیں ہے۔

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا ۚ وَهُوَ آدِيمٌ ۚ أَوَلَمْ يَكُنْ لَهُ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ

(انبیاء: ۳۲)

وَزَيْنًا لِّلسَّمَاءِ الدُّنْيَا مَصْرُوحًا ۖ وَحِفْظًا ۖ وَهُوَ آدِيمٌ ۚ أَوَلَمْ يَكُنْ لَهُ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ  
سے آراستہ کیا اور (اس کو ہر طرح سے) محفوظ کر دیا۔ (ختم سجدہ ۵: ۱۲)

اس طرح اسلامی نظریہ سمادات اور یونانی نظریہ افلاک میں کھلا ہوا تناقض و تضاد موجود ہے اور ان دونوں میں تطبیق کسی بھی طرح ممکن نہیں ہو سکتی۔ حیرت ہے کہ ہمارے علماء اور بعض متکلمین نے (جو فلسفہ یونان سے متاثر و مرعوب تھے) ان واضح براہین کو نظر انداز کر کے تمام یونانی نظریات کو اسلامی نظریات ثابت کر دینے میں اپنا سارا زور صرف کر دیا۔ حالانکہ قرآن حکیم نے مظاہر کائنات میں غور و فکر اور مشاہدہ کی دعوت اسی بنا پر دی تھی کہ رویت و مشاہدہ کے صحیح اصولوں کے باعث یونانی نظریات کی غلطیاں بھی واضح ہو جائیں جو بلا سند و بلا دلیل فرض کر لیے گئے تھے۔ اور دوسری حیثیت سے نظام کائنات کے وہ حقائق منظر عام پر آئیں جن سے دین کی ابدی صداقتوں کا اثبات ہوتا ہو۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ فلسفہ یونان سے متاثر علماء نے یونانی نظریات پر ایمان لا کر قرآن و حدیث میں تاویلات شروع کر دیں؛ حالانکہ ضروری تھا کہ یونانی افکار و نظریات کو کتاب و سنت کی ”نصوص“ (واضح بیانات) پر پیش کرتے اور جو چیز مخالف نظر آتی اس کو رد کر دیتے، مگر ایسا نہ ہو سکا؛ جیسا کہ بہت سے مسلم فلاسفہ اور فلسفہ زدہ علماء نے معراج جسمانی کا انکار محض اس بنا پر کر دیا کہ وہ اپنے خود ساختہ اندک میں ”خرق و التیام“ اور درزد و شکاف وغیرہ کو محال سمجھتے تھے اور جیسا کہ وہ اپنے خانہ ساز ”کرۃ نار“ سے

۱۔ یونانی نظریہ کے مطابق کرۃ بھائی یا کرۃ باد کے ادبہ کرۃ نار پایا جاتا ہے (باقی ص ۶۶۴ پر)

گزرنا اور اس کو پار کرنا بھی محال تصور کرتے تھے۔ اور انہی نظریات و تصورات کی بنا پر موجودہ دور کے علماء خلائی پروازوں کے ذریعہ چاند و دیگر سیاروں تک رسائی کو سخت ناممکن اور محال سمجھتے ہیں۔ اور ایک حیثیت سے وہ اس قسم کی کوشش اور جدوجہد کو خدا کی خدائی میں دخل دینے کے برابر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی خلا بازوں نے ۱۹۶۹ء میں جب پہلی بار کرہ قمر پر کامیابی کے ساتھ قدم رکھا تو مذہبی حلقوں میں ایک کہرام مچ گیا اور تعزیتاً ہر جگہ اس واقعہ کا انکار کر کے مزید تضحیک کا سامان پیدا کیا گیا یہ

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم ایک حیثیت سے یونانی فکر و فلسفے کی بھی تردید کر رہا ہے اور اس کی غلطیوں کو تجربے و مشاہدے کے ذریعہ واضح کر دینا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ نوع انسانی کو تجربے و مشاہدے پر بھارتلے تاکہ ان دونوں کا طرز ہائے فکر کھل کر سامنے آجائے اور یونانی انکار کی غلطیاں اُجاگر ہو جائیں۔ جس دور میں قرآن نازل ہوا اس وقت مسلمان یونانی فکر و فلسفے سے اگرچہ نا آشنا تھے مگر قرآن حکیم چونکہ ایک دائمی اور عالمگیر معیضہ ہے اس لیے اس میں حفظ و اتقادم کے طور پر فکر یونان کے مقابلے کا سامان پہلے ہی سے رکھ دیا گیا تھا، جس طرح کے موجودہ دور کے مقابلے کا سامان بھی اس میں پوری طرح موجود ہے۔

دور عباسیہ میں جب یونانی علوم کا خوب چرچا ہوا تو اہل اسلام کے دگرودہ بن گئے، ایک گروہ علوم یونان کا شیفتہ اور انھیں ہر قسم کی تنقید سے بالاتر — ان علوم کا دقیقہ سنجیوں کی بنا پر — سمجھنے لگا۔ مگر دوسرا گروہ جو قرآنی سرچشمے سے سیراب اور اس کی روح

(حاشیہ نمبر ۱۳۳) (تصریح، ص ۱۰) اس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا ورنہ وہ جل کر خاک ہو جائے گا۔

۱۵ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے راقم سطور کی پہلی کتاب چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں دیکھنی چاہیے، جو فرقانیہ اکیڈمی بنگلور سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔



آشنا تھا اس پر ان علوم کا جادو نہ چل سکا اور اس نے ہمیشہ ان علوم پر تنقید کی اور ان کے مسائل کی غلطیوں کا پردہ چاک کیا۔ ان میں امام غزالی، امام رازی اور امام ابن تیمیہ وغیرہ پیش پیش ہیں۔

غرض اس تشریح و تفصیل سے جدید فلکیات اور قرآنی نظریہ سادات کے سلسلے میں درپیش تمام شکوک و شبہات اور تمام اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں۔ اور قرآن حکیم کی دیگر تمام آیات کی تشریح و توجیہ اس نقطہ نظر سے بالکل واضح ہو جاتی ہے اور کسی بھی قسم کی پیچیدگی باقی نہیں رہتی۔ اس موضوع پر راقم سطور کی ایک مفصل کتاب زیر ترتیب ہے جس میں قرآن حکیم کی متعلقہ تمام آیتوں کا احاطہ کر کے ان کی تفسیر کرنے اور مختلف آیتوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ ہیں:

قَدْ اَنۡاَعَمۡنَا غَیۡرَ ذٰیۡ ذَیۡۤیۡۤیۡ عَوۡجٍ : فصیح اور غیر پیچیدہ قرآن،  
تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیۡنِ : یہ واضح اور روشن کتاب کی آیات ہیں،  
تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحٰکِمِ : یہ پر حکمت کتاب کی آیات ہیں،

کی خوبیاں اور گلکاریاں، جن میں جس قدر زیادہ غور و فکر سے کام لیا جائے اسی قدر ان کے اسرار و معارف کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر اس کتاب حکمت میں تفکر و تدبر کی تاکید کی گئی ہے۔  
اَفَلَا یَتَذٰکَّرُوۡنَ اِنَّ اَمۡرًا عَلٰی قُلُوۡدِہِمْۤ اَفۡحَاسُہَا ۝ کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں! (محمد: ۲۴)

اَفَلَا یَتَذٰکَّرُوۡنَ اِنَّ اَمۡرًا عَلٰی قُلُوۡدِہِمْۤ اَفۡحَاسُہَا ۝ اَفَلَا یَتَذٰکَّرُوۡنَ اِنَّ اَمۡرًا عَلٰی قُلُوۡدِہِمْۤ اَفۡحَاسُہَا ۝  
کثیراً ۝ تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی جانب سے ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا۔ (نساء: ۸۲)

(باقی آئندہ)

# وحدتِ ادیان کا نظریہ اور اسلام

جناب ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔  
پروفیسر دینیات، سٹی سٹیالوجی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

## وحدتِ ادیان کا تصور:

وحدتِ ادیان کے مدّیہ تصور کو مختصر طور سے ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ سارے مذاہب یکساں طور پر حق ہیں۔ ان میں باہم جو فرق ہے وہ حق و باطل کا نہیں بلکہ ان مذاہب کی نوعیت ایسے مختلف راستوں کی ہے جو ایک حقیقت تک رہ نہائی کرتے ہیں۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ کسی بھی مذہب کو اختیار کرنا انسان کی نجات کے لیے کافی ہے اور ہر مذہب ایک ایسا صحیح راستہ یا صراطِ مستقیم ہے جو انسان کو خدا تک پہنچا دیتا ہے۔

## اس تصور کی بنیاد:

فرا سے غور و فکر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس تصور کے پس پشت یہ مفروضہ کام کر رہا ہے کہ موجودہ مذاہب کے فرق و اختلافات صرف سطحی اور اضافی ہیں، حقیقی اور واقعی نہیں۔ اہم ترین سوال یہ ہے کہ یہ مفروضہ خود اپنی جگہ حقیقت واقع ہے یا نہیں اور اس کی معقولیت ثابت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر ہم مذاہب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان کا اہم ترین حصہ تمام اہل مذاہب کے نزدیک وہ ہے جو خیالات و افکار یا عقائد سے تعلق رکھتا ہے اور جس کے بغیر خود ان مذاہب کے ماننے والوں کے خیال میں مذہب کا وجود و عدم یکساں ہو جاتا ہے۔ ان افکار و عقائد پر ایک سرسری نظر ہی اس امر کو واضح کرنے

کے لیے کافی ہے کہ ان کا اختلاف کوئی سطحی اور غیر حقیقی اختلاف نہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کا عقیدہ توحید جو انسانی شرف کی ضمانت دیتا اور انسان کو کائنات کی ہر شے سے اونچا اٹھاتا ہے اور بدعت کی خدا کے بارے میں مکمل خاموشی جس کا نتیجہ بالآخر کائنات میں انسان کے مقام کو غیور افصح چھوڑ دینا ہے؟ انسان کا اپنے ارادی اور اختیاری افعال کا پورے طور پر ذاتی حیثیت سے ذمہ دار ہونا اور یہ عقیدہ کہ نئی نوع انسان کی طرف سے اس کے افعال کا کفارہ کوئی دوسری ہستی بن چکی ہے یا بننے والی ہے اور نتیجتاً وہ ان کی ذمہ داری سے بری ہو چکا ہے؟ انسان اور کائنات کا ربط خدا سے خالق و مخلوق کا ربط ہے اور دونوں میں کسی طرح کی کوئی مشارکت و مشابہت نہیں پائی جاتی جو بنیاد ہے عبادت کے تصور کی اور یہ عقیدہ کہ اس کائنات کا ہر جز خود خدا ہے جو عبادت کے تصور کی کلیتاً نفی کر دیتا ہے؟ انسانی نوع کے افراد میں اونچ نیچے کا معیار صرف اس کا اختیاری فکر و عمل ہے نہ کچھ ایسی خصوصیات جو انسان کے اختیار سے بالکل بیہرہ چیزیں ہیں مثلاً رنگ نسل قومیت وغیرہ جس کے نتیجے میں ایک طرف تو مذہب ہر شخص کے لیے عام ہو جاتا ہے اور دوسری نوع انسان کے ہر فرد کو نجات حاصل کرنے کی طرف دعوت اور اس کی ضمانت دے دی جاتی ہے جب کہ اول الذکر یہ خیال کہ معیار تفصیلت دہی امور ہیں جو اس کے اختیار میں نہیں جس کے ذریعے مذہب اور مذہب ہی تضائل کے حصول کو چند انسانوں کے لیے مخصوص کر کے بقیہ تمام انسانوں پر مذہب کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے؟ ان باہم متضاد و متناقض خیالات و عقائد کے بارے میں یہ سمجھنا کہ ان کے باہمی فروق صرف سطحی فروق ہیں حقیقی نہیں، نہ صرف اہل مذاہب کے نزدیک بلکہ کسی بھی صاحب بصیرت کی نظر میں ایک احمقانہ فعل سے زیادہ نہیں۔ ہم حقیقی اور سطحی اختلاف میں یہی تو فرق کرتے ہیں کہ حقیقی اختلافات وہ ہیں جن میں باہم تضاد پایا جاتا ہو یعنی ان کا ایک جگہ ایک وقت میں اجتماع ناممکن ہو اور اگر ایک جانب کو صحیح تصور کیا جائے تو دوسرے کو غلط ماننا ہر صاحب عقل و ہوش کے نزدیک ضروری ہو اور صحیح اور غلط کے اس فرق کو تحلیل کے آخری مرحلے میں کسی طرح مٹا دینا بجز اس کے اور کسی طبع ممکن نہ ہو کہ عقل نام کی شے کو خیر باد کہہ دیا جائے۔ اس کے برخلاف سطحی اختلافات ہم ان کو



کہتے ہیں کہ باوجود ظاہری طور پر مختلف ہونے کے ان دونوں کا باہمی فرق عمل تحلیل کے آخری مرحلے میں کلیتاً مٹ جائے اور ان میں کوئی تضاد باقی نہ رہے، دوسرے الفاظ میں دونوں کا اجتماع بیک وقت و بیک مقام درست ہو سکے اور جانبین میں صحیح و غلط کا فرق باقی نہ رہ جائے۔ یہ فرق تضاد و تناقض (Contradictories) کا فرق کہلائے گا، نہ کہ تباین (Contraries) کا جس میں ایک کے درست ہونے سے دوسرے کا غلط ہونا لازم نہیں آتا۔ مثال کے طور پر کوئی چیز اگر سیاہ نہیں تو ضروری نہیں کہ وہ سفید ہو۔ قطعاً ممکن ہے کہ وہ سرخ ہو۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مذاہب کے مذکورہ اہم ترین حصوں میں یعنی عقائد و افکار میں وہ اختلافات پائے جاتے ہیں جنہیں عمل تحلیل کے آخری مرحلے میں کسی طرح مٹایا نہیں جاسکتا۔ یہ فرد و اختلافات تضاد و تناقض کے اختلافات ہیں چنانچہ یہ جوہری حقیقی اور بنیادی اختلافات ہیں۔ اوپر ذکر کی ہوئی کسی ایک مثال کو لے کر اس کا تجزیہ و تحلیل کیجئے، یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر یہ عقیدہ کہ یہ کائنات خدا کے وجود کا ایک حصہ ہے یا بحیثیت مجموعی خود خدا ہے یا اس کا ہر جز اپنی جگہ خدا ہے لازمی طور پر اس تصور کو جنم دیتا ہے کہ اس کائنات کی بحیثیت مجموعی یا فرداً فرداً اس کے ہر جز کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ عرفان ذات (Self realization) کے حصول کی کوشش کرے اور اس عرفان ذات کے ایک مرتبہ حاصل ہو جانے کے بعد، بالفاظ دیگر اس حقیقت کی دریافت کے بعد کہ میرا وجود بعینہ اور حقیقتاً وجود خداوندی ہے اس سلسلے کی ہر جد و جہد سے بے نیاز اور اپنی ذمہ داری سے بری ہو جائے۔ یہ بات واضح ہے کہ اس مقصد کے حصول کی یہ کوششیں گیان دھیان اور فکر سے ہی تعبیر کی جاسکتی ہیں۔ ان کوششوں کا آخری نقطہ سکون محض ہے جو عبارت ہے نفی محض سے لیکن اس کے برخلاف یہ عقیدہ کہ خدا اور کائنات دونوں دو علیحدہ حقیقتیں ہیں، چاہے ایک حقیقت کا وجود دوسرے کے مقابلے میں کتنا بھی مضحک کیوں نہ ہو، ان میں ربط خالق و مخلوق اور مالک و مملوک کا ہے، اس تصور کو جنم دیتا ہے کہ اس کائنات کی بحیثیت مجموعی

نیز فرداً فرداً اس کے ہر جز کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے مالک و خالق کی عبادت کرے ،  
 انتہائی فکندگی کے ساتھ اپنے مکمل وجود کو ملوکانہ طریق سے اس کے حوالے کر دے اور اس کی  
 اطاعت میں دل و جان سے سر توڑ کوشش کرے۔ اس حقیقت کا ادراک کہ خدا سے اس کا ربط  
 عید و معبود کا ہے عبادت و اطاعت کی ایک غیر مختتم جدوجہد کو وجود بخشتا ہے۔ اس مقصد کے  
 حصول کی کوششیں گمان و حیلان نہیں عبادت سے تعبیر کی جاتی ہیں۔ اس کا آخری نقطہ  
 حرکتِ محض ہے۔ *رَبِّكَ الَّذِي ارْزُقْنَا مِنْ خَيْرِ مَا كُنْهِيَ الْحَيَوَانُ*۔ (القرآن) جو عبارت ہے اثبات  
 محض سے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ دو مختلف مذہبی عقیدے جن میں سے پہلا ہندومت سے متعلق  
 ہے اور ویدانت کے نام سے موسوم ہے اور دوسرا اسلام سے اور عقیدہ توحید کہلاتا ہے  
 آپس میں اس طرح کا اختلاف رکھتے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی تعبیر و تاویل کے ذریعہ دونوں  
 کو یکساں وقت صحیح و درست کہا جاسکے۔ ان میں سے ایک کو صحیح تسلیم کرنا دوسرے کو غلط تسلیم  
 کرنے کو مستلزم ہے۔ ابتداء سے انتہا تک ہر قدم پر دونوں میں ناقابل تطبیق اختلافات  
 پائے جاتے ہیں۔ کیا عقل و خرد اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہے کہ یہ بات کہ کائنات  
 خود خدا ہے اور یہ امر کہ کائنات الوہیت سے کسی درجے میں نہ متصف ہے نہ اس کا کوئی  
 امکان ہے: خدا کائنات سے مادہ ایک حقیقت ہے دونوں میں تعلق خالق و مخلوق کا ہے  
 اور دونوں میں ایک دوسرے سے کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی، یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن کا  
 فرق حقیقی نہیں سطحی ہے۔ پھر ان کی زندگی پر دونوں کے جو متضاد اثرات نمایاں ہوتے ہیں نیز  
 انسانی زندگی کا جو مقصد و مطمح نظر قرار پاتا ہے کیا ان دونوں کو آپس میں بقیام عقل و ہوش  
 ایک دوسرے سے تطبیق دی جاسکتی ہے۔ اگر یہ اختلاف حقیقی نہیں ہے تو ہمیں یہ بتایا جائے  
 کہ اس کائنات کی کون سی دو چیزوں میں حقیقی اختلاف پایا جاتا ہے۔ پھر تو یہ کہنا پڑے گا  
 کہ زندہ و مردہ، نور و ظلمت، حق و باطل سب ایک ہیں۔ یہ نقطہ نظر کہ یہ مذہبی عقائد ان کا  
 صرف سطحی اور لفظی طور سے مختلف ہیں۔ سرے سے اس بات کی بنیاد ڈھانڈھ دیتا ہے کہ حق اور

باطل آپس میں دو متخالف و متضاد اور متناقض باتیں ہیں اور یہ بات ہی مشکوک ہو جاتی ہے کہ حق اور خیر یا باطل اور شر کا سرے سے کوئی وجود اس عالم میں پایا بھی جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ذرا سوچیے تو معلوم ہو گا کہ یہ نقطہ نظر کہ مذہبی اختلافات حقیقی نہیں، خود نفس مذہب کی بنیاد پر ہمیشہ چلاتا ہے۔ اگر مذاہب کے یہ اختلافات غیر حقیقی، لفظی اور سطحی ہیں تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مذہب بے معنی ہے۔ اگر یہ بات درست ہے کہ تو حید و شرک، اخوت و مسادات انسانی اور رنگ و نسل اور ذات پات کے فرق، انسان کا اپنے افعال کے لیے ذمہ دار ہونا اور کسی دوسری ہستی کا اس ذمہ داری سے اسے بری کر دینا، انسان کا الہی صفات سے متصف ہونا یعنی عقیدہ اوتار اور انہماں کا الہی پیغام رسانی کا ذریعہ ہوتے ہوئے محض بشر ہونا، یہ سب باتیں بیک وقت صحیح اور درست ہیں اور اپنی جگہ سب حق ہیں تو کیا یہ کہنے میں کسی کو باک ہو سکتا ہے کہ یہ سارے تصورات ہی بے معنی ہیں کیونکہ ان کو بامعنی ماننے کا مطلب تو صرف ایک ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ان میں اختلافات حقیقی اور بنیادی ہیں۔ اس کے علاوہ کیا مذکورہ موقف سے ایک قدم اور بڑھا کر یہ کہنا عقل و دانش کے تقاضوں کے خلاف ہو گا کہ خدا کا ہونا اور نہ ہونا، مذہب کا ضروری ہونا اور میکا محض ہونا یہ اختلافات بھی سطحی اور لفظی ہیں اور کیا یہ دعویٰ کرنا دوسرے الفاظ میں یہ کہنا نہیں ہے کہ یہ ساری باتیں محض بے معنی ہیں اور یہ وہ الفاظ ہیں جو شرمندہ مفہوم نہیں۔ ہماری اس بات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مذاہب عالم کے اختلافات کے حقیقی اور واقعی ہونے کا انکار اور اس بات کا دعویٰ کہ ان کی نوعیت صرف سطحی اور لفظی اختلافات کی ہے، دراصل یا تو نفس مذہب کے خلاف ایک سازش ہے یا عقل و ہوش سے بیگانگی کا مظاہرہ۔

یہاں یہ دریافت کیا جاسکتا ہے اور کیا طوطے کے مذاہب کے باقی شعبے جو کم اہم نہیں ہیں یعنی اس کی اخلاقی اقدار اور اس کے ظاہری اعمال ان دونوں کے بارے میں تو اس قدر قطعیت کے ساتھ یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں تک اخلاقی اقدار کا تعلق ہے وہ



کم و بیش تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں اور ان میں اس نوعیت کے اختلافات نہیں ملتے جن کا ذکر کیا گیا۔ ظاہری اعمال و افعال میں بھی یکسانیت مل جاتی ہے۔ اس کے بارے میں مختصر طور سے صرف اتنا عرض کیا جاتا ہے کہ اخلاقی اقدار اور خارجی اعمال و افعال کی یہ کم و بیش ظاہری یکسانیت ہی وحدت ادیان کے نظریے کے بارے میں غلط فہمی کا متنازعہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ افکار و عقائد کے مذکورہ بالا جوہری فروق کے پیش نظر اس ظاہری یکسانیت کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی کیونکہ اخلاقی اقدار اور اعمال و افعال کا پورا پس منظر اور ماحول ان فروق کی وجہ سے تبدیل ہو جاتا ہے اور نتیجہ کے طور پر یہ دونوں بہت شدید طریقے سے اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر ہم ذرا غور سے مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ اخلاقی اقدار کے مشمولات اور ان کی تفصیلات ناقص، کامل اور کامل تر کے نقطہ نظر سے مختلف مذاہب میں بے پناہ فرق رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر شجاعت، توکل، حیا، علم وغیرہ جیسے اخلاق کو اگر مختلف مذاہب کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ان کے مشمولات اور ان کی تفصیلات کے بارے میں مختلف مذاہب میں بہت فرق ملے گا اور اس چیز کا اثر ہر حال پوری مذہبی زندگی پر ناقابل انکار ہے۔ اعمال کی یکسانیت بھی ظاہر ہے کہ اگر فکر و عقیدہ کی یکسانیت سے صادر نہیں ہوئی ہے تو کچھ زیادہ قابل اعتنا چیز نہیں۔

## نظریہ وحدت ادیان کے محرکات

یہاں پہنچ کر یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر کچھ وہ کون سے محرکات ہیں جنہوں نے اس نظریہ کو جنم دیا کہ اپنی موجودہ شکل میں مختلف مذاہب ایک ہی حقیقت تک رسائی کے مختلف ذریعے اور راہیں ہیں۔ درآن حالیکہ ان میں جوہری فروق اور بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہ تاریخ مذہب کے انتہائی اہم اور دلچسپ سوالوں میں سے ہے اور ہم ذیل میں اس کا جواب دینے کی کوشش کریں گے:

۱۔ جذبہ رواداری | قلب انسانی کی عظمت ایک نہایت عظیم اور لطیف جذبہ اور براہ راست انسانیت کا تقاضا ہے۔ کسی کا دل ہمارے کسی قول و فعل سے نہ دکھے یہ انسانیت کی ایک عزیز ترین متاع ہے۔ اس جذبے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے قول و فعل میں اتنا محتاط ہو کہ دوسرے انسانوں کو ہر ممکن ایذا ہی سے محفوظ رکھے۔ لیکن جیسے ہر پاکیزہ جذبہ جب حدود سے تجاوز کرتا ہے تو اس سے غلط نتائج برآمد ہوتے ہیں ویسے ہی اس جذبے کے ساتھ بھی ہوا۔ باطل کو باطل کہنے کے کسی کا دل دکھتا ہے اس لیے اسے باطل نہ کہو، یہ اس جذبے کی غلط روی اور اس کا غلط اظہار ہے۔ مذہبی انکار و عقائد کے ابطال و تغلیط سے سب سے زیادہ انسان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں چنانچہ جذبہ رواداری کے مظاہرے کے طور پر وحدتِ ادیان کے نظریے کا سہارا لے کر باطل اور حق کے سارے امتیازی فرقہ پر پردہ ڈال دیا گیا۔ حالانکہ دل نہ دکھانے کے جذبے کا تقاضا صرف اس سے پورا ہو جاتا ہے کہ کسی نے جذبات کو مجروح نہ کرنے کے عزم کے ساتھ نہایت مناسب اور معقول طرز سے باطل کا باطل ہونا واضح کر دیا جائے۔ باطل کو باطل نہ کہنا انسان دوستی اور رواداری نہیں بلکہ بدترین انسان دشمنی ہے۔ مذہبی عقائد کی غلطیوں اور ان کے بطلان کو مہر دی اور رواداری کے پردے میں چھپالینا پوری انسانیت کو گمراہی اور ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دینے کے علاوہ کچھ نہیں۔ وحدتِ ادیان کے نظریے کے ذریعہ اس گمراہ کن کوشش کو سہارا دینا اور اس کی تاویل یا فلسفیانہ بحث و گفتگو کی بھول بھلیوں میں ڈال دینا مذہب کی تاریخ میں انسانیت کو غلط روی پر آمادہ کرنے اور پھر اس غلط روی کی معقولیت ثابت کرنے کی بدترین مثالوں میں ہے۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ نظریہ وحدتِ ادیان درحقیقت رواداری اور احترامِ قلب انسانی کے مریضانہ جذبے کے حق کے ساتھ جذبہ وقار داری کو کمزور کر کے اس پر فتح پالینے کا دوسرا نام ہے۔ جب محبتِ حق اور انہماکِ حق کا جذبہ ضعیف ہو کر رواداری کا یہ غلط

تصور انسان کے دل و دماغ پر چھپا جاتا ہے تب ہی نظریہ وحدت ادیان جنم لے سکتا ہے اس سے پہلے ہرگز نہیں۔ حالانکہ حق کے ساتھ وفاداری ہر دوسرے رشتے اور جذبے پر مقدم ہونا چاہیے، اور اس جذبے کا براہ راست تقاضا یہ ہے کہ حق کو حق اور باطل کو باطل بے لاگ طریقے سے کہا جائے مگر مناسب ڈھنگ، صحیح نیت اور نوع انسانی کی حقیقی اور مکمل ہمدردی کے ساتھ۔

۲۔ اختلافات کو ختم یا کم کرنے کا جذبہ | یہ ظاہر ہے کہ مذہبی اختلافات میں جوش و خروش ہوتا ہے وہ دیگر اختلافات میں کم پائی جاتی ہے۔ کیونکہ مذہب کا تعلق انسان کے پورے وجود و جذبات اور داخلی زندگی سے نہایت مضبوط قسم کا ہوتا ہے، چنانچہ جب کبھی یہ اختلافات اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہیں انسانی معاشرے میں نہایت سخت قسم کا بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک شخص جذبہ ہے کہ اختلافات کچھ حدود کے اندر ہیں اور ان کے غلط طریقے سے اظہار سے انسان کا امن و سکون درہم برہم نہ ہو مگر اس جذبے کے غلط مظاہرے نے ان نیک نیت لوگوں کو ایک دوسری غلطی پر آمادہ کر دیا۔ سمجھا یہ گیا کہ اگر لوگوں کے ذہنوں پر یہ بات مستحکم کر دی جائے کہ یہ مذہبی اختلافات سرے سے حقیقی اختلافات ہی نہیں، بسا اے مذاہب درحقیقت مختلف عنوان سے ایک ہی حقیقت کے قائل اور طالب ہیں تو ان اختلافات کی شدت کم ہو جائے گی، چنانچہ وحدت ادیان کا نظریہ پیش کر دیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ انسانی زندگی کے ایک نہایت اہم مسئلے کا حد درجہ غلط حل تھا۔ فکر انسانی کے اختلافات اگر وہ ذاتی منفعت پرستی کا نتیجہ نہیں ہیں تو انسانی ذہن کی ایک صحت مند اور قابل ستائش جدوجہد کا ثمرہ ہیں۔ یہ اختلافات فی حد ذاتہ کوئی بری چیز نہیں۔ ہاں ان کے حدود کو ملحوظ نہ رکھنا اور انہیں تخریب کاری کا ایک ذریعہ بنا لینا دراصل یہ وہ چیز ہے جو قابل مذمت ہے چنانچہ اس کا جو صحیح طریقہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ لوگوں کو نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ غور و فکر پر آمادہ کیا جائے نہ اس بات کی تعلیم کہ غور و فکر کے تمام نتائج کو حق اور درست تسلیم کرنا چاہیے



چانگ میں کتنا ہی تضاد کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ اختلافات کو کم کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ حق کو حق تسلیم کیا جائے اور باطل کو باطل کہا جائے۔ اور حق کی طرف پورے خلوص اور معقولیت سے دعوت دی جائے نہ یہ کہ حق و باطل کے سارے حقیقی امتیازات کو کالعدم قرار دے کر ان دونوں کو ایک ہی حقیقت کے مختلف رخ قرار دیا جائے۔

۳۔ تلاش حق کی صعوبتیں | حق و باطل کو ایک ہی چیز قرار دے دینے کی وجہ بعض اوقات یہ بھی ہوتی ہے کہ حق کی تلاش اس کائنات کا دشوار ترین کام ہے۔ اس میں نہ صرف ذاتی اور گروہی عصبیتوں کے کانٹے رہر در راہ حق کے پاؤں کو لہو لہان کرتے ہیں بلکہ ہر طرح کی قربانیاں اس کے لیے دینا پڑتی ہیں۔ پسند و ناپسند کے اپنے رجحانات، رچے ہوئے رسم و رواج، فکر و نظر کے رائج زادے ہر قدم پر دامن گیر ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس ہفت خواں کے طے کرنے کی ہمت نہیں رکھتے اکثر اوقات سہل پسندی اور سہل انگاری سے کام لے کر کمترین منازعت کی راہ اختیار کرتے ہوئے حق و باطل کے فرق کا انکار کر دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ وحدت ادیان کے نظریے کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ اور اپنی ذہنی پستی اور فکر و نظر کے دیوالیہ پن، تلاش حق کے جذبے کی کمزوری یا فقدان پر پردہ ڈالنے کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ اخلاقی جرأت کی کمی | بعض اوقات انسان حق و باطل کے جوہری فروق کو پورے طور پر سمجھتا ہے تاہم وہ حق کو حق اور باطل کو باطل علی الاعلان کہنے سے اس وجہ سے گریز کرتا ہے کہ اس طرح کچھ خاص افراد، گروہوں یا طبقات کی ہمدردیاں اسے حاصل رہیں گی، کم از کم وہ ان کا معتبوب نہ ہوگا اور جو مقام اسے ان کی نگاہوں میں حاصل ہو گیا ہے اس سے وہ خردا نہ ہوگا۔ ایسے لوگ بڑے اطمینان سے نظریۂ وحدت ادیان کو اختیار کر کے ضمیر فرودشی کرتے رہتے ہیں اور اپنے تمام افعال و اعمال کو معقول ثابت کرنے کے لیے ایک فلسفیانہ توجیہ فراہم کر لیتے ہیں۔

۵۔ مصالحت پسندی کا جذبہ | حق اور باطل میں واضح طور پر فرق کرنے کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں اور ایک شدید نظر باقی اور اخلاقی کشمکش کا آغاز ہو جاتا ہے، تاکہ حق کی قوت باطل پر غالب آجائے۔ بعض کچھ فہم لوگ خود اس صورت حال کو فساد تصور کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان اختلافات کو دھندلا اور غیر واضح کر دیا جائے یا اسے غیر حقیقی اور لفظی قرار دے کر ٹال دیا جائے تو اس فساد کا سرچشمہ بند ہو جائے گا۔ چنانچہ نظریہ وحدت ادیان کو پیش کر دیتے ہیں۔ حالانکہ جس چیز کو وہ فساد سمجھ رہے ہیں وہی حقیقی اصلاح ہے۔ فساد کی جڑ یہ ہے کہ حق اور باطل کو گڈمڈ کر دیا جائے جس کے نتیجے میں انسان کے اخلاقی شعور کا دیوالہ بکل جائے۔ اس کے برعکس جو چیز اخلاقی شعور کو نقطہ اوج پر پہنچانے والی ہے وہ حق و باطل کا روشن فرق ہے۔ باطل سے اس طرح سمجھوتہ کر لینا اور اصولوں اور حق کے عوض مصالحتوں کا سودا کر لینا انسانی سیرت میں منافقت کو جنم دیتا ہے اور انسانی سیرت کا یہ دورِ خاپن اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک باطل سے غیر مشروط جنگ نہ کر لی جائے۔ نظریہ وحدت ادیان کو سماجی میدان میں نسلی، وطنی اور سیاسی بنیاد پر اتحاد کے حصول کے آلہ کار کے طور پر بار بار استعمال کیا گیا ہے مگر اس کا نتیجہ صرف وقتی اتحاد کے علاوہ کسی پائدار اور دائمی اتحاد کی صورت میں کبھی نہیں نکل سکا۔ دائمی اور پائدار اتحاد صرف حق و باطل کے فرق کو تسلیم کر لینے کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔

۶۔ تلاش حق اور حصول حق میں عدم امتیاز | جن حضرات نے تلاش حق میں سخت ترین جدوجہد کی وہ ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بعض اوقات غلط فہمی کا سامان بن گئی۔ نیک نیتی کے ساتھ تلاش حق کی کوشش اپنی جگہ درست اور صحیح مگر یہ ضروری نہیں کہ اس کوشش کے نتیجے میں لازمی طور پر حصول حق ہو بھی گیا ہو۔ ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ تلاش حق کی جدوجہد اس کے لیے قربانیاں، نیک نیتی وغیرہ یہ تمام باتیں ایک دیکھنے والے کو بعض اوقات یہ غلط تاثر دے دیتی ہیں کہ اس شخص نے حق کو حاصل کر لیا تھا۔ اس کے

نتائجِ جدوجہد کا جب وہ بعض دوسرے لوگوں کی کوششوں کے متضاد نتائج سے مقابلہ کر کے دیکھتا ہے تو بعض اوقات اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان دونوں نے حق کے دو مختلف رخ دریافت کیے تھے اور نظریہ وحدتِ ادیان کا قائل ہو جاتا ہے حالانکہ صرف جدوجہدِ قربانیاں اور نیک نیتی ہی کسی کے حق ہونے کی کافی دلیل نہیں ہیں۔

## وحدتِ ادیان کے مذکورہ تصور کی مضرتیں:

۱۔ انسان کے اخلاقی شعور کا زرداں | انسان اور جانور میں بڑا فرق اخلاقی شعور کا ہے۔ خیر و شر کا احساس، اور اس کی بنیاد پر اپنے اعمال کا جواب دہ اور ذمہ دار ہونا یہ وہ چیز ہے جو انسان کو حیوان سے متمیز کرتی ہے۔ وحدتِ ادیان کا نظریہ حق اور باطل اور خیر و شر میں فرق نہ کرنے اور انہیں ایک ہی چیز سمجھنے پر مبنی ہے لیکن ان دونوں کو ایک قرار دینا انسان کے اخلاقی شعور کا جنازہ نکال دینے کے مترادف ہے اور اسے انسان کے دائرے سے نکال کر حیوان کے دائرہ میں شامل کر دینے کی کوشش۔ حق و باطل کے بارے میں انسان جس قدر شدید نزاکتِ احساس کا مالک ہوگا اسی قدر اس کی انسانیت نکھری ہوئی اور اعلیٰ درجے کی ہوگی اور وہ انسانیت کے مثلاً اعلیٰ کے قریب تر ہوگا۔ اور اس کے برخلاف اس بارے میں احساسات کا کند ہو جانا اسے اسی نسبت سے حیوان اور جانور سے قریب تر کرنا چلا جاتا ہے۔

۲۔ عقل و فہم کا تعطل | یہ نظریہ لازمی طور سے فکر و فہم کی قوتوں کو مفلوج کرتا ہے۔ انسانی عقل و فہم کا اولین فرضِ صحیح اور غلط میں تمیز کرنا ہے۔ اور جب ہر خیال، عقیدہ اور فکر کو یکساں طور پر حق اور درست سمجھ لیا جائے تو عقل انسانی اپنے بنیادی عمل سے محروم ہو جاتی ہے اس کے بعد آبارِ واحد کی اندھی تقلید اور ماحول میں رہے ہوئے خیالات و عقائد ہی انسان کا تمام تر سرمایہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ عقل کا یہ تعطل انسانی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے جس کے بعد انسان بغیر صحیح غلط کی تمیز کے افکار و خیالات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔



۳۔ مصلحت پسندی کا نظریہ حیات بن جانا۔ اخلاقی شعور اور عقل و فہم کو معطل کر دینے کے بعد یہ ضروری ہے کہ انفرادی یا گروہی تعصبات اور نیچے درجے کی مصلحت پسندیاں زندگی کا شعار بن کر رہ جاتی ہیں۔ حق و باطل کا فرق اٹھ جانے کے بعد مفاد پرستی کے لیے کھلا ہوا میدان انسان کے لیے مل جاتا ہے۔

۴۔ انسانی زندگی کا پائیدار بنیادوں سے محروم ہو جانا۔ حق و باطل کا احساس اور حق کی حمایت کرنے کے لیے سب کچھ سچے دینے کا جذبہ انسانی زندگی کو ایک پائیدار بنیاد پر کھڑا کرتا ہے، نظریہ وحدت ادیان انسانی زندگی کو اس قوتِ محرکہ سے یکسر محروم کر دیتا ہے۔  
(باقی آئندہ)

## عرب دنیا

اردو دال طبقہ کی اکثریت کو عرب اور بلا د عرب سے ایک دلی تعلق ہے مگر اردو میں ان ممالک کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے سلسلے میں مولانا محی الدین الوائی ایم۔ اے (الازہر - قاہرہ) کی یکوشش یقیناً پسند کی جائے گی۔ الوائی صاحب نے خلیج فارس سے مراکش تک پھیلے ہوئے تمام عرب ممالک کے عام ملکی، جغرافیائی، ثقافتی، اور معاشری حالات، اقتصادیات اور آج کی رواں تحریکات کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ ابتداء کتاب میں ایک رنگین نقشہ بھی ہے جس سے عرب ممالک کے محل وقوع پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ صفحہ ۱۱۳۔ قیمت - ۱/۷ روپے  
ملنے کا پتہ: مکتبہ برہان، اردو بازار جامع مسجد، دہلی ۷۔

# وشوا بھارتی یونیورسٹی کے

## فارسی، عربی اور اردو مخطوطات

عبد الہاب صاحب بدرستوی، سنٹرل لائبریری، وشوا بھارتی یونیورسٹی، شانتی نیکیتن  
(مغربی بنگال)

(۲)  
کمیاب فارسی مخطوطات

مارچ ۱۹۸۱ء کے برہان میں چند نایاب نسخوں کا تعارف پیش کیا گیا تھا۔ اب کمیاب کے  
بارے میں چند سطر پر عرض کی جا رہی ہیں۔ مناسب تو یہ تھا کہ صفحات برہان پر پیش نظر عنوان  
کے تعارفی مضمون کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ انقطاع کے داغ سے پاک ہوتا لیکن  
چند مواعیات کی بنا پر تکمیل آرزو نہ ہو سکی۔ اب وہ مواعیات دور ہو چکے ہیں اس لیے ہمارے  
تسلسل ٹوٹنے نہیں پائے گی۔

اس معذرت کے ساتھ یہ بھی عرض ہے کہ جن نسخوں کو متعارف کرایا جا رہا ہے ان کے  
بارے میں یہ بتانے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ ہندوستان کے مشہور کتب خانوں اور علمی  
اداروں میں کہاں کہاں اصل متن یا ترجمہ وغیرہ کی شکل میں موجود ہیں۔ اس ضمن میں کسی  
فرد واحد کی ذاتی ملکیت مراد نہیں ہے۔ بدرستوی۔

۱۔ نگارستان | مصنف معینی ابوجہنی۔ صفحات ۵۴۰۔ تاریخ کتابت ماہ شوال ۱۵۴۶ھ  
کاتب محمد حسین بن محمد مظفر ٹانگل صفحہ کی ایک تحریر کے مطابق یہ نسخہ اولاً ۹۹۶ھ میں مرشد آباد

دہلی کے نواب معین الدولہ کی لائبریری میں داخل ہوا تھا۔ لیکن اب یہ کسی طرح وہاں سے دشوا بھارتی لائبریری میں آگیا۔

لنگارستان کتاب ناچیز کی تحقیق کے مطابق ہندوستان کی کسی دوسری لائبریری میں نہیں پائی جاتی۔ البتہ بیرون ہند لندن کے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ برٹش میوزیم والے نسخہ میں تاریخ کتابت درج نہیں لیکن انڈیا آفس لائبریری والے نسخہ کی کتابت ۱۵۶۹ء ہے۔ بنابرین بیش نظر نسخہ دوحیثیتوں سے دشوا بھارتی یونیورسٹی لائبریری کے یہ باعث فخر ہے کہ کم از کم ہندوستان میں یہ نسخہ نایاب اور انڈیا آفس لائبریری والے نسخہ سے قدیم تر ہے۔ نسخہ کا ہر صفحہ انیس سطور پر مشتمل اور سنہری و نیلی لائنوں سے محیط ہے۔ عنوانات، قرآنی آیات اور احادیث کی کتابت کے لیے سرخ روشنائی استعمال کی گئی ہے۔ یہ نسخہ بخط نستعلیق نہایت ہی صاف اور اچھی حالت میں ہے۔

موضوع نسخہ اخلاقیات ہے جو گلستان شیخ سعدی (متوفی ۱۲۹۱ھ) کی پیروی میں ۱۳۳۵ھ میں تالیف ہوا جو حسب ذیل سات ابواب پر منقسم ہے :

”باب اول در مکارم اخلاق، باب دوم در نصیحت و پرہیزگاری، باب سوم در حسن معاشرت، باب چہارم در عشق و محبت، باب پنجم در وعظ و نصیحت، باب ششم در فضل و رحمت، باب ہفتم در فساد و مفرقہ۔“

شروع کے ستائیس صفحات دیباچہ کے ہیں جن میں مصنف نے اسباب تصنیف، وجہ تسمیہ کتاب، شاہ وقت اور اس کے ذریعہ اعظم کی مدح نیز اپنے پیر اور استاد کا ذکر کیا ہے۔ دیباچہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کتاب ہذا کو شاہ وقت کا اشارہ تھا کہ اخلاق پر ایک کتاب تالیف ہونی چاہیے۔ اسی اشارہ کے بموجب مصنف موصوف آمادہ ہوئے اور اس کے لیے مواد جمع کرنا شروع کر دیا لیکن ماسازگار کی حالات ترتیب تالیف میں حائل ہوتے رہے چنانچہ لکھتے ہیں :



”زمانہ جانی از سرتا انصافی تحصیل آں مراد و ادراک آں مرام رخصت  
نمی داد و روزگار تا سازگار بہینہ اسباب فراغت مساحت نمی نمود ایام نازجا  
ساعتہ فضاۃ یعنی ملہی و تعبیر مشاغل می ساخت و سپہر بد ہر دم بدم رنگی دیگر  
بر آب می زد و سنگ در آ بگینہ خانہ داعیہ و ارادت می انداخت <sup>۱</sup>  
مزید بر آں مصنف کو اپنے خاندانی اعزاد اقرباء کے ادھر ادھر منتشر ہو جاتے ہیں بھی  
تکمیلی کتاب کے سلسلے میں یکسوئی ذہن و طمانیت قلب میسر نہیں تھی:

”باندک زمانی و کمتر مدتی اہالی خاندان کہ عقیدت ریاضی مجموع بودند چوں بنات نعش  
متفرق گشتند از اکثر مائے ان کہ پیوند جانی داشتند و اتصال دینی خالی گشت  
از عمر سر حوادث نکبار و روزگار در باغ عمر تازہ و تزیین گل نہاند  
سیلاب غم گرفت حوالی دل تمام در سینہ از نشاط و طرب جز و کلی نہاند  
بشکست عود و شمع فرو مردگی بر سخت مخور گشت ساقی در شیفہ مل نہاند <sup>۲</sup>“

انہی حالات میں مصنف کے گھر ہی پر ایک بار ان کے والد کے پاس کچھ عقیدتمند دل اور مال  
دل کی مجلس جمی ہوئی تھی جس میں چند سابقہ کتب کے حسن و قبح پر خیال آرائیاں ہو رہی تھیں۔ ہر  
خداپسندی اپنی پسندیدہ کتابوں کے متعلق مبالغہ آمیز رائیں دیتا اور ناپسندیدہ کتب پر کار و تنقید  
و جرح پھیرتا رہا۔ خصوصیت کے ساتھ گلستان سعدی کا ذکر بھی آیا جس کے حسن بیان اور  
سلاست و روانی عبارت پر تقریباً بھی متفق رائے تھے۔ مصنف نسخہ ہذا خود بھی مجلس میں موجود  
تھے کہنے لگے کہ گلستان یقیناً لا جواب تصنیف ہے لیکن عیب سے صرف صحیفہ خداوندی ہی برآ ہے:

۱۔ دیباچہ نگارستان: ص ۵۔ ۲۔ بمعنی انگوری شراب۔ ۳۔ دیباچہ نگارستان: ص ۹۔  
۴۔ مصنف معنی نے نگارستان میں اپنے والد سے متعلق چند حکایات ذکر کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے  
کہ وہ ممونی تھے اور کچھ افراد موصوف کے حلقہ ارادت میں شامل بھی تھے۔

”اگر تو فکر کنی درجہاں نیابی بیچ بجز کتاب کریم خدای عز و جل“

اس لیے دورِ حاضر کا تقاضا ہے کہ جدید تصنیفات بھی موضوع اخلاق سے متعلق منظر عام پر آئیں۔ چنانچہ اس طویل مجلس کا انجام یہ ہوا کہ جدید تصنیف کا بارِ گراں معنی ابھوسنی ہی اپنے ضعیف و ناتواں دوش پر رکھیں۔ آخر کار موصوف اپنی بے بضاعتی اور وقت کی نامساعدت کے باوجود شغلِ ترتیب میں منہمک ہو گئے۔ کچھ مواد اکٹھا کر لینے کے بعد ابتداءً اپنے مسودہ کا نام ”فتح“ رکھا تھا:

”آسودہ گشت قاطم از فکر نامہ کز غیبِ فانی“ فتح ”برآمدِ بنام او“

نامی نہاد مش کہ اگر بست کری بود صباغ و بوستان و گلستان غلام او“

لیکن چند جوہات کی بنا پر یہ نام مصنف کے پسندِ خاطر نہ ہوا۔ لہذا القیاس نام کے سلسلے میں مزاراتِ مشائخ کی زیارت کے لیے نیشاپور کی جانب رختِ سفر باندھنے کی ضرورت محسوس کی:

”بعزیمتِ زیارتِ مراقد و مضاجعِ مشائخ متوجہ نیشاپور شدم“

نیشاپور پہنچنے کے بعد وہاں کے احباب اور بزرگوں نے سفر کی غرض و غایت معلوم کرنی چاہی، موصوف نے تفصیل کے ساتھ جب اپنا مقصدِ سفر بیان کیا تو ایک کرم فرمانے مشورہ دیا کہ یہاں قریب ہی فلاں مزار کے پاس ”نگارستان“ نامی ایک معروف و مشہور باغ ہے، وہاں کی لطف اندوزی سے آپ کی مراد بر آئے گی۔ چنانچہ معنی ابھوسنی باغ میں تشریف لے گئے جہاں کی پربہار اور زحمت بخش فضاؤں سے نام کتاب لا ینحل عقدہ حل ہو گیا اور اس طرح گویا اپنی کتاب کا نام بھی مذکورہ باغ کے نام سے موسوم کیا:

لہ دیباچہ نگارستان: ص ۱۰ لکھ ایضاً: ص ۱۲ لکھ ایضاً۔

”شاد ماں بر جسم دجانی رختِ مراجعت در بستم۔ عقدہ ضمیر کشادہ و اجزا رنیشہ

را نام ”نگارستان“ نہادہ، بشتاب ہر چند تمام تر مرکب می راندم“<sup>۱</sup>

یہ کتاب نگارستان اپنی بہتر سے بہتر حکایاتی فصاحت اور سبق آموز واقعات کے باوجود گنہای میں کیوں پڑی رہ گئی؟ گو کہیں نہ کہیں اس کا کافی شہرہ رہا اور قبولیت عام و خاص کا اعزاز بھی پایا۔ لیکن حیرت ہے کہ ہمارے ہندوستان میں گلستانِ سعدی کے بمقابلہ اس کا عشرِ عشر حصہ بھی اسے نہ ملا۔ اور سب سے زیادہ قابلِ افسوس المیہ یہ ہے کہ مصنفینِ فارسی اور اردو نے اس کے تغار فی سلسلے میں کچھ بھی لکھنا گوارا نہ کیا۔ اگر کسی نے ہمت کی تو صرف نام کتاب و مصنف ذکر کر کے عنانِ قلم کھینچ لی۔ ملک الشعراء آقا محمد تقی بہار (متوفی ۱۳۳۳ھ) نے صرف اتنا لکھا ہے کہ گلستان کی تقلید میں لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے اہم اور مشہور ترین میں سے کتابیں ہیں؛ معنی ابخونی کی ”نگارستان“ جامی (متوفی ۸۹۸ھ) کی ”بہارستان“ اور قاضی (متوفی ۸۰۷ھ) کی ”پریشان“۔ البتہ ”تذکرۃ الشعراء“ فہرستِ کتبِ فارسی انڈیا آفس لائبریری جلد اول اور فہرستِ کتب فارسی برٹش میوزیم جلد دوم میں چند سطور میں مذکور ہیں لیکن ان تینوں میں ”تذکرۃ الشعراء“ نے کسی حد تک اہمیت کتاب ”نگارستان“ کی مزید اطلاع بہم پہنچائی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دولت شاہ سمرقندی (متوفی ۹۱۴ھ) کی پوری عبارت درج کر دی جائے:

”کتاب نگارستان از مؤلفات مولانا معینی است کہ بر طرز گلستان شیخ سعدی

نوشته۔ اما ازان کتاب بسیط تر است و دانشمندانہ نوشتہ و لوا در و امثال و

حکمتہای مفید در ان کتاب درج نموده و مشائخ بحر آباد<sup>۲</sup> آن کتاب را

<sup>۱</sup> دیباچہ نگارستان: ص ۱۸۔ <sup>۲</sup> سبک شناسی (تاریخ تطویرِ نثر فارسی) جلد سوم: ص ۱۵۶۔

<sup>۳</sup> یہ مقام خراسان میں ہے جہاں مشہور صوفی شیخ الملّہ والدین محمد بن المویدا الحموی کی قبر ہے

(بحوالہ سفینۃ الاولیاء رقلی، مملوکہ و شرا بہارتی) مصنفہ داراشکوہ (متوفی ۱۰۶۸ھ) ص ۱۰۲۔



پیشکش اُنغ بیگ کردند۔ بوقتیکہ سلطان مشا رہا یہ در محل یورش عراق بنیارت اکابر  
سحر آباد آمدہ بود و بادشاہ فرمود تا کتاب آن کتاب را نوشتند خوب ترین خطی و تکلفی  
و داستانہی کتاب را مطالعہ فرمودے و پسندیدہ داشتی۔ و آن کتاب در مادرانہر  
شہر قی عظیم یافتہ <sup>۱۵۸۵</sup>

۱۰۔ اس اقتباس سے تاثر میں خود ہی کتاب مذکور کی عظمت و خوبی کا اندازہ کر سکتے ہیں خصوصیت  
سے مرزا اُنغ بیگ گورکان جیسے بادشاہ، مبتحر عالم اور ماہر فنون ریاضی و نجوم کی پسند گو یا خود کسی  
کتاب کے لیے عظیم ثبوت ہے۔ یہ مرزا اُنغ بیگ امیر تیمور کا پوتا یعنی مرزا شاہ رخ (متوفی ۸۵۵ھ/۱۴۴۶ء)  
کا لڑکا تھا جو ۸۹۲ھ میں قلعہ سلطانہ میں پیدا ہوا۔ گیارہ سال کی عمر کو بہ چچا نو باب نے  
سفر آخرت اختیار کر لیا۔ ۹۱۱ھ میں ماوراء النہر کا گور بنایا گیا۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا  
بھی اپنے زیر نگین کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں اس کا لڑا لڑکا مرزا عبداللطیف باغی ہو کر باپ کے بالذمہ  
محاذ جنگ کھول دیا۔ چنانچہ انجام جنگ یہ ہوا کہ باپ کو بیٹے کے آگے شکست اور سرنخوں ہونے  
کی ذلت اٹھانی پڑی۔ پھر معاملہ یہیں ختم نہ ہوا بلکہ بیٹے نے اپنے باپ اور چھوٹے بھائی مرزا عبدالعزیز  
کو ۸۵۳ھ میں شہید کر دیا۔ پھر خدا کی قدرت اور اس کا کرشمہ دیکھیے کہ باپ کی شہادت کے چھ  
ماہ بعد ہی مرزا عبداللطیف بھی ۸۵۴ھ میں اُنغ بیگ اور عبدالعزیز کے ملازموں کے ذریعے قتل  
کر دیا گیا۔ اُنغ بیگ کو شہید کرانے کے بعد تادم آخر شیخ ذیل عبداللطیف کے در زبان رہا:  
”پدرکش پادشاہی را نشاید دگر شاید بجز شش مہ نپاید <sup>۱۵۸۵</sup>  
حیات مصنف نگارستان نام معین الدین، تخلص معینی، وطن ”آدہ“ منسوب بچوین اور سفرین <sup>۱۵۸۵</sup>

۱۔ تذکرۃ الشعراء: ص ۳۴۱ ۲۔ حبیب السیر جلد سوم: ص ۱۵۱ مصنف خزانہ میر (متوفی ۹۲۱ھ)  
۳۔ حبیب السیر جلد سوم: ص ۱۶۳؛ مصنف خزانہ میر ۳، ۴، ۵۔ یہ دونوں مقامات صوبہ خراسان کے مشہور  
شہر نیشاپور کے علاقے میں ہیں۔ بحوالہ لخت نامہ جلد ۱ حرف الف: ص ۲۲ ۲۳ اور حرف جیم: ص ۱۶۸

صاحب نگارستان کی حیات بھی ان کی تصنیف کی طرح اہل قلم کے نزدیک غالباً قابل اعتناء تصور نہیں کی گئی۔ حیرت ہے کہ خود معینی الجونی نے اپنی کتاب کا جو طویل دیباچہ لکھا ہے اس کے بھی پیدائش یا خاندانی حالات زندگی کی وضاحت نہیں ہوتی۔ صرف برٹش میوزیم، لندن کی فارسی کٹلگ جلد دوم میں مسٹر چارلس ریو (Charles Rieu) اور دولت شاہ سمرقندی نے تقریباً ایک ہی طرح کی چند سطریں لکھی ہیں۔ یہاں دولت شاہ کی پوری عبارت نقل کی جا رہی ہے :

”مرد فاضل و دانشمند و سالک بودہ و از حمله مریدان قائدان مبارک شیخ الشیوخ سعد الملتہ والدین المحدثیہ بودہ است و مولد مبارک مولانا معینی قریہ ”اندادہ“ است من اعمال مجتہدین و اود در علم شاگرد مولانا فخر الدین خالدی اسفراینی است کہ این مولانا میان علمای بہشتی مشہور است و شرح تراغیض او نوشتہ است“  
مقام ولادت کے سلسلے میں مسٹر ریو نے ”آدہ“ لکھا ہے۔ یہی مقام صحیح معلوم ہوتا ہے جو جوہرین اور اسفراین کے مضافات ہی میں ایک مشہور قریہ تھا جس کا ذکر دیگر کتب تواتر بخ و جزانیہ میں بھی ملتا ہے خصوصیات کے ساتھ مسٹر جی۔ لی اسٹرینج (G. Le Strange) اور حمد اللہ مستوفی قزوینی (متوفی ۱۳۵۵ھ) نے تفصیل کے ساتھ ”آدہ“ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن دولت شاہ کا قمرزدہ مقام ”اندادہ“ تلاش بسیار کے باوجود مجھے کسی کتاب میں نہیں ملا۔  
مولانا معینی الجونی آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے ایک باصلاحیت عالم و بزرگ تھے۔ نیز عربی اور فارسی زبانوں پر مکمل عبور کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں میں تخلیق

۱۔ تذکرۃ الشعراء: ص ۳۴۔ ۲۔ Persian Catalogue British

Museum, v. 2: P. 754۔ ۳۔ جزانیہ خلافت مشرقی (اردو)؛ مترجم مشر جمال الرحمن

صفحات ۱۹۶، ۲۱۰، ۲۱۲، ۲۲۹، مطبوعہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن، ۱۳۱۳ھ اور زہرہ اقلوب ص ۶۰۔

اشعار پر بھی قدرت رکھتے تھے جس کی شہادت وہ اشعار ہیں جو صفحات نگارستان پر متعدد جگہوں میں حسبِ مواقع مذکور ہیں۔

موصوف کے علمی استاد کا نام مولانا شمس الدین علی بن اسفرائینی تھا جو دولت شاہ سمرقندی کی تحریر کے مطابق بہشتی مشہور تھے۔ جن کا ذکر عطا ملک جوینی (متوفی ۶۸۱ھ) نے اپنی تاریخ میں کئی مقامات پر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”خواجہ فخر الدین بہشتی را کہ ہر چند مولد و منشای او ”خوارزم“ بود اما اشتہار او بدین نسبت حقیقت آں حال بود کہ شاعر گوید:

اُدعی با ساء بنبراً فی قبا لہا کات اسماء اُفحت بعض اسمائ  
و اُدردی خیر و سلیم دل بود با سم اُلغ بیکچی موسیٰ گردانید<sup>۱</sup>

عطا ملک جوینی کی دیگر متعدد سطوروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معینی الجونی کے استاد محرم امیرارغون<sup>۲</sup> (متوفی ۶۸۳ھ) کے دورِ حکومت میں معزز عہدوں پر فائز اور امیرارغون کے قابلِ اعتبار حواریوں میں سے تھے۔

معینی الجونی کی متصوفانہ عقیدت و ارادت مشہور صوفی خاندان حمویہ کے شیخ یوسف کے ساتھ وابستہ تھی جن کی جانب اپنی تصنیف ”نگارستان“ منسوب کی ہے۔ ان شیخ موصوف کے بارے میں تذکرہ نگار خاموش ہیں، البتہ ان کے والد شیخ صدر الدین ابراہیم (متوفی ۶۲۲ھ) (۶۱۳ھ)

۱۔ نگارستان: ص ۲۴۴۔ ۲۔ اُلغ بمعنی بڑا اور بیکچی کے معنی فتنی یا کاتب۔ یہ دونوں ہی الفاظ ترکی ہیں۔ ۳۔ تاریخ جہاں کشای، جلد دوم: ص ۲۴۶۔ ۴۔ ہلاکو خان کے ایران پر قابض ہونے سے پہلے یہ امیر تقریباً پندرہ سال تک شاہان مغول کی طرف سے خراسان، مازندران، عراق، آذربائیجان، موصل اور حلب وغیرہ کا حاکم مطلق رہا ہے (بحوالہ مقدمہ تاریخ جہاں کشای جلد اول: ص ۳۱ اور کتب ۱، مصحح و مرتب محمد بن عبد الوہاب قرظینی متوفی ۷۳۲ھ خورشیدی)



اور دادا شیخ سعد الملتہ والدین المحدثین (متوفی ۱۱۵۶ھ) کا ذکر متعدد کتب میں پایا جاتا ہے۔ شیخ یوسف کے والد صدر الدین ابراہیم دہ عظیم اور منبرک سہتی تھے جن کے دست مبارک پر ہلاکو خان کا پر پوتا غازان خان (سلطان محمود متوفی ۱۳۰۳ھ) اپنے آبائی طریق و مسلک کو چھوڑ کر حلقہ اسلام میں داخل ہوا۔ لیکن قبولیت اسلام کا یہ شرف امیر نوروز بن امیر ارغون آغا کی تحریریں و ترغیب سے غازان خان کو حاصل ہوا تھا۔ اسلام لانے کا یہ واقعہ ۱۲۹۳ھ میں پیش آیا۔ غازان خان کے ساتھ ہی ہزاروں کی تعداد میں اس کے امراء و لشکریان بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ ان نو مسلموں کی صحیح تعداد میں مختلف رائے ہیں۔ خواند میر اور محمد بن عبد الوہاب قزوینی نے تقریباً ایک لاکھ اور مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے ساٹھ ہزار لکھا ہے۔ اسلام لانے کی پوری تفصیل ”تذکرۃ الشعراء“ حبیب السیر جلد سوم اور روضۃ الصفا جلد پنجم ملا خاند شاہ ہر دی (متوفی ۱۳۰۹ھ) دیکھی جاسکتی ہے۔ مولانا معینی نے جس عہد میں اپنی کتاب تالیف کی تھی وہ نہایت ہی ہولناک اور پر آشوب دور تھا۔ یہ آخری ایلخانی سلطان ابو سعید بہادر خان کا عہد حکومت تھا جس کا ذکر دیا جائے۔

۱۵۔ یہاں اس نسبت کا عقدہ حل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ عام طور پر اسے ”حموی“ لکھا یا پڑھا جاتا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ”حموی“ نسبت ملک شام کے مقام ”حماہ“ کی طرف منسوب کی جاتی ہے لیکن اس حموی نسبت کا ایک خاندان جوین زینشاہ پور کا نہایت ہی منبرک اور معزز گذرا ہے جس کے جدِ اعلیٰ کا نام حمویہ تھا۔ اسی کی جانب منسوب ہے۔ چنانچہ یہی تلفظ مسٹر یو ادراپتھ نے بھی لکھا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ”تاریخ جہانگشاہی“ کے مرتب، مصحح اور مشہور محقق محمد بن عبد الوہاب قزوینی کا مقدمہ: ص ۵۲۔ یہ امیر بایاتھام دوستی سلطان مصر ۱۲۹۶ھ میں حکم غازی خان شہید کر دیا گیا۔ (بحوالہ حبیب السیر جلد سوم: ص ۸۴) حبیب السیر جلد سوم: ص ۸۳ اور مقدمہ تاریخ جہانگشاہی جلد اول: ص ۵۷ شرابعجم جلد دوم: ص ۲۔ یہ مغول خاندان کے ایک سلسلے کا نام ہے جو ہلاکو خاں کے دور سے موسوم ہوا جس کا ذکر کتب (باقی صفحہ پر)

نگارستان میں موجود ہے۔ سلطان ابوسعید کا خانہ خانی نسب مسٹر ایچ۔ ایچ (H. Elhe) اور محمد مستوفی قزوینی (متوفی ۱۳۴۹ھ) کی تحریروں کے مطابق "ابوسعید بن ابی بختیو بن ارغون بن اباقا بن ہلاکو بن تولوی بن چنگیز خان تھا۔ اسی چنگیزی حکمران خاندان میں سے اس کا پرنسپل یعنی ہلاکو خان کا فرزند ثانی نکودار اولاً دائرۃ اسلام میں داخل ہوا جس کا اسلامی نام احمد رکھا گیا تھا۔ لیکن یہ سلطان اپنے اسلام کو مصالحتاً امرار دعوام سے پوشیدہ کیے رہا۔ اپنے بھائی اباقا خان کی جگہ تخت نشین ہوا۔ دو سال تین ماہ حکومت کرنے کے بعد اپنے بھتیجے ارغون بن اباقا خان کے ذریعے ۱۲۸۱ھ میں شہید کر دیا گیا۔ مسٹر تھامس ولیم بیل (Thomas William Beale) اس شہید سلطان کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"ادل ادست از اولاد چنگیز خان کہ دین اسلام را اختیار نمود تا برای مصلحت ظاہری کرد"۔  
نکودار کی شہادت کے دس گیارہ سال بعد خود اس کے بھتیجے کا لڑکا غازان خان بھی اسلام قبول کر لیتا ہے جس کا ذکر کچھ صفحات میں گزر چکا ہے۔ غازان خان کی وفات کے بعد اس کا چھوٹا بھائی ابجایتو بھی قبولیت اسلام کے شرف سے مشرف ہوا اور اسلامی نامی "محمد" کی سعادت پایا یہ اپنے بھائی

(حاشیہ صفحہ ۴۶) تواریخ فارسی میں ملتا ہے۔ خصوصیت سے روضۃ الصفا جلد پنجم میں کئی صفحات میں مذکور ہے۔ لیکن دائرۃ المعارف (ایران) چوتھا ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں اس خاندانی سلسلے کا مؤسس اباقا خان کو بتلایا ہے: ص ۷۷۹۔ یہ آخری اطلاع مشتبہ ہے۔ ص ۱۵۱ اس کے حدود سلطنت افغانستان، عراق، ایران اور سودیت روس میں تقسیم ہو چکے ہیں۔

Persian Catalogue India office library, ۱۵

۷.1: P. 509 اور تاریخ گزیدہ جلد اول: ص ۶۰۱۔ ۱۵ جامع التواریخ،

مصنف قاضی نقیر محمد: ص ۲۳۵ ۱۵ مفتاح التواریخ: ص ۱۰۰۔

غازان خان کی جگہ تخت شاہی پر شکن ہوا اور بارہ سال تک حکومت کر کے ۷۱۶ھ میں انتقال کر گیا۔ اس سلطان کے بارے میں پروفیسر براؤن (Browne) لکھتے ہیں:

۷۳۰ھ میں بعمر چوبیس سال تخت نشین ہوا۔ بچپن میں ماں (اروک خاتون)

کی خواہش کے مطابق گرجا میں بپتسمہ ہوا پھر بعد میں بیوی کے ذریعے اس نے اسلام

قبول کر لیا اور ۷۳۶ھ میں حملہ مرض گٹھیا سے وفات پا گیا۔ اس کے چھ لڑکے

تھے اور تین لڑکیاں تھیں، جن میں پانچ لڑکے اور ایک لڑکی دور طفولیت ہی

میں فوت ہو چکے تھے۔ صرف ایک لڑکا اور دو لڑکیاں بقید حیات رہ گئے تھے۔

جو لڑکا زندہ رہا وہی تاریخ میں آخری ایلمانی حکمران سلطان ابوسعید بہادر خاں کے نام

سے مشہور ہے۔ یہ سلطان ۸ ذیقعدہ ۷۳۶ھ میں آذربائیجان کے ایک شہر ”تورقوی“ میں

پیدا ہوا۔ پدر (سلطان البجایتو) کی جانب سے بعمر نو سال ۷۳۳ھ میں خراسان کا فرماں رفا

مقرر کیا گیا۔ پھر جب سلطان البجایتو کی وفات ۷۳۶ھ کے آخر میں ہو جاتی ہے تب یہ ماہ صفر

۷۳۶ھ میں پوری مملکت کا سلطان منتخب کر لیا جاتا ہے اور باتفاق جمہور سلطان ابوسعید کا

ایک بازو امیر چوپان اور دوسرا بازو امیر سوخ نے بچہ کو سر پر سلطنت پرٹھا دیا۔ انیس سال تک

حکومت کرنے کے بعد ۱۳ ربیع الآخر ۷۳۶ھ میں پیغام اجل آپہنچا اور اپنے دارالسلطنت شہر

سلطانیہ میں مدفون ہوا۔ چونکہ سلطان ابوسعید کا کوئی وارث نہ تھا جس کی وجہ سے وفات کے

۱۔ جامع التواریخ از قاضی فقیر محمد: ص ۲۳۵

۲۔ (Literary history of Persia, v.3: P. 46) ۳۔ ایضاً P. 51

۴۔ سلطان ابوسعید کے عہد حکومت میں ابتداً پوری مملکت کی وزارت اسی امیر کے حوالے کی گئی تھی ۵۔ سلطان

ابوسعید کو جب عمر طفلی میں البجایتو نے خراسان کا حکمران بنایا تھا تو یہی امیر اس کا معاون حکومت اور تائب مقرر

ہوا تھا۔ ۶۔ اس شہر کی بنیاد سلطان ابوسعید کے دادا ارغون خان نے ۷۳۵ھ میں رکھی تھی لیکن تکمیل سلطان

ابوسعید کے والد البجایتو کے زمانے میں ہوئی جس نے اس شہر کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا، پھر سلطان ابوسعید

(باقی صفحہ ۴۹ پر)



بعد ہی ہر علاقہ کا امیر یا گورنر خود مختار بن گیا۔ انجام کار پوری مملکت میں اتار کی اور طوائف الملوکی پھیل گئی۔ اس شروفتنہ کی مدت تقریباً پچاس سال تک جاری رہی۔ اس کے بعد تاریخ شہنشاہیت رک نیاموڑیتی ہے، وہ اس طرح کہ جس سال سلطان ابوسعید کی وفات ہوئی اسی سال امیر تیمور کی ولادت ہوئی ہے جس کے ذریعہ پچاس سال طوائف الملوکی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی لکھتے ہیں:

”۸۳۶ھ تا ۸۵۸ھ قریب پچاھ سال در ایران زمین ملوک اطراف یک دیگر را گردن نمی نہادند و ولایت بولایت و شہر بشہر و دیہ بہرہ بخصومت مشغول بودند تا شمشیر آبدار قطب دائرہ سلطنت و صاحبقران اعظم امیر تیمور گورگان از قراب بغیرت رخ نمود آتش فتنہ منطفی نشد۔“

سلطان ابوسعید سیرت و عادات کے لحاظ سے مجموعہ افراد کھٹا، ایک طرف اگر محاسن و خوبیوں کا مالک کھٹا تو دوسری جانب شقاوتِ قلبی اور بدگمانیوں جیسی خصوصیات کا منظر بھی۔ بڑے بڑے علماء، اہلِ اہل اور شریف زادے اس کے ایک اشارہ حکم سے نہایت بیدار کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ مشہور مغول مؤرخ رشید الدین فضل اللہ جو سلطان ابوسعید کے آثار و اجداد میں سے تین بادشاہوں (ابا قا خان، غازان خان اور البقاء) کا وزیر اعظم رہ کر ان کی بادشاہت کے نظم و نسق میں عظیم کارنامے دکھا چکا کھٹا اور خود ابوسعید (رقیہ حاشیہ ۳۸)

نے بھی اپنے درمیں مرکز حکومت بنایا کھٹا۔ یہ شہر عراق کے نشیبی قطع (جسے عراق عجم کہا جاتا تھا) میں واقع کھٹا جو مغلوں (ایلخانیوں) کے دور میں بغداد کی طرح خوبصورت اور عظیم الشان شہر کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ لیکن اب یہ شہر صفوہ رستی سے ختم ہو چکا ہے۔ البتہ کہیں کہیں اس کے شکستہ آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ (سوانح جغرافیہ خلافت مشرقی، مصنفہ جی۔ لی اسٹریٹج، مترجم اردو مترجم جلیل الرحمن ایم۔ اے۔ صفحات ۵، ۱۰، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۸، ۲۲۹۔ مطبوعہ جامعہ عثمانیہ سرکار عان حیدر آباد دکن ۱۹۳۳ء)

کہ وزارت میں بھی شامل تھا، اسے اور اس کے چودہ سالہ فرزند ابراہیم کو اپنے ایک وزیر مسیحی علی شاہ کی حاسدانہ شکایتوں سے متاخر ہو کر ۱۳۱۸ھ میں شہید کر دیا۔ اسی طرح امیر جوپان کی شادی شدہ حسین رٹ کی بغداد خاتون پر جب ایک بار نظر پڑتی ہے تو اپنا متاعِ دل کھو بیٹھتا ہے اور اس کو اپنانے کے لیے مختلف طریقے استعمال کرتا ہے۔ عشق کی ناشکیبائی اور بیتابی دل سے مجبور ہو کر رٹ کی کے باپ کو مجبور کرتا ہے کہ سابق شوہر امیر شیخ حسن جلائے سے طلاق دلو اگر میرے ساتھ عقد نکاح کر دے۔ بتقاضی شرم و غیرت امیر جوپان زار اور روپوشی کا سہارا لیتا ہے پھر بھی جان کی سلامتی نہیں پاتا۔ آخر کار ۱۳۲۳ھ میں امیر جوپان، اس کے رٹ کے دمشق خواجہ اور دیگر لواحقین و متعلقین کو تہ تیغ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد پھر بغداد خاتون کے شوہر کے پاس قاضی مبارک شاہ کو بھیج کر یہ حکم صادر کرتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر میرے حوالے کر دے، چنانچہ خوفِ جان اور فرمانِ سلطان کے بموجب شیخ حسن اپنی محبوب بیوی کو چھوڑ کر بھیانک انجام سے رہائی پاتا ہے۔ ملا قاند شاہ ہر وی لکھتے ہیں:

”سلطان ابوسعید قاضی مبارک شاہ را طلب فرمودہ گفت پیش امیر شیخ حسن رود، بہر صورت کہ دانی دہر کیف کہ توانی اور از سر این خاتون بگذر۔ آں قاضی بر حسب فرمان یا میر مشاور الیہ ملاقات کردہ گفت از جانب سلطان یا بلاغ چیزی بدیع و حکایتی غریب مامورم کہ گفتن آں موجب شرمندگی و نہفتن آں مستلزم عدم زندگیت، چہ ہر کہ حیات را بکار دارد باید کہ از مقتضی بادشاہ سر نہابد۔ اکنون مصلحت شمار آن است کہ طوعاً و کرہاً مفارقت بغداد خاتون اختیار فرمائید۔ امیر شیخ حسن

۱۔ یہ امیر سلطان ابوسعید کا چھوٹی زاد بھائی اور مختلف ملاقوں کا سلطان خکو کی طرف سے حاکم بھی تھا۔  
 (بحوالہ مفتاح التواریخ مصنفہ تھامس ولیم بیل: ص ۱۳۸، اور سفرنامہ ابن بطوطہ اردو مترجم مسٹر عبدالرحمن صدر حیدر آباد اکیدیمی، مطبوعہ ندوۃ المصنفین: ص ۵۳، ۲۰۷)

حجاب داد کہ حکیم سلطان برجان ماروان است و بر فور خاتون را طلاق دادہ۔  
 قاضی پیش یا دشاہ رفتہ بشارت وصل دلداریے مزاحمت اختیار رسانید<sup>۱</sup>۔  
 پھر کچھ عرصہ بعد سلطان ابوسعید نے دلشاد خاتون نامی ایک لڑکی سے شادی کی جو مذکورہ  
 بالا امیر جوپان کی پوتی یعنی دمشق خواجہ کی دختر تھی لیکن قدرت کی انتقامی کارروائیوں کو کون جان  
 سکتا ہے کہ کب اور کس شکل میں قہر بن کر نازل ہو جائے گی؟ چنانچہ اس کے جبر و ظلم کا انجام یہ ہوا  
 کہ جس طرح سلطان ابوسعید امیر حسن کی بیوی بغداد خاتون کو بزور اپنی زوجیت میں لے آیا تھا  
 اس کی پاداش میں دو غیر تناک و اقوں کا ظہور ہوا۔ ایک یہ کہ بغداد خاتون سوزِ حسد کی بیقراری  
 میں ایک دن زہر دے کر سلطان کی جان لیوا ثابت ہوئی اور خود بھی ایک یونانی خواجہ سرا کے ذریعہ  
 غسل خانہ میں قتل کر دی گئی۔ اور دوسرے واقعہ کا ظہور یوں ہوا کہ سلطان کی وفات کے بعد  
 شیخ امیر حسن<sup>۲</sup> (سابق شوہر بغداد خاتون) نے عراق پر قبضہ کر لینے کے بعد ابوسعید کی زوجہ ثانی  
 دلشاد خاتون کو اپنے جہانہ عقد میں کر لیا<sup>۳</sup>۔

یہ سلطان اشعار کا بھی ذوق رکھتا تھا۔ چنانچہ مخصوص حالات سے متاثر ہو کر کبھی کبھی  
 دود آہ بن کر زبان سے برآمد ہو جایا کرتے تھے۔ رضا قلی خاں ہدایت (متوفی ۱۲۸۸ھ) نے

۱۔ روضۃ الصفا، جلد پنجم: ص ۱۷۵۔ ۲۔ پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب (Literary  
 History of Persia, v.3: P54) میں امیر موصوف کا نام شیخ حسین لکھا ہے، حالانکہ  
 یہ نام امیر مذکور کے والد کا تھا۔ انالہ شبہہ کے لیے دیکھیے: حبیب السیر جلد سوم: ص ۱۲۲، روضۃ الصفا  
 جلد پنجم: ص ۱۷۵، مجمع الفصول، جلد اول: ص ۱۰، لغت نامہ دہخدا (حرف الف: ابوسعید): ص  
 ۵۰۷ اور سفرنامہ ابن بطوطہ۔۔۔۔ (اردو ترجمہ مطبوعہ ندوۃ المصنفین): ص ۲۰۷۔ لیکن سفرنامہ  
 ابن بطوطہ (اردو) کے صفحہ ۵۳ پر شیخ حسین بھی لکھا ہے جو غالباً کتابت کا سہو ہے۔ ۳۔ سفرنامہ ابن  
 بطوطہ (اردو ترجمہ) مترجم مسٹر عبدالرحمن: ص ۲۰۷، ۲۰۸۔



اس کے دو اشعار نقل کیے ہیں:

”میانِ کعبہ و اگرچہ صدیابانست      در سیمہ زحرم در سراچہ جانست  
بیامصر دلم تا دمشق جاں بینی      کہ آرزوی دلم درمہای بغداد است“<sup>۱۵</sup>  
مذکورہ بالا اشعار غالباً سلطان کی زبان سے اُن ایام میں نکلے رہے جب بغداد خاتون  
کے سوزِ عشق سے بیتاب ہو رہا تھا۔ ملا خاوند شاہ ہر دی لکھتے ہیں:  
”تعلق و عشق بہ بغداد خاتون پیدا شد و وزیر و زراعتش محبت افزوختہ تر می گشت  
تا صبر و سکون از سراچہ دلِ اورخت برست و این بیت از تتمہ غزلیست کہ دلائل  
ایام انشا فرمود“<sup>۱۶</sup>

صاحب نگارستان نے سلطان ابوسعید کے وزیر خواجہ غیاث الدین محمد کا بھی ذکر دیا ہے  
کیا ہے جو دورانِ تصنیف وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز تھا۔ یہ وزیر مشہور مؤرخ رشید الدین  
فضل اللہ کا فرزند ارجمند تھا اور اپنے والد کی طرح ہی علم و عقل، دانش و ہنر کا مجموعہ اور ماہر نظمِ ملک  
تھا، عالمِ شباب ہی سے انتہائی پاکبازی کی زندگی بسر کی اور اسی عمر میں زیارتِ خانہ کعبہ کی سعادت  
سے بھی بہرہ ور ہو چکا تھا۔ سلطان الجلائق کے عہد میں خراسان کے عہدہ اسپیکر ٹری پر مامور تھا اور  
ابوسعید کے دور میں وہاں کا گدز مقرر ہوا۔ پھر کچھ عرصہ بعد جب وزیر خواجہ دمشق بن امیر جوچان کشتہ  
سیفِ ستم ہو گیا تو اسے وزیرِ اعظم کے منصب پر ممتاز کر دیا گیا۔ سلطان ابوسعید کی وفات کے بعد  
اس نامور اور نیکدل وزیر نے مرحوم سلطان کی سلطنت کو انتشار سے بچانے کے لیے حتی الوسع جدوجہد  
کی لیکن ملک کے بگڑے ہوئے حالات نے حاسدوں اور اہل ہوس کو موقع فراہم کر دیا کہ وہ اپنی  
خیانتوں کا بھرپور مظاہرہ کر سکیں چنانچہ خود سلطان کے ماموں امیر علی کے ہمدردوں نے ۲۱ رمضان  
۷۳۴ھ میں اس لائق وزیر کو شہید کر دیا۔<sup>۱۷</sup> زشتہ خصائل و زریعہ صوف کے تفصیلی حالات

۱۵ مجمع الفصحاء جلد اول: ص ۱۰۔ ۱۱ مدقۃ الصفا جلد پنجم: ص ۱۴۰۔ ۱۴۱ حبیب السیر

جلد سوم: ص ۱۲۷۔

”حبیب السیر جلد سوم“ کے صفحات ۱۲۲ تا ۱۲۳ دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں وزیر مکتد کے فطری توازن اور دیادگی سے متعلق حمد اللہ مستوفی خز دینی کے چند الفاظ ذکر کیے جاتے ہیں:

”ہر کہ در حق خاندان مبارک ایشان بدیہای در کہ تقریر آن موجب تنفر خاطر استمعان باشد“  
 کردہ بود بخلاف آنکہ بمکافات مشغول شود رقم عقور بر جرائد جرائم ہکنان کشید آں  
 بدیہا بہ تنگی مقابلہ فرمود و در حق ہر یک از ایشان از زمین ایں دولت نسخہ کرد با انواع اکرام  
 ایشان را بمراتب عظیم رسانید و مقلد اشغال خطیر گردانید و اکنوں آنچہ یک تمنائی کردند  
 برای العین مشاہدہ می کنند۔

پروفیسر براؤن کی تحریر کے مطابق وزیر غیاث الدین محمد کل چڑاؤں بھائی تھے اور چپار  
 ہمیشہ انہیں نکھیں۔ تقریباً سبھی برادران مغول عہد حکومت میں کسی نہ کسی علاقے کے گورنر یا دیگر اعلیٰ  
 مناصب پر فائز تھے، حتیٰ کہ وزیر موصوف کے بعض بھانجے بھی کلیدی مناصب سے نوازے گئے تھے۔  
 پچھلے صفحات کے حاشیہ پر پروفیسر براؤن کے ایک اشتباہ کا ذکر گزر چکا ہے۔ یہاں پھر وزیر  
 غیاث الدین کے برادران سے متعلق بھی ایک الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب  
 جلد سوم کے صفحہ ۸ پر خواجہ رشید الدین (پیر وزیر موصوف) کے صاحبزادوں کے ناموں کی ایک  
 فہرست دی ہے اور پھر اسی فہرست کے قبل صفحہ ۸ پر جہاں خواجہ رشید کے ”مجموعہ خطوط“ کی  
 تفصیل لکھی ہے اس میں ایک ایسے لڑکے کا نام ملتے ہے جو یکسر نپندھواں نام ظاہر ہوتا ہے،  
 جس سے خود پروفیسر موصوف کی ذکر کردہ فہرست سے قطعاً کوئی مطابقت نہیں۔ اصحاب  
 نظر و تحقیق پروفیسر صاحب کی کتاب جلد سوم کے صفحات آسٹ سے چھیا سی تک ملاحظہ  
 کر سکتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

۱۔ تاریخ گزیمہ جلد اول: ص ۶۱۱۔

۲۔ Literary history of Persia, v.3: P.80 to 84.

## مجمع البرکات

از جناب محمد عتیق الرحمن صاحب قاسمی، ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، خدائے بخش لا بُریری  
(ڈپٹی) بہار۔

مجمع البرکات فقہی مسائل اور فتاویٰ کی کتاب ہے جو درنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے  
زمانہ حکومت میں لکھی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں اس کا تعارف و تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔  
**مؤلف** | مجمع البرکات کے مؤلف شیخ ابوالبرکات بہ حسام الدین دہلوی ہیں۔ تاریخی کتابوں اور  
تذکروں میں ان کی زندگی کے مفصل حالات نہیں ملتے ہیں۔ نہ بہ الخواطر میں صرف اس قدر لکھا ہے  
کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما اور تعلیم و تربیت ہوئی۔ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے دورِ  
حکومت میں پہلے وہاں کے مفتی مقرر ہوئے پھر قاضی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ مجمع البرکات کے نام  
سے دو ضخیم جلدوں میں ایک کتاب لکھی جو ۹ ذی الحجہ ۱۱۱۱ھ میں مکمل ہوئی۔ خمس التواریخ کے  
حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین و مؤلفین میں شریک تھے۔ اُن کی دینی و فقہی  
شخصیت کا تعارف سب سے پہلے اس طرح کیا گیا ہے :

الشیخ العالم الفقیہ المفتی ابوالبرکات بن حسام الدین بن سلطان بن  
ہاشم بن رکن الدین بن جمال الدین بن المحنفی الدہلوی من کبار الفقہاء  
الحنفیۃ وکانت لہ ید طولی فی الفقہ والاصول لہ



بہر حال اس مختصر تعارف سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ شیخ ابوالبرکات اپنے زمانہ کے مشہور عالم دین تھے۔ خاص طور پر فقہ میں انھیں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب بادشاہ نے فتاویٰ عالمگیری کی تالیف و ترتیب کے وقت ہندوستان کے دیگر اہم علماء کے ساتھ انھیں بھی اس گراں قدر علمی کام کے لیے مدعو کیا۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ان کا سن وفات رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہے۔

نام کتاب | مؤلف نے مجمع البرکات کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ جب یہ کتاب مکمل ہو گئی تو اس کا نام انھوں نے عجائب البرکات رکھا اور پھر محمد یار خاں ناظم دارالخلافہ (دہلی) کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ دیکھ کر نہایت خوش ہوئے۔ اور انھوں نے کہا کہ اس کا نام مجمع البرکات زیادہ موزوں ہو گا۔ چنانچہ مؤلف نے اس کے بعد ہی نام رکھ دیا۔ اور پھر اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کی خدمت میں تحفہ کے طور پر پیش کیا۔

سن تالیف | جیسا کہ اوپر نقل کیا گیا کہ نزہۃ النواطر میں مجمع البرکات کا سن تالیف ۹ ذی الحجہ ۱۱۰۰ھ لکھا ہے لیکن خدا بخش لا بُریری ٹپنہ کے موجودہ دو نسخوں (جن کی تفصیل آگے آرہی ہے) کے آخری صفحات کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۹ ذی الحجہ ۱۱۰۰ھ میں لکھی گئی۔ اس کے علاوہ رضا لا بُریری رام پور کے نسخہ میں جو سن تالیف دیا گیا ہے وہ بھی خدا بخش لا بُریری کے نسخوں کی تائید کرتا ہے۔

معلوم نہیں مؤلف نزہۃ النواطر نے کس نسخہ کو دیکھ کر ۹ ذی الحجہ ۱۱۰۰ھ سن تالیف لکھا ہے لیکن موجودہ صورت میں ہمارے لیے تو خدا بخش لا بُریری اور رضا لا بُریری کے قلمی نسخوں کا بیان ہی قابل ترجیح ہے۔

نسخے | انتہائی تلاش و تحقیق کے باوجود اب تک مجھے مجمع البرکات کے چار قلمی نسخوں کا علم ہو سکا ہے۔ ایک نسخہ رضا لا بُریری رام پور میں ہے اور تین نسخے خدا بخش لا بُریری میں ہر ایک کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

۱۔ رضا لا بُریری کیٹلاگ ج ۳ ص ۳۳۳۔

نسخہ تمام پور | یہ نسخہ ۴۰۷ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں ۲۷ سطریں ہیں۔ اس کی کتابت ۱۱۱۷ھ میں ہوئی ہے اور اس کے کاتب کا نام عمرو بن میر الجلال علی بن میر یادگار حسین بخاری ہے۔ شروع کے ۵ اوراق میں فہرست البواب ہے۔ یہ خط نسخ میں ہے۔ اس کا نمبر ۲۵۸ ہے۔

نسخہ خدا بخش لاہوری | اس کا ہینڈ لسٹ نمبر ۳۵-۱ ہے۔ یہ ۳۶۷ اوراق پر ارد ہر صفحہ ۲۳ سطور پر مشتمل ہے۔ خط نسخ میں ہے اور اس کی کتابت ۱۱۱۸ھ کی ہے۔ کاتب کا نام عبد القادر بن محمد حسین ہے۔ یہ مکمل نسخہ ہے جو کتاب الطہارۃ سے شروع ہو کر کتاب الوقف پر اور پھر کتاب البیوع سے شروع ہو کر کتاب الفرائض پر ختم ہوتا ہے۔ جا بجا کرم خوردہ ہے۔ شروع میں البواب فہرست ہے۔ اصل کتاب کے بعد خاتمہ کی عبارت ملتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا کاتب عبد القادر بن حسین ہے جس نے ۲۳ جمادی الاخریٰ ۱۱۱۸ھ میں کتابت کی۔ یہ کام اس نے حضرت خواجہ قطب الدین نور اللہ مرقدہ کے مکان میں انجام دیا۔ ورق ۳۶۷ کے حاشیہ پر ایک تحریر ملتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ مؤلف نے اصل کتاب بنالہ ۱۱۱۸ھ میں مکمل کی۔ اس کی تکمیل میں سات سال کا زمانہ صرف ہوا یہ تحریر خط نستعلیق میں ہے۔

(۲) یہ کتاب ۳۸۱ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں۔ کتابت تقریباً بارہوی

صدی کی ہے خط نستعلیق ہے۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۳۴۴۹ ہے۔ کاتب کا نام درج نہیں۔ یہ نسخہ کتاب البیوع سے شروع ہو کر کتاب الفرائض پر ختم ہوتا ہے۔ جو در حقیقت مجمع البرکات کا دوسرا حصہ ہے۔ لیکن کاتب نے غلطی سے مقدمہ کی عبارت کتاب البیوع کے قبل متصلاً اس طرح لکھ دی ہے کہ اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے شاید صرف یہی حصہ لکھا ہو، حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے کیونکہ یہ کتاب دراصل دو حصوں میں ہے؛ پہلا حصہ کتاب الطہارۃ سے شروع ہو کر کتاب الوقف پر اور دوسرا حصہ کتاب البیوع سے شروع ہو کر کتاب الفرائض پر ختم ہوتا ہے۔

(۳) یہ نسخہ ۳۲۷ اوراق پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۳۱ سطروں میں کتابت یا ربویں صدی کی ہے۔ خوبصورت خط نسخ میں ہے۔ بینڈ لسٹ نمبر ۱۰۴۳ ہے۔

یہ نسخہ مذکورہ دونوں نسخوں کے مقابلہ میں صاف اور خوبصورت ہے۔ شروع میں فہرست ابواب ہے اس کے آخر میں خاتمہ کی ایک عبارت ہے جو طویل ہے لیکن اہم ہونے کی وجہ سے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

تم یعون اللہ تعالیٰ هذا المختصر المسمی بفتاویٰ مجمع البرکات تألیف  
العبد الضعیف المحتاج الی اللہ الغنی ابوالبرکات بن حسام الدین  
من ولد قدوة العلماء والفضلہ شیخ المفتیین مولانا جمال خان  
قدس اللہ سرہ العزیز فی الیوم التاسع من شہر ذی الحجۃ فی سنة  
الف و صاۃ و عشر فی البلدۃ المحمدیۃ دار المخلقة شامہان  
آباد حر سہا اللہ تعالیٰ من کل البلیات وار جو من کرمہ عن اسمہ  
ان یتفع بہذا المختصر الولدان الا عن ان محمد اسمعیل و محمد دوت  
و جمیع طلبہ علم الفقہ حفظہم اللہ جل شانہ عن جمیع الشرور  
والا فات و وفقہم بکثرة الخیرات و الحسنات بمرمتہ البنی سید  
المخلوقات امین۔ تحریر فی التاریخ ہفتم شہر جمادی الثانی موافق  
ارشاد قاضی القضاۃ وحید الدین خان طول عمرہ و اقبالہ  
ید ستخطا حق العباد سید ہدایت اللہ لواطن بلدۃ شامہان آباد  
اس عبارت سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوتے ہیں :-

(۱) مؤلف نے اصل نسخہ ۹ ذی الحجہ ۱۱۸۸ھ میں لکھا۔

(۲) اس کے کاتب سید ہدایت اللہ ہیں جو دہلی کے باشندہ تھے۔

(۳) یہ نسخہ قاضی القضاۃ وحید الدین خان کی ہدایت پر ان کی زندگی میں لکھا گیا۔



مؤلف کے دور لڑکوں کا نام محمد اسماعیل اور محمد دولت تھا۔

تعارف کتاب | مجمع البرکات فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ کتاب الطہارۃ سے شروع ہو کر کتاب الوقف پر اور دوسرا حصہ کتاب البیوع سے شروع ہو کر کتاب الفرائض پر ختم ہوتا ہے۔ مؤلف نے ہر کتاب کو مختلف ابواب میں اور ہر کسی باب کو مختلف فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ مندرجہ ذیل کتاب پر مشتمل ہے:-

کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج، کتاب النکاح، کتاب الرضا، کتاب الطلاق، کتاب العتاق، کتاب الایمان، کتاب الحدود، کتاب السرقة، کتاب المیر، کتاب اللقیط، کتاب اللقیط، کتاب الابن، کتاب المفقود، کتاب الشریک، کتاب الوقف، کتاب البیع، کتاب الصرف، کتاب الکفالہ، کتاب السحوالہ، کتاب القضا، کتاب الشہادۃ، کتاب الوکالۃ، کتاب الدعوی، کتاب الاقرار، کتاب الصلح، کتاب المضاربتہ، کتاب الودیعتہ، کتاب العاریج، کتاب الہبۃ، کتاب الاجارۃ، کتاب المکاتب، کتاب الولاء، کتاب الاکراہ، کتاب الحجر، کتاب الماذون، کتاب الغصب، کتاب الشفعہ، کتاب القسمۃ، کتاب المزارعتہ، کتاب المساقات، کتاب الذبائح، کتاب الاضحیہ، کتاب الکراہیۃ، کتاب احیاء الموات، کتاب الاشربہ، کتاب الصيد، کتاب الرهن، کتاب البعایات، کتاب السایات، کتاب المعاقل، کتاب الوصایا، کتاب الخنثی، کتاب الفرائض۔

ماخذ کتاب | جیسا کہ مؤلف نے مقدمہ کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب کی تالیف کے وقت مندرجہ ذیل فقہی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:

ہدایہ، کنایہ، نہایہ، فتح القدیر، فتاویٰ عالمگیری، کافی، خلاصہ محیط برہانی، محیط خسی، شرح مختصر الوقایہ (لابی المکارم)، شرح وقایہ (للبرجندی)، معدن، تبیان، فتاویٰ سراجیم، فتاویٰ ظہیر، خزائنہ الروایات، فتاویٰ قاضی خاں، فصول حمادیہ، فصول عمادیہ، سراج الوماج، مینۃ المصلیٰ، بحر الرائق، جوہرہ ثمیرہ، کنز العباد، فتاویٰ ذرا حانیہ، غرائب، خزائنۃ المفتیین۔

یہ چونکہ ایک حنفی عالم اور فقیہ کی لکھی ہوئی کتاب ہے اس لیے اس میں اگرچہ مختلف ائمہ (امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ) کے فقہی مسائل اور ان کے اقوال پیش کیے گئے ہیں تاہم زیادہ توجہ مسلک احناف پر دی گئی ہے۔ اور اس کے صحیح، راجح اور منقحہ اقوال نہایت مدلل، ٹھوس اور واضح انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

یہاں اس کتاب کی کچھ اہم خصوصیات تحریر کی جا رہی ہیں جن کے مطالعے اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا اور اس کی علمی و فقہی حیثیت متعین کرنے میں آسانی ہوگی۔  
خصوصیات | ۱۔ اس میں ہر کتاب کے تحت جتنے بنیادی مسائل بیان کیے گئے ہیں، ہر مسئلہ کی سب سے پہلی لغوی اور پھر شرعی تعریف تحقیق کی گئی ہے؛ اس کے بعد اس کے فروعی اور متعلقہ مسائل نہایت مختصر مگر مدلل اور واضح انداز میں تحریر کیے گئے ہیں۔

اس انداز تحریر سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر مسئلہ کی لفظی و معنوی حقیقت اور اس کی شرعی تعریف بیک وقت یہ آسانی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے کتاب الطہارۃ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

الطہارۃ لغة النظافة وشرعاً  
 التطهير بغسل اعضاء مخصوصة  
 كذا في المعادن (ص ۱)  
 طہارۃ لغوی طور پر صفائی اور شرعی طور پر  
 مخصوص اعضاء کو دھو کر پاک کرنے کے معنی میں  
 آتا ہے جیسا کہ معدن میں ہے۔

كتاب الصلوة کے تحت لکھتے ہیں:  
 الصلوة لغة الدعاء وشریعة  
 عبارة عن ارکان معلومة و افعال  
 مخصوصة. كذا في المعادن - الفرض  
 نوعان فرض عین و فرض کفایۃ و الصلوة  
 فرض عین ثبوت فرضیتها بالکتاب  
 صلوة لغوی لحاظ سے دعاء اور شرعی لحاظ سے  
 مخصوص ارکان و افعال کا نام ہے۔ جیسا کہ معلوم  
 میں ہے فرض کی دو قسمیں ہیں۔ فرض عین اور فرض  
 کفایہ صلوة (نماز) فرض عین ہے جس کی فرضیت  
 قرآن، سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔





شرائط نکاح کے ذیل میں لکھتے ہیں :

اما شرطه فمنها العقل والبلوغ  
والحرية والعاقل الا ان الاول شرط  
الانعقاد فلا ينعقد نكاح المجنون  
والنصبى اذ لا يعقل والاخرين شرط  
النفاذ فان نكاح النصبى العاقل يتوقف  
نفاذه على اجازة وليه كذا فى فتاوى  
عالمكيرنا قلا من البدائع ولا يصح النكاح  
صالم يسمع كل واحد من العاقل كلام  
صاحبه كذا فى فتاوى قاضى خاں -

شرائط نکاح میں سے عقل، بلوغ اور آزادی ہے۔  
مگر پہلی چیز شرط انعقاد ہے اس لیے مجنون اور  
نابالغ بچہ کا نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ دوسری دو  
چیزیں شرط نفاذ ہیں اس لیے عاقل بچہ کا نکاح  
اس کے ولی کی اجازت پر موقوف ہوگا جیسا کہ  
فتاویٰ عالمگیری میں بدائع سے نقل کیا گیا ہے۔  
نکاح اس وقت تک صحیح نہیں ہوگا جب تک کہ  
عقد کرنے والے ایک دوسرے کا کلام نہ سُن لیں  
جیسا کہ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے۔

(ص ۱۹۶)

(۳) اختلافی مسائل میں مختلف علماء کے اقوال پیش کیے گئے ہیں اور پھر ان میں جو  
قول زیادہ صحیح، معتبر اور مفتی بہ ہے اس کی تصریح کر دی گئی ہے لیکن یہ قول بلا سند نہیں بلکہ  
ہر قول کے ساتھ کسی نہ کسی مستند فقہی کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے جس سے اس قول کی اہمیت  
اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس کے لیے مندرجہ ذیل عبارتیں مطالعہ کی جاسکتی ہیں :-

لا خلاف ان صلوة الخوف كانت  
مشرعية في زمن النبي صلى الله عليه  
وسلم اما بعد فعلى قول ابى حنيفة  
ومحمد لقيت مشروعية وهو الصحيح  
كذا فى فتاوى عالمكيرنا قلا من الزاد -  
اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ صلوة خوف آخرت  
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مشروع تھی ہاں  
آپ کے بعد مشروع ہے یا نہیں اس میں اختلاف  
ہے امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے قول کے مطابق  
اس کی مشروعیت ہوتی ہے جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری

(ص ۱۱۲)

میں زادے نقل کر کے بیان کیا گیا ہے۔

صلوٰۃ عیدین کے سلسلے میں لکھتے ہیں :-

اعلم بان صلوٰۃ العیدین واجبۃ  
فی احدی الروایتین وهو المختار  
کن فی الخلاصہ والاصح کن فی  
المحیط السرخسی ولشترط للعید ما یفترط  
للمجمعة الا الخطبة کن فی الخلاصہ  
والخطبة فی صلوٰۃ العید یخالف  
الخطبة فی المجمعة من وجهین احدهما  
ان المجمعة لا یجوزیدون الخطبة  
وصلوٰۃ العید یجوزیدونہا والثانی  
ان فی المجمعة یقدم الخطبة علی  
الصلوٰۃ وفی العید توخر عن الصلوٰۃ  
کن فی فتاویٰ قاضیخان وان خطب  
قبل الصلوٰۃ جاز ویکرہ کن فی محیط  
السرخسی۔ (ص ۱۱۶)

جان لو کہ صلوٰۃ عیدین ایک روایت کے  
مطابق واجب ہے اور یہی پسندیدہ ہے جیسا  
کہ خلاصہ میں ہے اور زیادہ صحیح ہے جیسا کہ  
محیط (سرخسی) میں ہے عید میں بحر خطبہ کے  
وہی تمام چیزیں شرط ہیں جو جمعہ میں ہیں جیسا کہ  
خلاصہ میں ہے۔ نماز عید کا خطبہ جمعہ کے خطبہ  
سے دو اعتبار سے مختلف ہے :-

ایک یہ کہ خطبہ کے بغیر نماز جمعہ نہیں ہو سکتی جبکہ  
نماز عید اس کے بغیر ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ  
جمعہ میں نماز سے قبل خطبہ ہے جبکہ نماز عید میں  
اس کے بعد جیسا کہ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے۔  
اور اگر نماز سے پہلے خطبہ دے دیا تو نماز ہرجاگی  
مگر مکروہ ہوگی جیسا کہ محیط (سرخسی) میں  
ہے۔

روزہ کی حالت میں قے ہو جانے کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں :-

وان عاد ینفسہ فسد صومہ فی  
قول ابی یوسف ولا یفسد فی قول محمد  
وهو الصحیح وان لم یکن ملاء الفم فان  
عاد لم یفسد صومہ فی قولہم وان  
اگر قے خود بخود اندر لوٹ گئی تو امام ابو یوسف  
کے قول کے مطابق روزہ فاسد ہو گیا اور امام  
محمد کے قول کے مطابق روزہ فاسد نہیں ہوا۔  
یہی صحیح ہے۔ اور اگر منہ کھلے نہ ہو تو اگر

اعادۃ فسد صومہ فی قول محمدؐ  
ولا یفسد صومہ فی قول ابی یوسفؒ والصحیح  
فی ہذا قول ابی یوسفؒ۔

(ص ۱۶۳)

خود بخود اندر لوٹ گئی تو روزہ فاسد نہیں ہوا۔  
اگر روزہ دار نے جان بوجھ کر لوٹایا تو امام محمدؐ کے  
قول کے مطابق روزہ فاسد ہو گیا، امام ابو یوسفؒ  
کے قول کی بنا پر روزہ فاسد نہیں ہوا۔ صحیح اس میں  
امام ابو یوسفؒ کا قول ہے۔

(۴) فقہی کتابوں میں فتاویٰ عالمگیری سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے اور  
کثرت سے اس کے حوالے پیش کیے گئے ہیں اور پھر فتاویٰ عالمگیری میں جس کتاب کی عبارت  
نقل کی گئی ہے اس کا حوالہ بھی ناقلاً عن فلان کر کے دے دیا گیا ہے۔  
اس سلسلے میں مذکورہ عبارتیں نمونہ کافی ہیں تاہم دو ایک مثال اور دیکھیے:-  
صلوۃ المریض کے بارے میں لکھتے ہیں:

اذا عجز المریض عن القيام صلی قاعداً  
وامام الاقادیل فی تفسیر العجز ان  
یلتحقہ بالقیام ضرر وعلیہ الفتویٰ  
کنانی فتاویٰ عالمگیر ناقلاً عن معراج  
المدنیہ - (ص ۹۲)

مریض جب قیام کرنے سے مجبور ہو تو کھڑا ہو کر  
نماز پڑھے۔ عجز کی زیادہ صحیح تشریف یہ ہے کہ  
کھڑا ہونے پر اس کو کوئی نقصان پہنچے۔ اسی پر  
فتویٰ ہے جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں معراج المدنیہ  
سے نقل کر کے بیان کیا گیا ہے۔

ادب القاضی کے تحت فرماتے ہیں:  
الادب هو التخلیق باخلاق الجمیلة  
والخصال الحمیدة فی معاشرۃ الناس  
ومعاملتهم کنانی فتاویٰ عالمگیر۔  
(ص ۳۶۲)

ادب کہتے ہیں لوگوں کی معاشرت اور معاملت  
میں اچھے اخلاق اور بہترین عادات سے  
پیش آنا۔ جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

(۵) اس میں اختصار کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان نہایت آسان، شگفتہ اور عام فہم



اختیار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے قاری کو عبارت فہمی میں کہیں دشواری نظر نہیں آتی۔  
دیکھیے کتاب البیع کے تحت لکھتے ہیں:-

البيع وهو من الاضداد وتقع في الغالب  
على استخراج المبيع عن الملك قصداً والشراء  
ايضاً من الاضداد وتقع في الغالب يقع  
على استخراج الشئ من الملك قصداً  
وفي الشراء هو مبادلة مال بمال على  
تراض كن اني برجدي واما ركنه  
فانواع احدى اركانها ان يجاب والقبول  
والثاني التعاطي وهو الاخذ والاعطاء  
وكن اني المحيط بالشئ والشرط في بيع  
التعاطي الا عطاء من الجانبين عند شئ  
الامثلة الحلواني كن اني الكفاية وعليه  
اكثر المشائخ وفي الزاوية وهو المختار  
كن اني البع الرائ والصحيح ان قبض  
احد هما كافٍ لنص محمد علي بيع التعاطي  
يثبت لقبض احد البديلين وهذا  
ينتظم الثمن والمبيع -

بيع اضرار میں سے ہے۔ عام طور پر بیع کا جائز  
بوجھ کر قبضہ سے نکال دینے کے معنی میں آتا  
ہے۔ شرار بھی اضرار میں سے ہے اور عام طور پر  
ثمن کا قبضہ سے قصداً نکال دینے کے معنی میں  
مستعمل ہے۔ خریعت میں جانین کی رضا مندی کی  
بنا پر ایک مال کا تبادلہ دوسرے مال کے ساتھ  
ہونے کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ برجذی میں ہے۔  
اس کے رکن دو ہیں: ایک ايجاب قبول دوسرے  
الین دین جیسا کہ محیط (سرخسی) میں ہے شمس الائمہ  
حلوانی کے نزدیک الین دین کی بیع میں شرط یہ  
ہے کہ جانین سے دینا ہو جیسا کہ کفایہ میں ہے  
اس پر اکثر مشائخ ہیں۔ زازیہ میں ہے یہی پندیرہ  
ہے جیسا کہ بحر الرئی میں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ جانینی  
میں سے کسی ایک نے بھی قبضہ کر لیا تو بھی کافی ہو گیا  
جیسا کہ امام محمد کا بیع تعاظی کے بار میں نص ہے  
کہ بدلیں میں سے کسی ایک کا قبضہ میں آ جانے سے  
وہ درست ہو جاتا ہے۔ اور یہ ثمن اور مبيع  
دونوں پر محیط ہے۔

(ص - ۳۳۸)

دسمبر ۱۹۸۱ء

مَصْنُوفِین دِلِی کا علمی و دینی ماہنامہ

سُرکاش

قیمت سالانہ : بیس روپے

مُرَاتَبِع  
سعد احمد کسرا بادی

# مُرہان

جلد ۸۹ صفر ۱۴۰۲ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۱ء شمارہ نمبر ۶

## نظرات مقالات

- ۱۔ خلافتِ ارض اور علماء کی ذمہ داریاں :-  
عمر جدید کا ایک اہم تجدیدی کام اور اس کی نوعیت
- ۲۔ وحدتِ ادیان کا نظریہ اور اسلام :-  
از مولوی شہاب الدین صاحب ندوی، ناظم  
فرقانہ اکیڈمی، بنگلور۔ ۵۷
- ۳۔ جناب ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب :-  
ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی  
پردیسِ دنیاوی، سنی تھیا لوجی، مسلم  
یونیورسٹی، علی گڑھ۔
- ۴۔ پاکستان، جنوبی افریقہ اور پھر پاکستان :-  
دشوا بھارتی یونیورسٹی کے، فارسی، عربی،  
اور اردو مخطوطات۔
- ۵۔ سعید احمد اکبر آبادی :-  
عبد الوہاب صاحب بدر بستی ہنٹرل  
لائبریری، دشوا بھارتی یونیورسٹی  
شانتی نیکیتن (منوبی بنگال)
- ۶۔ (س)
- ۷۔ تبصرے۔



## نظرات

کسی ایک زبان کے عالمی ہونے کے لیے شرائط کیا ہیں؟ یہی ناکہ اس زبان میں لکھنے اور بولنے والے انسانی نسل درنگ اور قومیت و مذہب کے اختلاف کے باوجود کروڑوں کی تعداد میں ہوں اس زبان کے باقاعدہ قواعد صرف و نحو ہوں اس کا لٹریچر مختلف علوم و فنون پر مشتمل ہو اور وہ صورت اور معنی کے اعتبار سے اس درجہ ترقی یافتہ ہو کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ یونیورسٹیوں میں اس کی اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کا انتظام ہو، اس کے علمی اور ادبی شاہکاروں کے تراجم دنیا کی اعلیٰ زبانوں میں شائع اور ذائع ہوں، پھر وہ زبان صرف اپنے ملک میں محدود نہ ہو بلکہ بیرونی ممالک میں بھی اس کا چرچا ہو اور ان ممالک کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی اس کی تعلیم و تعلم کے خاطر خواہ انتظامات ہوں، لائبریریوں میں اس زبان کے مطبوعات و مخطوطات سے پُر ہوں اور اس زبان کے تصنیفی اور صحافتی ادارے ملک میں جگہ جگہ بکثرت ہوں۔

اگر ایک زبان کے عالمی ہونے کا معیار یہی ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ اردو عالمی زبان دنیا کے کسی ملک میں چلے جائیے کم یا زیادہ اس زبان کے لکھنے اور بولنے والے مل جائیں گے، ارض و سما کی درمیانی فضا میں یاد دہیا کے دوش پر ہر وقت اڑتی پھرتی ہے، امریکہ، یورپ اور روس کے شاہد ان کلفام اس کے شعروں اور گیتوں کی دھنوں پر سردھنتے اور پاکوبی کرتے ہیں، ارباب علم و تحقیق اس زبان کے چشمہ فیض سے سیراب ہونے کی آرزو میں فرہاد کی ہمسری کرتے ہیں۔ غرض کہ آپ کوئی ہی معیار مقرر کیجئے اردو بہر حال ایک عالمی زبان قرار پائے گی۔ بڑی خوشی

کی بات ہے کہ اتر پردیش کی حکومت کو اس کا احساس ہوا اور اس نے ایک عالمی اردو کانفرنس منعقد کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کی تکمیل کا کام اردو اکاڈمی اتر پردیش کے سپرد کر دیا، پاکستان سے بعض دوستوں نے لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کو دعوت نامے ملے ہیں اور وہ اس میں شرکت کا ارادہ رکھتے ہیں، اس سے پہلے ہندی، ٹامل اور ملیالم کی عالمی کانفرنسیں ہو چکی ہیں۔ اردو کا میاب رہی ہیں، امید قوی ہے کہ اردو کی یہ کانفرنس بھی ایسی ہی بلکہ اس سے زیادہ کامیاب رہے گی، برہان اتر پردیش گورنمنٹ کو اس اقدام پر مبارکباد پیش کرتا ہے اس سلسلہ میں یہ معلوم کر کے افسوس بھی ہوا کہ لکھنؤ کے بعض لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس میں پیش پیش وہ حضرات ہیں جنہوں نے ایک زمانہ میں اردو کی خدمت کے عنوان سے ملک میں بڑی شہرت اور ناموری پائی تھی، روزنامہ عزائم لکھنؤ کے ایک ادارہ کے مطابق اس مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ اس کانفرنس سے اندیشہ ہے کہ وزیراعظم اندرا گاندھی کو دشواریاں پیش آئیں گی۔ اگر واقعی مخالفت کی وجہ یہی ہے تو۔

خامہ انگشت بننا کر اے کیا لکھیے      ناطقہ سرنگریاں کہ اے کیا کہیے۔

یہ ایک نہایت عجیب و غریب وجہ ہے کیونکہ اردو اکاڈمی ایک سرکاری ادارہ ہے وہ ہرگز کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکتا جو حکومت اتر پردیش کی پالیسی یا اس کے غشا کے خلاف ہو، بلکہ جیسا کہ عزائم نے لکھا ہے، اس معاملہ میں پہلے گورنمنٹ نے ہی کی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اتر پردیش گورنمنٹ کوئی کام ایسا نہیں کر سکتی جس کو مسز اندرا گاندھی کی پسندیدگی حاصل نہ ہو، علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ لاکھوں روپے سالانہ کے خرچ سے اردو ترقی بورڈ کا قیام نئی دہلی میں اور پھر ریاست حریہ ست اردو اکاڈمیوں کا قیام، بہار میں اردو ایک سرکاری ثانوی زبان کی حیثیت سے، غالب صدی اور اقبال صدی کی نہایت عظیم الشان تقریبات سرکاری سطح پر، ادبیوں بھی اردو شعر و ادب کی چہل پہل جو آج ملک میں عام طور پر نظر آتی ہے، یہ سب چیزیں کیا اندرا گورنمنٹ کا کارنامہ نہیں ہیں؟ پچھو دسمبر ۱۹۸۱ء میں نئی دہلی میں چار دھویں صدی ہجری کی جو عظیم الشان تقریب گورنمنٹ

کے زیر انتظام داہتمام منائی گئی اور جس کی افتتاحی تقریر اسلامی تہذیب و تمدن کا ہندوستان پر اثر کے موضوع پر وزیراعظم نے اس درجہ پر مغز اور بصیرت آفریں تقریر کی تھی کہ اس کی گونج اسلامی اور عرب ملکوں میں ہینوں تک سنی جاتی رہی کیا اس تقریر میں انھوں نے اردو کو خالص ہندوستان کی پیداوار اور اس ملک کی عظیم الشان زبان نہیں کہا تھا؟ اس بنا پر اردو کی عالمی کالفرنس کی نسبت یہ اندیشہ کرتا کہ اس سے اندراجی کو دشواریاں پیش آئیں گی قطعاً بے بنیاد اور سراسر لغو اور بیہودہ ہے،

نہایت افسوس اور بڑے شرم کی بات ہے کہ ہندوستان میں مسلمان نام کے چند لوگوں کا ایک گروہ ہے جس کی یہ رائے ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں سے تعلق رکھنے والی کوئی تقریب بھی الاقوامی اور عالمی سطح پر نہیں منائی جانی چاہیے کیونکہ اس تقریب کی شان و شوکت کو دیکھ کر ہندو فرقہ پرستوں کی آنکھوں میں خون اترتا ہے اس کے نتیجے میں بسا اوقات فسادات پھوٹ پڑتے ہیں اور گورنمنٹ کو دشواریاں پیش آتی ہیں، لیکن ہم کہتے ہیں کہ اصل تو یہ مفروضہ ہی غلط ہے کیونکہ گذشتہ چند برسوں میں بعض اسلامی اداروں نے جشن کی تقریبات عالمی سطح پر جس شان و شوکت سے منائی ہیں ان کی ناگواری، تنگ نظر اور اسلام دشمن عناصر سے قطع نظر، تو کیا ہوتی اکثریت نے اس میں تعاون اور اشتراک کیا ہے اور بالفرض اگر یہ مفروضہ درست ہے بھی تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ عظیم الشان تجارتی بلڈنگس، کارخانے اور فیکٹریاں اور نیگلی اور کوٹھیاں، بہترین کاریں، اعلیٰ قسم کے صنعتی و حرفتی ادارے، اعلیٰ تعلیمی مراکز، بڑے بڑے فارم، زراعت و فلاحیت کے بہترین اور اعلیٰ نمونے، ان میں سے کوئی چیز مسلمانوں کے پاس نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ مسلمانوں کی مرفہ الحالی اور ان کی اقتصادی و معاشی پیش رفت جواب انھیں حاصل ہو رہی ہے فرقہ پرستوں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی ہے: فَآيْنَ تَدَّ هَبُون۔



# خلافتِ ارض اور علماء کی ذمہ داریاں

## عصرِ جدید کا ایک اہم تجدیدی کام اور اس کی نوعیت

از مولوی شہاب الدین صاحب ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور ۵۷

### کتاب حکمت کے جلوے :

قرآن حکیم کے مذکورہ بالا تمام بیانات اگرچہ بالکل واضح ہیں اور لفظی و معنوی اعتبار سے ان میں کوئی تعقید یا پیچیدگی نہیں ہے مگر ان کا ایک خاص طرزِ اسلوب اور ایک خاص موقع و محل ہے جس کو ملحوظ نہ رکھنے کے باعث اکثر و بیشتر ان کے مفہوم کو سمجھنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شرعی آیات و احکام کے برعکس تکوینی (نیچرل) امور کا بیان زیادہ تر اشاروں و کنایوں کی زبان میں ہے۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ شرعی امور میں تو ہر دور میں وضاحت و تفصیل کی یکساں ضرورت رہتی ہے، تاکہ لوگوں کو اپنے معاملات زندگی کے سمجھنے میں کسی قسم کا اشتباہ نہ رہے۔ اس کے برعکس تکوینی یا نیچرل امور و معاملات کا حال مختلف ہے۔ کیونکہ ان امور کا تعلق دین کے بنیادی احکام و مسائل سے نہ ہونے کی بنا پر ہر زمانے میں ان کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی، بلکہ ان کی حاجت مخصوص ادوار اور مخصوص حالات میں پیش آتی ہے۔ اسی لیے ایسے معاملات ذرا مبہم طور پر بیان کیے جاتے ہیں تاکہ وقت آنے پر ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

اس طرح قیامت ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اس کتاب حکمت کے نئے نئے پہلو جاگرتے رہیں گے۔

دوسری بات یہ کہ ان تکوینی (Natural) امور و مسائل کا ہر دور کے علوم سے نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ امدیہ معمولی اندلی غور و فکر کے ذریعے واضح نہیں ہو سکتے بلکہ علوم و فنون کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنی پڑتی ہے، تب کہیں جا کر ٹھوس اور پائیدار نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر اہل اسلام میں ان امور و مسائل پر غور کرنے والی ایک مخصوص جماعت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ غرض اوپر کے صفحات میں جن حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے وہ خدائی منصوبے کے مطابق اشاروں و کتابوں کی زبان میں مذکور ہیں تاکہ چودہ سو سال قبل کے سائنسی حقائق سے نا بلد معاشرے کو قرآنی آیات کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری بھی نہ رہے اور وقت آنے پر یہ اشارات وسیع اور معنی خیز بھی بن جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں قرآن حکیم نے نظام کائنات سے متعلق غلط خیالات و نظریات کی پوری طرح کھل کر تردید نہیں کی بلکہ ایک حکیمانہ اور دانشمندانہ اسلوب اختیار کیا تاکہ لوگوں کو کسی قسم کی دشواری نہ پیش آئے یا وہ کسی اور قسم کی غلط فہمی میں نہ پڑ جائیں، نیز اس میں یہ حکمت بھی ملحوظ تھی کہ قرآن حکیم کا جو اصل موضوع تعمیر اخلاق اور درس انسانیت ہے اس سے ہٹ کر اس کے متبعین کو اس کے دور کے غیر ترقی یافتہ معاشرے کے لیے ..... قرآن کے ان ”نئے دعوؤں“ کی تفہیم کرانا اور ان کا ثبوت فراہم کرنا مشکل ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ منکرین اسلام فوراً یہ اعتراض کرتے اور کہتے کہ قرآن تو ایسے حقائق کا ادعا کر رہا ہے جو مردہ نظریات کے خلاف ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ اس کے ماتھے والے پہلے ان دعوؤں کا ثبوت پیش کریں اور یہی اصول ما بعد کے تمام ادوار میں بھی صادق آتا ہے۔

اس موقع پر یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ قیامت اور حشر و نشر وغیرہ کے متعلق جو دعوے اسلام کے ہیں وہ دوسری قسم کے ہیں جو تمام انبیاء کرام اور تمام مذاہب کی منفقہ تعلیم کے مطابق ہے یعنی ایک دن یہ سارا سلسلہ وجود درہم برہم ہو جائے گا اور تمام انسانوں اور دیگر ذی عقل مخلوق (رجات) کا محاسبہ

کر کے ان کے اچھے بُرے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

یہ بنیادی عقائد اور تصورات دین اگرچہ لوگوں کے مروجہ علوم و فنون اور ان کے افکار و نظریات سے خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں مگر انہی کا اثبات اصل مقصود ہے اور اسی غرض و غایت کے لیے انہیں کرام کی تشریف آوری ہوئی تھی۔ اور جدید سے جدید تر علوم و فنون کی ترقیوں کی روشنی میں یہ اور زیادہ نکھر جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں قرآن حکیم کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ دین کے ان بنیادی عقائد و تصورات کو وہ علمی پیشین گوئیوں کے روپ میں پیش کرتا ہے گویا کہ وہ صحیفہٴ نطرت کے ثابت شدہ اور کائناتی حقائق ہیں جو علوم و فنون کی ترقی کے باعث مستقبل میں قطعی و یقینی حیثیت سے علمی حقائق کے روپ میں منکشف ہو جائیں گی۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے نظام کائنات میں غور و فکر کی تاکید کی ہے تاکہ نئے نئے انکشافات کے باعث توحید رسالت، قیامت اور حشر و نشر وغیرہ تمام عقائد خالص سائنٹیفک نقطہٴ نظر سے بھی برحق اور دو اور دو چار کی طرح بالکل واضح اور منطقی ہو جائیں۔ جن کے ملاحظہ کے بعد کچھ کسی کے لیے ان حقائق کا انکار کرنے کی مجال باقی نہ رہ جائے۔

چونکہ قرآن حکیم کسی انسان کا بتایا ہوا کلام نہیں بلکہ اس عظیم ہستی کی جانب سے اتارا ہوا ہے جس نے خود ان تمام مظاہر اور پوری کائنات کی تخلیق کی ہے، اسی بنا پر اس میں کائنات کی مشنری سے متعلق ایک ایک پرزے کی تفصیل درج ہے، جو اگرچہ ہے تو اشاروں و کنایوں ہی کی زبان میں مگر متعلقہ علوم کی ترقی کے باعث اس کے تمام اشارات و کنایات واضح اور اس کی تشبیہات و استعارات حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں اسی بنا پر ارشاد ہوا ہے:

حٰکِمٌ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یُعِیْمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طٰہِدٌ وَّکَاۤیِبٌ  
اُس دہم دان و ہمہ بین ہستی نے اتارا ہے جو ارض و سموات کے (تمام) کھیدور کا جاننے والا ہے۔

(فرقان : ۶)

اگر یہ انسانی کلام ہوتا تو کچھ ناممکن کھانا کہ اس میں اس قدر یقین اور ادرلاؤ والی کلیت



درج ہوتے اور وہ صدیوں سے اب تک جدید سے جدید علمی تحقیقات و انکشافات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا! جب کہ انسانی نظریات کی بنیاد پر جو کتابیں تصنیف کی گئی تھیں وہ سب کی سب داستان پارینہ اور ادراق پریشاں قرار پا چکیں۔ کیا یہ قرآن عظیم کی صداقت اور اس کا حیرت انگیز علمی اعجاز نہیں ہے؟ قرآن حکیم کا یہ ناقابل تردید علمی اعجاز ہی اُس کے من جانب اللہ ہونے کی روشن اور مفید کن دلیل ہے۔

اس سے یہ حقیقت بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اشارے کنایے اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتے جب تک کہ متعلقہ علوم کی ترقی نہ ہو جائے۔ مگر اس سے ناواقف لوگ یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ ”مسلمان تو علوم کی ترقی ہو چکنے کے بعد کہتے ہیں کہ اس کا ذکر ہمارے قرآن میں موجود ہے، یہ بات وہ پہلے نہیں کہتے“ اصل میں یہ حکیمانہ اور دنیا کی تاریخ میں حدودِ جدِ انوکھا طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا کہ خدائی منصوبے کے مطابق علوم و فنون کی ترقی ہو چکنے کے بعد نوع انسانی کی رہنمائی متعلقہ علوم میں بھی ہو جائے اور اس کے سامنے متعلقہ مسائل میں قرآنی نقطہ نظر سے خدا پرستانہ حیثیت سے واضح ہو جائے تاکہ وہ کسی بھی حیثیت سے بہکنے اور غلط راہوں پر نکلنے نہ پائیں۔ گویا کہ قرآن عظیم انسانوں کو ہر طرح سے اپنے ”مضبوط شکنجوں“ میں جکڑے رہنا چاہتا ہے۔ یہی اس کی اصل رہنمائی اور اس کا سب سے بڑا کمال ہے۔

اس بحث سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہم صرف اپنے دور کے احوال و کوائف، اصول و نظریات اور تحقیقات و انکشافات کے پابند ہیں۔ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ قرآن موجودہ دور کے علوم و فنون اور تحقیقات سے متعلق کیا کہتا ہے؟ پھر ہم کو تمام صحیح اصولوں سے کام لے کر قرآن اور جدید علوم کا تقابل کر کے نوع انسانی کی فکری و نظریاتی اعتبار سے رہنمائی کرنی ہے اور اس کے عظیم ترین وصف ”زقان“ ہونے کی حیثیت سے اُن علوم و فنون کے کھرے کھوٹے کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کرنا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے:

لَقَدْ آتَيْنَا الْكِتَابَ فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ بلاشبہ ہم نے تمہارے پاس

ایک ایسی کتاب بھیج دی ہے جس میں تمہارا تذکرہ موجود ہے۔ یہ تم نہیں سمجھتے؟۔ (انبیاء: ۱۰)

ہم کو اس سے بحث نہیں ہے کہ آئندہ دور میں کیا ہوگا اور علوم و فنون کون سا رخ اختیار کریں گے، کون سے مسائل باقی رہیں گے اور کون سے فنا ہو جائیں گے؟۔ ہم تو صرف اپنے دور کے علوم و مسائل کے پابند ہیں مستقبل کے بارے میں سوچنا ہمارا کام نہیں ہے۔ کیونکہ ہم تو اس بارے میں کوئی جزئی یا کلی علم نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات تکلیف مالا یطاق کے قبیل سے ہوگی۔ آئندہ جب حالات بدل جائیں گے اور نئے نئے علوم و فنون رائج ہو جائیں گے تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ اپنے کلام برحق کی تائید اور دین ابدی کی نصرت و حمایت کے لیے ایسے بندوں کو ضرور اٹھائے گا جو اس دور کی عقلیت کے مطابق اس دور کی رہنمائی کر سکیں اور علم کلام کے نئے نئے اور بہتر سے بہتر اصول منضبط کر کے ہر قسم کی غلط فہمیوں اور شکوک و شبہات کا پردہ چاک کر سکیں۔ لہذا ہمیں زمانہ مستقبل کے تعلق سے خواہ مخواہ پریشان ہو کر موجودہ علوم و فنون سے کنارہ کشی اختیار کرنا دانش مندی سے بیدتر ہو گا۔

وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ۝ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ

۱۔ ”فِيهِ ذِكْرُكُمْ“ اس میں تمہارا تذکرہ موجود ہے) کی تفسیر میں فخر ابو السعود نے بہت بہترین بات تحریر فرمائی ہے کہ اس سے مراد چند شکلیں یہ ہو سکتی ہیں: (۱) اس میں تمہاری عزت و شہرت کا بیان موجود ہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ”وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَكُمۡ وَاقْوِمْ لِكُلِّ فِرْقٍ“ (اس میں تمہارا اور تمہاری قوم کا ذکر ہے) (۲) کہا گیا ہے کہ تمہارے دینی و دنیوی امور کا بیان موجود ہے۔ (۳) کہا گیا ہے کہ اس میں ان تمام چیزوں کا بیان موجود ہے جو تمہارے مکارم اخلاق کے لیے ضروری ہوں (۴) اور کہا گیا ہے کہ اس میں وعظ و نصیحت (اور تنبیہ و انتباہ) کا سامان موجود ہے اور نظم کلام کے لحاظ سے یہی سب سے زیادہ بہتر ہے۔ (تفسیر ابو السعود، بر حاشیہ تفسیر کبیر جلد ۷ ص ۷۳-۷۴)۔

تَنْزِيلٍ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝ یہ وہ زبردست (اور بے نظیر) کتاب ہے جس میں باطل (غیر واقعیات) نہ آگے سے در آسکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔ کیونکہ یہ حکمت اور خوبیوں والی ہستی کہ جانب سے اُتارا گیا ہے۔ (مجموعہ: ۴۱-۴۲)

یعنی اس میں جھوٹ اور خلافِ واقعیات نہ ماضی میں جگہ پاسکی ہے اور نہ مستقبل میں جگہ پاسکتی ہے۔

وَبِالنَّحْيِ أَنزَلْنَاهُ مَسْرُورًا نَّحْيِ نَزَلَ ط وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝

اللہ ہم نے (قرآن) کو راستی کے ساتھ اُتارا ہے اور وہ (بالکل) راستی ہی کے ساتھ اُترا ہے۔

راہِ راستی بنا ہے ہم نے آپ کو محض بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ (بنی اسرائیل: ۱۰۵)

یعنی وہ جو امور بیان کرتا ہے اور جن اصول و ضوابط کی تعلیم دیتا ہے وہ بالکل واضح اور صداقت سے بھرپور ہیں۔ اور اس میں ہر قسم کی خوشخبریوں اور تنبیہ و انتباہ کا سامان جمع کر دیا گیا ہے اور ہمارا کام یہ ہے کہ عصری علوم و فنون کی روشنی میں ان دونوں رُخوں کو خوب وضاحت کے ساتھ نوعِ انسانی کے سامنے پیش کر دیں۔

### علمِ الہی کی ازلیت کا آفاقی نظارہ :

مذکورہ بالا مباحث کی تنقیح میں ضمناً ایک دوسری بحث پیدا ہوتی ہے اور ایک بہت بڑی حقیقت پر سے پردہ اُٹھ جاتا ہے۔ وہ ہے علمِ الہی کی ازلیت اور کلی و جزئی ہر حیثیت سے اس کے علم کا کائنات کی پوری مشنری اور کلی کائنات پر محیط ہونے کا آفاقی اور ایمان افروز نظارہ جس کے ملاحظے سے بہت سے فلاسفہ کے بے بنیاد نظریات کا رد اور بہت سے باطل مذاہب کی جہالت آمیزیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، چنانچہ فلاسفہ کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہیں ہے۔ اور مذاہبِ اسلامیہ میں ردائضی اور فرقہ قدریہ کا عقیدہ یہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ

۱۔ شرح عقائدِ نفسی، از علامہ سعد الدین تفتازانی، ص ۳۳، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ۔



کو اشیا کی تخلیق سے قبل اُن کا علم نہیں ہو سکتا۔

مستذللیم الہیات و کلامیات کے اُن اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے جن کے سمجھانے میں انسانی عقل و دانش حیران و سرگرداں رہی ہے۔ مگر خالص فلسفیانہ نقطہ نظر سے ابھی ہوئی ڈور کا سراپ تک ہاتھ نہیں آسکا ہے۔ ہاں اسلامی نقطہ نظر سے عقائد و کلام کی کتابوں میں جو مذکور ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کو تمام جزئیات و کلیات اور موجودات و معدومات کا علم بکمال درجہ حاصل ہے“ اس کا قطعی ثبوت قرآن مجید میں موجود ہے۔ در اس کا آفاقی نظارہ ہمیں قرآن حکیم کو سائنٹفک نقطہ نظر سے (سائنسی علوم کی روشنی میں) سمجھنے کے بعد یقینی طور پر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوقاتِ عالم کا خالق ہے۔ اور اسی نے اپنے کلام برحق کی صداقت و حقانیت کے ثبوت کے طور پر اپنی مخلوقات کے تمام احوال اور کائنات کی مشنری کے ایک ایک پُرزے کی ساخت و پرداخت سے متعلق تفصیلی معلومات محض اپنے علم ازلہ کی بنا پر پہلے ہی سے ایک منصوبے کے مطابق اپنے کلام میں درج کر دی ہیں۔ اب قرآن اور سائنس کے تقابلی مطالعے سے یہ تمام صداقتیں اور سچائیاں ایک ایک کر کے ظاہر و باہر ہو جاتی ہیں اور علم الہی کی ازلیت اور اس کے احاطہ جزئیات کا حال پوری طرح روشن اور نمایاں ہو جاتا ہے، چنانچہ کچھلے اور لگے تمام ابواب میں اس قسم کے جتنے بھی حقائق منکشف کیے گئے ہیں اُن سب سے بنیادی طور پر یہ ہمہ گیر اور عالم گیر سچائی پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوشش کی جائے تو خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب وجود میں آسکتی ہے۔ اسی طرح کتب عقائد و کلام میں اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات ازلیہ اور صفات کمالیہ سے متعلق جو اصل بحثیں — فلسفیانہ موثر گافیوں سے بہت کم — موجود ہیں ان سب کا اثبات بھی

۱۵ شرح فقہ اکبر از ملا علی قاری ص ۱۸، مطبع مجیدی کانیپور ۱۳۲۵ھ۔

۱۶ ایضاً ص ۱۸۔

آج قرآن حکیم کے ذریعہ اور سائنسی علوم کی روشنی میں بہت بہتر بلکہ مشاہدہ طور پر کیا جاسکتا ہے۔  
لہذا ہمارے علماء کو سائنسی علوم کی یہ افادیت اور قرآن حکیم کا یہ اہم اور حیرتناک پہلو بھی نظر  
رکھنا چاہیے، تاکہ عالم انسانی کو قرآن حکیم کی ابدی دوسرمدی صداقتوں سے آگاہ کر کے اس کو  
اس سرچشمہ ہدایت کی طرف لایا جاسکے۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللّٰطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۝ کیا وہی بے خبر رہ سکتا ہے جس نے  
(تمام مخلوقات کو) پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ بہت باریک بین اور بڑا ہی باخبر ہے۔ (ملک: ۱۴)  
وَعِنْدَ كَافٍ مِّنَ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ ۚ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبُرُوجِ ۚ  
وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا جَبَلٍ فِي ظُلُمَاتٍ اِلَّا رَءٰی وَاَن تَطْبُوْا  
لَا يَاْبِسُ اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝ اور اسی کے پاس ہیں غیب کی کجیاں، جن کو بحر اُس کے اور کوئی  
نہیں جانتا۔ اور وہ ہر ذرہ میں جو کچھ ہے سب کو جانتا ہے۔ اور جو پتہ بھی (کسی درخت کا) گرنا  
ہے وہ اس کو جانتا ہے۔ اور زمین کی تاریکیوں میں پایا جانے والا کوئی دانہ اور کوئی خشک چیز  
ایسی نہیں ہے جو کتابِ روشن میں درج نہ ہو۔ (العام: ۵۹)

يَعْلَمُ مَا يَابِغُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا  
يَعْرُجُ فِيْهَا ط۔ وہ جانتا ہے اُن تمام چیزوں کو جو زمین میں داخل ہوتی ہیں اور اس سے خارج  
ہوتی ہیں اور اُن تمام چیزوں کو جو آسمان سے اترتی ہیں (مثلاً کائناتی شعاعیں اور شہاب ثاقب  
وغیرہ) اور (پھر) آسمان میں چڑھتی ہیں۔ (سبا: ۳)

عَلِمُ الْغَيْبِ وَلَا يَعْرُبُ عَنْهُ مَنَاقِلُ ذَرَّاتٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ  
وَلَا اَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا اَكْبَرَ اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝ وہ غیب (تمام پوشیدہ چیزوں)  
کا جاننے والا ہے۔ اُس (کے) نظروں سے زمین اور اجرام سماوی میں موجود کوئی رتی سی چیز  
(جیسے ایک ایٹم) یا اس سے چھوٹی (ایٹمی ذرات اور شعاعیں وغیرہ) یا اس سے بڑی (جیسے  
سالمات، غرض کوئی بھی چیز اس کے علم سے) غائب نہیں ہو سکتی۔ (بلکہ اُن تمام مظاہر کا حال)

ایک کھلی کتاب میں مندرج ہے۔ (سبا: ۴۴)

ترمذی کی ایک حدیث میں قرآن حکیم کی جو جامع اور حیرت انگیز صفات بیان کی گئی ہیں وہ آج بالکل مطابق واقعہ نظر آتی ہیں:

فیه نبأ ما کان قبلكم، وخبر ما بعدکم، وحکم ما بینکم، هو الفصل  
لیسن بالهزل، من ترکہ من جبار قصمه اللہ، وابتغى الهدى فی غیرہ  
أضلہ اللہ، وھو جبل اللہ الملتین، وھوالذکر الحکیم، وھو الصراط المستقیم،  
ھوالذی لا تزلیج یدہ الا ھواء، ولا تلتبس یدہ الا لسنتہ، ولا یشیع منہ  
العلماء، ولا یخلق علی کثرة السرا، ولا تنقضی عجائبہ، ھوالذی لم تثنہ  
الجن اذا سمعته حتی قالوا انا سمعنا قرآنا عجبا یمھدی الی الرشد، من  
قال بہ صدق، ومن عمل بہ اجر، ومن حکم بہ عدل، ومن دعا الیہ  
ھدی الی صراط مستقیم

قرآن میں تمہارے دور سے پہلے کی خبریں بھی ہیں اور تمہارے دور کے بعد کے واقعات بھی۔  
وہ تمہارے (تمام) باہمی معاملات (واختلافات) میں حاکم ہے۔ وہ (ہر معاملے میں) قول فصیل  
بے کوئی ہنسی مذاق نہیں، جس نے تکرر کی بنا پر قرآن کو چھوڑا، اللہ نے اس کو ہلاک کیا۔ اور  
جس نے اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا ذریعہ ہدایت اختیار کرنا چاہا تو اللہ نے اس کو گمراہ کیا۔  
وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ وہ حکمت والا تذکرہ ہے۔ وہ سیدھا راستہ ہے۔ وہ ایسا کلام  
ہے کہ خواہشات کو بے قابو ہونے نہیں دیتا۔ وہ ایسا کلام ہے کہ انسانی زبانیں اس سے میل  
نہیں کھاتیں۔ علماء کی طبیعت اس سے سیر نہیں ہوتی۔ وہ کثرت تلووت سے پرانا نہیں ہوتا۔ اس کے  
عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ یہ وہی کلام ہے کہ جب جنوں نے اس کو سنا تو انھیں یہ کہے بغیر چارہ نہ

۱۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی فصل القرآن، جلد دوم، مطبوعہ مصر۔



رہا کہ ”ہم نے ایک تہایت ہی عجیب قرآن سنا ہے جو ہدایت کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔“  
 (اب) جس نے بھی قرآن کے مطابق کہا سچ کہا۔ جس نے اس پر عمل کیا ثواب پایا۔ جس نے اس کے  
 مطابق فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا اور جس نے اس کی طرف لوگوں کو بلایا اس نے صراطِ مستقیم کی  
 دعوت دی۔“

اس حدیث شریف کے مطابق قرآن حکیم کی جو علمی خبریں آج علومِ جدیدہ کی روشنی میں ہم پر  
 منکشف ہو رہی ہیں وہ نہ صرف قرآن حکیم کی بلکہ خود اس حدیث شریف کی حقانیت کا بھی ایک  
 ثبوت بہم پہنچا رہی ہیں۔ ان علمی خبروں کے ملاحظے سے بالکل یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم قرآن  
 حکیم کے روپ میں علمِ الہی کی ازلیت و آفاقیت کی ایک ”ٹیلی ویژن فلم“ دیکھ رہے ہیں جس میں  
 صحیفہٴ فطرت کے نقش و نگار، اس کی رنگارنگیاں اور اس کے تمام چھوٹے بڑے مظاہر  
 ایک خاص انداز میں درج ہیں اور اکثر ”سیرتوں“ کے تمام بنیادی نکات کا اصولی طور پر  
 احاطہ کر لیا گیا ہے، اس طرح کہ کوئی معمولی سے معمولی جو اور کوئی ادنیٰ سا منظر قدرت بھی درج  
 ہونے سے چھوٹ نہیں سکتا ہے۔ مگر اس کی ایک خاص زبان اور ایک خاص اسلوب ہے جس کو  
 سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ خود اس حدیث میں اشارہ موجود ہے (ولا تقلبہ  
 الا لسنة) انسانی زبانیں اس سے میل نہیں کھاتیں۔ اس اسلوب کو سمجھ لینا ہی دراصل  
 قرآن کی ”شاہ کلید“ یا *Master Key* کو پا لینا ہے جس کے ذریعہ اس کے تمام  
 ”بند دروازے“ کھل جاتے ہیں اور اسرار و معارف کی بارش ہونے لگ جاتی ہے۔

غرض قرآن حکیم کا یہ ایک زبردست علمی اور تاریخی اعجاز ہے اور اس کی صداقت و  
 حقانیت کا ایک یقین آور فیصلہ کن ثبوت ہے کہ چودہ سو سال قبل ایک اُمّی — فداہ اہلِ دُعا —  
 کی زبان حقیقت بیان سے جو دعوے کرائے گئے تھے وہ آج علم و تحقیق کی روشنی میں نہ صرف  
 صحیح اور برحق ثابت ہو رہے ہیں بلکہ ایک ہمہ داں و ہمہ بین ہستی — جل جلالہ — کے  
 وجود کی بھی ناقابل انکار شہادت فراہم کر رہے ہیں، جس کا علم ازل اور محیط بالجزئیات ہے

وہ کائنات کے ایک، ایک ذرے، ایک ایک ایٹم اور اس کے اندر واقع تمام اجزاء اور ان کی کار فرمائیوں سے پوری طرح واقف اور باخبر ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَخْلُقُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ  
کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی تمام چیزوں سے واقف ہے، (مجادلہ: ۱۰)  
وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ اس نے اس عالم رنگ و بو کی

ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے۔ (انعام: ۱۰۱)

أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّخِيطٌ ۝ ہاں جان لو کہ وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔  
(حم سجدہ: ۵۴)

علماء اور خلافتِ ارض کی ذمہ داریاں:

اصل بحث فلسفہ یونان اور اس کے غلط نظریات کی چل رہی تھی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ہمارے علماء کا وہ طبقہ جو فلسفہ یونان کا شیعہ اور اس کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے، علم و تحقیق کی ان ساری تبدیلیوں سے ناواقف رہ کر اب تک ”جزو لایستخرج“ کے وجود و عدم وجود اور ”افلاک سبعہ و تسعہ“ کی بے ہزار نہایت بحثوں بلکہ فرضی و دہمی مسائل میں الجھا ہوا ہے، جن سے نہ تو دین کا کوئی فائدہ ہے اور نہ دنیا کا۔ لے دے کے ان کی اہمیت قرون وسطیٰ میں محض کلامی حیثیت سے تھی مگر آج وہ بھی باقی نہیں رہ گئی، بلکہ ان فرضی و دہمی علوم کی جگہ آج جدید فلسفہ، جدید منطق، اور تجرباتی علوم نے لے لی ہے۔ اور موجودہ دور کی عقلیات کا توڑ کرنے کے لیے جدید فلسفہ اور سائنسی علوم کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ کہ قدیم اور ازکار رفتہ یونانی عقلیات کا۔

یونانی فلسفہ جہاں بھی گیا اس نے جھگڑے، تصادات پیدا کیے، خواہ اسلامی دور میں ہو یا یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں۔ یونانی فلسفہ اپنے اصل مزاج کے اعتبار سے جمود یا ”بے علمی“ کی تعلیم دیتا ہے۔ مسلمانوں میں اس نے اس عقیدہ کی حیثیت سے تفرقہ  
لے استقرار کی منطق جو تمام تجربات علوم کی جان اور روح قرآن کے عین مطابق ہے۔

ڈالا، فرتے پیدا کیے اور ایک کو دوسرے سے بڑایا۔ یہ کام یورپ میں ایک دوسرے طریقے سے کیا گیا اور لاکھوں آدمی کلیسا کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ ارسطو کے فلسفے اور اس کے نظریات کا انکار کرنے والوں کو سولی پر چڑھا دیا اور زندہ جلایا گیا۔ یہ ایسی کہانی ہے جس کو بڑھ کر روٹنگے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کے برعکس تجربی علوم مفید ضروری اور حرکت پیدا کرنے والے ہیں، جن کی طرف رہنمائی — جیسا کہ تفصیلات پچھلے ابواب میں گذر چکیں — قرآن حکیم کی اور قرون وسطیٰ میں ان کی ترقی ہوئی اور موجودہ دور میں وہ منتہائے کمال کو پہنچ گئے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارے علماء اور ابواب فکر کے لیے ضروری ہے کہ ان جامد اور غیر متحرک علوم — جو تجربے و مشاہدے کے دشمن اور ہر قسم کی ”بے عملیوں“ نیز جھگڑے فسادات کی علامت ہیں — کو ترک کر کے حقیقی اور فائدہ دی علوم کو اختیار کریں جن سے قرآن حکیم کی صداقت و حقانیت بھی ثابت ہوتی ہے، بلکہ دراصل قرآن حکیم نے خود اپنی صداقت و سچائی کے اثبات ہی کے لیے تجرباتی علوم کی ترقی کی دعوت دی تھی تاکہ قرآن حکیم کا اصل معجزہ ظاہر ہو اور نوع انسانی کے سامنے وہ ایک فیصلہ کن کلام کی حیثیت سے آئے اور اس کے لیے محبت و برہان بن جائے۔

مذکورہ بالا مباحث سے بخوبی واضح ہو گیا کہ یونانی فکر و فلسفہ اپنے مزاج اور مابہیت کے اعتبار سے تجربی علوم سے یکسر مختلف ہے، بلکہ ان دونوں میں ایک طرح سے تعارض و تضاد پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک مسلمان ارسطو کی منطق و فلسفے سے چمٹے رہے انھوں نے سائنسی اور مادی میدان میں کوئی ترقی نہیں کی۔ مگر جیسے ہی انھوں نے قرآنی فکر اور اس کی دعوت کے مطابق تجربے و مشاہدے کو رہنمایا ان پر نئے نئے حقائق منکشف ہوئے۔ یہی حال یورپ کے دورِ حیا یا نشاۃ ثانیہ کا بھی ہے۔ جب تک ارسطو کی منطق و فلسفہ اور اس کے نظریات کو — جن سے کلیسا چمٹا ہوا تھا — رد نہیں کیا گیا جدید علوم و فنون کی ترقی عمل میں نہیں آسکی اور وہ ایجادات و اکتشافات — جن سے آج ہم متمتع ہو رہے ہیں —



معرضِ وجود میں نہیں آسکے۔ یہی حقیقت آج بھی صادق آتی ہے۔ جب تک ہم یونانی حکمت و فلسفے کو سینے سے لگائے رکھیں گے۔۔۔ جیسا کہ آج ہمارے اکثر ہندوستانی عربی مدارس کا خاصہ ہے۔۔۔ ہم خلافتِ ارض کے میدان میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکیں گے۔ کیونکہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ان عقلی علوم کا مزاج ہی بنیادی طور پر جمود کی تعلیم دینا اور زندگی کے میدان اور اس کے ہنگاموں سے دور رکھنا ہے۔ اور پھر یہ کوئی الہامی علوم بھی نہیں ہیں کہ ہم انھیں اس قدر ضروری اور اہم قرار دیتے ہوئے انھیں عملاً دینی علوم کے برابر کا درجہ دے دیں۔

فلسفہ یونان چونکہ محض نظری ہے اور عملی دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے اس بنا پر وہ تجربات و مشاہدات کی رو سے واقع ہونے والے تمام تغیرات و انقلابات سے بے پروا ہو کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدِ الگ سے قائم رکھے ہوئے ہے۔ اور اس سلسلے میں اُسے نہ تو قرونِ وسطیٰ کے مسلم سائنس دانوں کے تجربات و تحقیقات کے نتیجے میں رونما ہونے والی فکری و نظری تبدیلیوں کی کچھ پروا ہے اور نہ عصرِ جدید کے علمی تغیرات و انقلابات سے چنداں پریشانی! بلکہ اس کے افکار و نظریات جس طرح ہزاروں سال قبل درخشاں اعتنا سمجھے جاتے تھے اسی طرح بلکہ شاید اس سے کچھ زیادہ قطعیت کے ساتھ آج بھی مسلم اور ناقابلِ تردید۔۔۔ بعض مخصوص حلقوں میں۔۔۔ سمجھے جا رہے ہیں۔ زمین اپنی جگہ سے ہل سکتی ہے اور آسمان اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے مگر ان ”پیمبرانِ یونان“ کے اقوال میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یونانی افکار پر یہ فریفتگی بلکہ ”ثابت قدمی“ شاید اس بنا پر ہو کہ سائنسی علوم ان کی نظر میں چونکہ ”ارتقار پذیر“ ہیں اس لیے وہ قابلِ اعتنا نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس یونانی افکار میں چونکہ ”ارتقار“ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس لیے گویا وہ اس قابل ہیں کہ ان پر ثابت قدم رہا جائے اور ان پر مداومت کی جائے۔ اور عجب نہیں کہ کسی کے ذہن میں یہ تصور بھی ہو کہ علم کا مفسر ہو سکتا ہے کہ تھک کر پھر کسی وقت اُسی منزل کی طرف لوٹ آئے جہاں پر فکرِ یونان ”یڑاؤ“

ڈالے ہوئے ہے۔

اسلام نے منصب خلافت کی وضاحت اور اس کی ذمہ داریوں کے فرائض نہایت خوب کے ساتھ بیان کیے تھے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ علمائے اسلام کا ایک بڑا حلقہ اس منصبِ عظیم کو سمجھنے اور اس کی وضاحت کرنے میں — نادانستہ طور پر — ناکام رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر اسلام اپنے کردار کی ادائیگی میں ہرگز ناکام نہیں رہا بلکہ اس کے پیرو اور اس کے ماننے والے ناکام رہے ہیں۔ اور علماء کی اس ناکامی میں — میرے ناقص علم کی رو سے — یونانی منطق و فلسفے نے تاریخی رول ادا کیا ہے۔ مسلمان علمائے یونان کے نظری علوم میں غلو کی حد تک کچھ اس طرح منہمک ہو گئے اور انھیں اپنے سر پر اس طرح بٹھالیا کہ تجرباتی علوم — وہ علوم لمبسی و حیاتیاتی جن میں کمال حاصل کر کے یورپ زمین کی مادری خلافت پر قابض ہو گیا — سے بالکل غافل ہو گئے اور خلافتِ ارض کے اصل مقصد کو فراموش کر دیا۔ علاقہ اقبال نے بجا طور پر فرمایا ہے :

”یونانی فلسفے نے مفکرین اسلام کے مطلعِ نظر میں اگرچہ بہت کچھ وسعت پیدا کر دی تھی مگر بحیثیتِ مجموعی قرآن مجید میں اُن کی بصیرت محدود ہو کر رہ گئی“ ۱۵

یورپ نے ارسطو کی عقلیات کو رد کر کے سائنس اور مادیت میں اتنی ترقی کر لی کہ وہ ان کے بل بوتے پر تمام اقوامِ عالم پر غالب آ گیا اور پوری دنیا کو زیر کر بیٹھا۔ مگر مشرقی ممالک اب تک ان ”اوراقِ پریشان“ کو سینے سے لٹکائے ہوئے ذلت و نکبت اور غلامی کی تصویرِ مجسم بنے ہوئے ہیں اور ”علمِ اسماء“ میں برتر و فائق ترقیوں کے وار ہے جارہے ہیں اور حال یہ ہو گیا ہے کہ ”اُف“ تک کہنے کی بھی مجال باقی نہیں رہ گئی ہے۔ پانی سرے بہت ادبچا ہو گیا ہے لہذا اب ہم کو پوری طرح ہوش میں آ جانا چاہیے۔ ہم ”خیالات و مفودات“

۱۵ تشکیلِ جدید الہیات اسلام، ص ۵، مطبوعہ لاہور۔

کی دنیا میں کچھ اس طرح کھو گئے ہیں کہ ہمیں بالکل کوئی خبر نہیں ہے کہ ہمارے گرد و پیش علمی دنیا میں کیا کیا انقلابات و تغیرات واقع ہو چکے ہیں! گویا کہ یونان کی ”خیالی دنیا“ ہمیں اب تک ”واقعی دنیا“ میں قدم رکھنے سے روکے ہوئے ہے مگر جب تک ہم اس خیالی دنیا کے طلسم سے باہر نکل کر واقعات کی دنیا میں قدم نہیں رکھتے، ہم کسی بھی چیز کا حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے جائزہ نہیں لے سکتے اور خلافت ارض کے میدان میں کوئی کام نہ انجام نہیں دے سکتے۔

لہذا ہماری دینی، ملی اور قومی غیرت کا تقاضہ ہے کہ ہم اس ناگفتہ بہ اور اندوہناک صورت حال کو بدلیں۔ جدید علوم و فنون کو اپنانے سے نہ صرف ہماری قومی و ملی زندگی کی کایا پلٹ سکتی ہے بلکہ بین الاقوامی حیثیت سے بھی ہماری شان و شوکت اور ہمارے قومی و ملی وقار میں اضافہ ہو سکتا ہے، نیز فکری و نظریاتی اعتبار سے اتنے سارے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو شمار سے بھی باہر ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ہماری ملت کے ارباب حل و عقد پوری ہوش مندی اور دیانتداری کے ساتھ ان مسائل پر غور و فکر کر کے موجودہ تاریخ کے مشکل اور نازک ترین لمحات میں ملت اسلامیہ کی صحیح اور بروقت رہنمائی کریں۔ اس وقت بین الاقوامی اعتبار سے امت مسلمہ جن ناگفتہ بہ حالات سے گزر رہی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ ہمارا ایک ایک قدم صحیح لائنوں اور صحیح سمتوں کی طرف اٹھے۔ یہ وقت تاریخ نگاری کا نہیں بلکہ تاریخ سازی کا ہے اور ہماری ذرا سی بھی چوک اور کوئی بھی غلط فیصلہ بھیا تک اور تباہ کن نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ اور ہم خیالات کی دنیا میں رہ کر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا محض خواب ہی خواب دیکھتے رہ جائیں گے۔

لہذا ہمارے ارباب ملت کا فرض ہے کہ وہ فکری و نظریاتی اعتبار سے قوم و ملت کا صحیح رہنمائی فرمائیں تاکہ گرداب میں بھینسی ہوئی کشتی پار لگے۔ درتہ پوری ملت کا خون ناحق اس کے تاختاؤں کی گردن پر ہوگا اور وہ خدا کے نزدیک جواب دہ ہوں گے۔ لہذا ہمارے علمائے کرام کو منفی رویہ ترک کر کے مثبت رویہ اپنانا ہوگا۔ یہ بہت بڑی اور بھاری ذمہ داری ہے بلکہ ایک بہت بڑا اور کٹھن امتحان اور ایک زبردست چیلنج ہے، جس کا پوری ہوش مندی



اور بیدار مغزی کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے۔

### علماء اور جدید مسائل:

علوم جدیدہ سے علماء کی دوری اور بے گانگی کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جدید علوم کی نشوونما اعدان کی ترویج و اشاعت کے باعث معاشرہ جن نئے نئے علمی، فکری، معاشرتی اور تمدنی مسائل و مشکلات سے دوچار ہوتا ہے، ان سے بھی مکمل بے گانگی عمل میں آئی۔ اور یہ تصور عام ہو گیا کہ اب علماء کو ان علوم اور ان مسائل سے کسی بھی قسم کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن کے مقاصد اس کے عالمگیر نظریات کے مطابق ضروری تھا اور ہے کہ وہ انسانی معاشرے کے ایک ایک ”یونٹ“ میں گھستے اور اس کے ایک ایک رگ دریشے سے واقف ہو کر اپنا فریضہ ”معروف و منکر“ ادا کرتے۔ معروف و منکر محض چند رسوم یا روایات کی تلقین کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ انسانی افکار و نظریات، اس کے فلسفوں اور اس کی تمام تحریکوں کا جائزہ لے کر کھرے کھرٹے کو الگ کرنا اور صحیح و سقیم کا حال ان کے وسیع مفہوم کے مطابق عقل و نقل کی روشنی میں پوری وضاحت کے ساتھ کر کے ان کے نشیب و فراز اور عواقب و نتائج سے پوری نوع انسانی کو بہ گاہ و متنبہ کرنا۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

كَلِمَاتٍ نَّزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُوْنَنَّ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيرًا

بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر فرقان (حق و باطل میں تمیز کرنے والی فیصلہ کتاب) نازل کی تاکہ وہ سارے جہان کو متنبہ کر سکے۔ (فرقان: ۱)

اس لحاظ سے معاشرہ کی اصلاح اور گمراہ کن فلسفوں اور تحریکوں کے ابطال کے لیے

۱۔ معروف کے لغوی معنی ہیں ”جاننا پہچانا“ یعنی ہر وہ (قول یا) فعل جس کو عقل و نقل اچھا اور قابل تحسین قرار دیں۔ اسی طرح منکر کے لغوی معنی ہیں ”غیر جاننا پہچانا“ یا ”امر ناشناس“ یعنی وہ قول (یا) فعل جس کو عقل و نقل بُرا اور قبیح سمجھیں۔ (ماخوذ از المفردات فی غریب القرآن)

ان فلسفوں اور علوم و مسائل سے نہ صرف واقفیت ضروری بلکہ فرض کفایہ ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ (۶۶۱-۷۲۸ھ) نے اس مسئلے میں کہ غیر منقولی مسائل میں فرض جائز ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ اگر جائز ہے تو اس کے ضروری اور واجب ہونے کی کوئی دلیل ہے بھی یا نہیں؟ تحریر فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے ہیں اُس پر مجمل اور عمومی طور پر ایمان لانا سب پر واجب ہے، مگر اس کی تفصیلی معرفت حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ اور یہ شق دین کی تبلیغ میں داخل ہے۔ اسی طرح یہ بات قرآن کے تدبیر اور اس کے فہم، کتاب و حکمت کے علم اور اس کی حفاظت، خیر اور معرفت کی طرف بلانے، منکرات سے روکنے اور راہ خداوندی کی طرف حکمت و موعظت اور بہترین بھادلے و مباحثے کے ذریعہ دعوت دینے وغیرہ تمام امور میں داخل و شامل ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے واجب قرار دیا ہے۔ لہذا (ان تمام حیثیتوں سے) یہ علم واجب کفایہ ہے۔“ لے

ظاہر ہے کہ اگر علماء اور دین الہی کے رمز شناس ہی اس کو سچے سے ہٹ جائیں تو پھر اصلاح عالم کا فریضہ کون ادا کر سکے گا؟ لہذا ہر دور میں علماء پر یہ فریضہ ایک فرض کفایہ کے طور پر عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے تمام غلط اور بے بنیاد افکار و خیالات اور گمراہ کن تحریکوں کی خرابی اور فلسفوں اور دیگر تمام علمی و اعتقادی مفاسد کا پوری باریک بینی کے ساتھ جائزہ

۱۔ فقہی اعتبار سے شرعی احکام فرض، واجب، سنت اور مندوب (یا مستحب) میں منقسم ہیں۔ فرض اور واجب کی تعریف میں تھوڑا سا فرق ہے مگر یہ دونوں وہ ہیں جن کی ادائیگی ہر حال میں ضروری ہو۔ اور ان میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں: فرض عین اور فرض کفایہ، اسی طرح واجب عین اور واجب کفایہ۔ فرض عین اور واجب عین وہ احکام ہیں جن کی ادائیگی امت کے ہر فرد پر ضروری ہو۔ اس کے برعکس فرض کفایہ اور واجب کفایہ وہ ہیں کہ اگر کچھ افراد ان کو ادا کر دیں تو بقیہ افراد کے ذمے سے یہ فرض ساقط ہو جائے۔ ۲۔ موافقہ صریح المعقول لصحیح المنقول،

لے کر ”کتاب حکمت“ کی روشنی میں ان کا علمی تجزیہ کریں پھر ان مفاسد کو نمایاں اور خدائی ہدایت و رہنمائی کو واضح کر کے عالم انسانی کی فکری و نظریاتی اعتبار سے صحیح رہنمائی کریں۔ یہ ہے علمائے اسلام کا صحیح مقام اور ان کا صحیح منصب۔

جدید فلسفے اور تحریکیں :

آج اسلام کو جس قسم کے ہر گیز اور عالمگیر فکری و نظریاتی چیلنج کا سامنا ہے اس قدر ہر گیز اور عالمگیر چیلنج سے اس سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ایک طرف سائنسی علوم و فنون کی غلط اور مادہ پرستانہ نقطہ نظر سے تشریح و توجیہ کی جاتی ہے تو دوسری طرف ان غلط رجحانات و توجیہات کی بنیاد پر مختلف کے منظم فلسفے اور تحریکیں منظر عام پر آرہی ہیں۔ اور ان تمام کا بنیادی خمیر الحاد و لادینیت ہے۔

یہ تمام فلسفے اور تحریکیں خوشناعتوں اور دلفریب لیبلوں کے سہارے پورے عالم انسانی پر تھوپے اور لادے جا رہے ہیں۔ اور پورا عالم انسانی آج مادیت کے ان ”دلائل و ثبوتوں اور کھلونوں“ کے سہارے کشاں کشاں ”موت کی وادی“ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

ایک طرف تہذیب جدید کے وہ علمبردار ہیں جو تہذیب کے نام پر ”مزدوق“ کو مٹا کر قسم سے ”منکر“ کو فروغ دینا چاہتے ہیں، دوسری طرف یہودیوں کی خفیہ اور عالمگیر تحریک ہے جو یہودیت

۱۔ صفحہ گزشتہ میں بخوبی واضح کیا جا چکا کہ سائنسی اور تجرباتی علوم اصلاً غیر جانبدار ہیں۔ مگر مادہ پرست ان کی تشریح اپنے نظریات کے مطابق کرتے ہیں اور بحث کا رخ جس طرف چاہتے ہیں جوڑ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے موحّد اور خدا پرست سائنسداں بھی جو ان سے صحیح نتائج اخذ کرتے ہوئے ایک ذات برتر کے وجود کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس طرح ہمارا مقابلہ اصلاً ان علوم سے نہیں بلکہ ان غلط رجحانات سے ہے جو ان ”کائناتی حقائق“ کو غلط رخ پر لے جانا چاہتے ہیں۔



و صہیونیٹ کے غلبے و تسلط کی خاطر ہر قسم کی اخلاق سوزی اور عنایت و فحاشی کو مختلف فلسفوں اور ازموں کے نام پر ترقی دے رہی ہے۔ یہی قسری طرف اشتراکیت اور کمیونزم ہے جو پورے عالم کو اپنے جنگل میں لے کر اس کو وسیع ترین "جبری کمپوں" میں تبدیل کر دینے کے درپے ہے۔ کمیونزم کے زیر اثر ممالک کو چھوڑ کر بقیہ تمام ممالک کے فکری حالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ ہر جگہ ایک عجیب قسم کی "بے فکری" یا بے مقصدیت کا دور دورہ پایا جاتا ہے۔ یہ موجودہ اتحاد و لادینیت کا عالمگیر "تحفہ" ہے جو اس نے نوع انسانی کو دیا ہے کہ اس سے اس کا مقصد زندگی چھین کر اس کو نرا حیوان بنا دیا۔

تہذیب جدید کے علمبرداروں نے کلیسا (Church) اور عیسائیت کی ضد میں مذہب سے بغاوت کر کے روح اور اس کے مظاہر کو سمجھنے میں سخت ٹھوکر کھائی اور مادہ اور اس کے مظاہر ہی کو سب کچھ قرار دے کر انسان کو اخلاقی قیود سے بالکل آزاد کر دیا۔ جس کے نتیجے میں عیسائیوں اور خرمشیوں کے نئے نئے طریقے سوچے گئے اور عشرت کدوں کو نئے سرے سے اس طرح آراستہ

۱۵۔ چنانچہ مختلف مادی فلسفوں کو فروغ دینے اور دنیا میں عالمگیر گمراہی پھیلانے میں یہودیوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مثال کے طور پر ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو اپنانے اور پھیلانے میں یہودیوں کا بہت بڑا حصہ رہا ہے، جنہوں نے اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنا یا۔ (ملاحظہ ہو "صراع مع الملاحدة" ص ۲۲۱، از عبد الرحمن حسن جبکہ المیدانی، مطبوعہ دمشق، ۱۹۵۴ء)

اسی طرح نظریہ اشتراکیت کا بانی کارل مارکس، فلسفہ جنسیت کے نام سے جوانی شہرت کو فروغ دینے والا فریڈ اور اجتماعیات کا مادہ پرستانہ فلسفہ پیش کرنے والا ڈور کاہم یہودیوں میں یہودی تھے، جنہوں نے مختلف میدانوں میں کام کر کے مذہب و اخلاق کے نقوش کھرتج پھینکنے کی راہ میں بنیادی رول ادا کیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب "انسانی زندگی میں جمود و ارتقاء" مترجمہ ساجد الرحمان، مطبوعہ لاہور۔ نیز ملاحظہ ہو "الشیوعية ولیدة الصهيونية" از احمد (باقی ص ۲۳ پر)

کیا گیا کہ حیوانیت کے سابقہ تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔

یہ فلسفہ، یہ ”ازم“ اور یہ مختلف قسم کی تحریکیں آج عالم اسلام سمیت پورے اقوام عالم کے ذہن و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔ اور آج ہمیں انہی تمام ملحدانہ اور مادہ پرستانہ انکار و نظریات سے سابقہ پڑا ہے۔ ہمارے نو نہالوں کو بچانے اور نئی نسل کو اس ”نارنگ“ سے باہر نکالنے کے لیے محض شور و غوغا کرنا یا اسلام اور اخلاق کی دہائی دینا کافی نہیں ہے۔ کیونکہ آج قدریں بدل گئی ہیں اور ہر چیز کا معیار تبدیل ہو گیا ہے۔ موجودہ دور خالص عقلی و استدلالی دور ہے اور آج کے ذہن و دماغ کو وہی چیز مطمئن کر سکتی ہے جو موجودہ دور کے عقلی معیار اور مزاج کے مطابق ہے۔ زمانے کے مزاج کو نہ پہچانے ہوئے محض پرانے ہتھیاروں سے مقابلہ آرائی کی کوشش کرنا ایک عبث اور بے سود فعل ہو گا، بلکہ بعض حالات میں نقصان بھی۔

بہر حال آج ہم کو جن فتنوں، ازموں اور مادی تحریکوں کا سامنا ہے ان میں سے چند خاص خاص حسب ذیل ہیں :

### (دقیقہ حاشیہ ص ۲۳)

عبد الغفور عطار، مطبوعہ حیدر بیروت۔

اسی طرح یہودیت و صہیونیت کے اصل عزائم اور ان کی عالمگیر خفیہ تحریک سے واقفیت کے لیے دیکھیے :

- ۱۔ مؤامرة الصہیونۃ علی العالم، احمد عبد الغفور عطار، مطبوعہ مکہ مکرمہ۔
- ۲۔ برد تو کولات صہیون، مترجمہ احمد عبد الغفور عطار، ” ” ” ”
- ۳۔ الیہود والیجریمۃ، عبد المنصف محمود، المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ قاہرہ۔
- ۴۔ حقیقۃ الماسونیۃ، محمد علی زغبی، دار العربیہ بیروت۔

۱۔ مادیت: *Materialism*۔ یعنی اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ صرف مادہ ہی مادہ ہے، کسی دوسری قوت یا طاقت کا قطعاً کوئی وجود نہیں ہے۔ اور یہ خود اپنی علت آپ ہے۔

۲۔ فطرت پرستی: *Naturalism*۔ یہ عقیدہ کہ تمام حقائق "قوانین فطرت" کے ماتحت وجود میں آتے ہیں۔ یہ بھی مادیت ہی کا دوسرا نام ہے۔

۳۔ تشکیک: *Scepticism*۔ یعنی کسی بھی عقیدہ کے متعلق شک کرنا اور شکوک و شبہات پیش کرنا۔

۴۔ لاادریت: *Agnosticism*۔ یہ اعتقاد کہ خدا یا دوسری غیر مادی چیزوں کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ (یہ نہ تو مذہب کا مؤید ہے اور نہ اس کا مخالف۔ اور یہ آج کل کے اکثر سائنس دانوں کا مقبول ترین نظریہ ہے)۔

۵۔ عقل پرستی: *Intellectualism*۔ یہ نظریہ کہ علم بیشتر عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

۶۔ عقلیت: *Rationalism*۔ یہ نظریہ کہ علم صحیح کی بنا عقل پر ہوتی چاہیے۔

۷۔ خود رائیت: *Egoism*۔ یعنی فلسفہ خود غرضی یا انانیت۔

۸۔ مذہب انسانیت: *Humanism*۔ فلسفہ انسانیت جس کی رو سے انسان کی ذات کائنات کا مرکز ہے۔ اس لیے بجائے عالم آخرت یا عالم طبیعی کے محض انسانی فلاح و بہبود کی کوشش کرنی چاہیے۔

۹۔ آزاد روی: *Liberalism*۔ یعنی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی ہر حیثیت سے بے قیدی اور روشن خیالی۔

۱۰۔ افادیت: *Utilitarianism*۔ یہ اصول کہ جو کام اپنے



لیے مفید ہو رہی اچھا ہے۔

۱۱۔ لذتیت: *Spinozism* یہ اصول کہ جس چیز سے لذت حاصل نہ ہو اس کا وجود بے کار ہے۔

۱۲۔ ڈاروینیت: *Darwinism* یعنی انسان اور دیگر تمام انواع حیات کا ظہور ایک سادہ قسم کے جاندار (امیبا) سے بتدریج ”انتخاب طبعی“ اور ”بقائے اصلح“ وغیرہ قوانین کے ذریعہ ہوا ہے، نہ کہ کسی خلاق ہستی کے ذریعہ۔

۱۵۔ ”قاموس نامعلومات“ کے ایک مقالہ نگار ای، ڈبلیو ایف ٹاملن (E. W. F. Tomlin) نے نظریہ ارتقاء کی تردید میں مفصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ”معالجہ دماغی کے ماہر کارل اسپرٹن کے بیان کے مطابق نوع انسانی کے لیے جن تین سب سے بڑی دھمکیوں یا تہدییات کا سامنا ہے اُن میں سے ایک نظریہ ارتقاء بھی ہے۔ اور بقیہ دو ہیں ”مارکسزم اور فرائڈ ازم“ رانسائیکلو پیڈیا آف کنورس، ص ۲۲۸، آکسفورڈ، ۱۹۷۸ء) اس موقع پر مذکورہ نمبر ۱۲ سے ۱۶ تک کے نظریات سے تفصیلی واقفیت کیلئے دیکھیے ڈاکٹر رفیع الدین کی کتاب ”قرآن اور علم جدید“ دیگر فلسفیانہ نظریات سے واقفیت کے لیے فلسفہ جدیدہ وغیرہ سے واقفیت ضروری ہے۔ — ڈاکٹر رفیع الدین نے —

نظریہ ارتقاء کو الحاد و دہریت کے تمام فلسفوں کی اصل جڑ بنیاد قرار دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے: ”سچ بات تو یہ ہے کہ مغرب کے فلسفیوں میں لامذہبیت اور دہریت کا جس قدر مواد اس وقت موجود ہے وہ ڈارون ہی کے نظریہ کی پیداوار ہے۔ یہ کلید یا مخصوص کارل مارکس، میگڈوگل، فرائڈ، ایڈلر اور میکیا دل کے نظریات پر حاوی ہے۔“ (قرآن اور علم جدید، ص ۱۰۰)

(لاہور، ۱۹۵۹ء)

۱۳۔ میگڈوگل کا نظریہ جبلت، یہ نظریہ کہ انسان کی ساری فطرت اُس کی حیوانی جبلتوں پر مشتمل ہے اور اس کی حیوانی جبلتیں ہی اُس کے تمام افعال کی قوت محرکہ ہیں۔ (اس نظریہ کا تعلق نفسیات سے ہے)۔

۱۴۔ فرائڈ کا نظریہ جنسیت، یہ نظریہ کہ انسان کو عمل پر ابھارنے والا محرک دراصل اس کا جذبہ شہوانی ہوتا ہے، گویا کہ وہ ایک مغلوب الشہوت حیوان کی طرح ہے۔ (اس کا تعلق بھی نفسیات یعنی سائیکالوجی سے ہے)۔

۱۵۔ ایڈلر کا نظریہ محبت تفوق، اس کا تعلق بھی نفسیات سے ہے۔ یعنی یہ نظریہ کہ انسان کے لیے کام کا اصل محرک جذبہ شہوانی نہیں بلکہ جذبہ تفوق ہے۔ یعنی وہ دوسروں سے فائق و برتر ہونا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ ایک خود پرست حیوان ہے۔

۱۶۔ اشتراکیت: *Communism* یعنی انفرادی ملکیت کے برعکس ہر قسم کے مال و دولت اور جائداد وغیرہ کے بارے میں مشترکہ ملکیت کا نظریہ۔

۱۷۔ انفرادیت: *Individualism*، عمرانیات یا سماجیات (سوشیا لوجی) کا وہ نظریہ جس کی رو سے افراد کو عمل کی آزادی ہونی چاہیے۔ (یہ غیر اشتراکی ملکوں کا نعرہ ہے)

۱۸۔ یہ نظریہ کتنا مقبول اور معاشرے میں کتنی گہرائیوں کے ساتھ بیروست ہو چکا ہے کہ اس کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین تحریر کرتے ہیں: ”فرائڈ کا نظریہ مغرب کی یونیورسٹیوں میں نصاب تعلیم کا جزو ہے۔ نفسیات جدید کے نام سے اس پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں اور دن رات لکھی جا رہی ہیں۔ اس نظریہ کی اشاعت نے مغرب میں جنسی تعلقات کی ان پابندیوں کو جو مذہب یا سماج نے عائد کر رکھے تھے بہت ڈھیلا کر دیا ہے۔ وہاں اب یہ خیال عام ہے کہ یہ پابندیاں مضر صحت ہیں، دماغی امراض پیدا کرتی ہیں اور اُن سے چھٹے رہنا ایک خطرناک قسم کی قدامت پسندی ہے۔“ (حوالہ مذکور ص ۲۰)

۱۸۔ فلسفہ قومیت : *Nationalism* یعنی لسانی، تہذیبی اور

جغرافیائی بنیادوں پر ہر قوم کو خود حکومتی کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

۱۹۔ جمہوریت : *Secularism* یعنی حکومت و ریاست کے تمام معاملات

میں مذہبی بنیادوں کو نظر انداز کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ یا آزادانہ رویہ اختیار کرنا۔

اس قسم کے بہت سے فلسفے اور تحریکیں ہیں اور ان تمام کے تذکرے و تبصرے کے لیے

ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ بہر حال یہی وہ تمام مادی فلسفے اور نظریے ہیں جو موجودہ

عالمگیر سماج و لادینیت کا خمیر یا اس کے اجزائے عناصر ہیں۔ ان ازموں اور تحریکوں کو بعض علمی

اور سائنسی نظریات کا — غلط انداز میں — سہارا دے کر فلسفیانہ رنگ دے دیا گیا ہے

گویا کہ یہ فلسفے حقیقت واقعہ کے عین مطابق ہیں۔ حالانکہ علم صحیح اور منطق صحیح کی رو سے یہ تمام

فلسفے اور تحریکیں من گھڑت اور بے سرو پا نظر آتی ہیں۔

مگر آج جہدِ تعلیم یافتہ طبقے کے ذہن و دماغ پر یہ تمام فلسفے اور ازم اپنی ظاہری چمک

دمک، خوش نمائی اور بظاہر نظر آنے والی سلعی اور نام نہاد ”عقلیت و منطقیت“ کی بنا پر

پوری طرح حملہ آور ہو چکے ہیں اور وہ ان انکار و نظریات سے گویا کہ مسحور ہے۔ گویا کہ ایک

عالمگیر ذہنی ارتداد پیدا ہو گیا ہے اور خود عالم اسلام بھی اس ذہنی و فکری ارتداد کی لہر میں

محفوظ نہیں ہے۔ اس لیے ہم کو سب سے پہلے خود اپنے گھر کی فکر کرنی چاہیے۔

موجودہ معاشرے میں جتنی بھی تہذیبی برائیاں اور اخلاقی مفساد نظر آرہے ہیں وہ سب

انہی فلسفوں کے برگ و بار اور ثمرات و حاصلات ہیں۔ لہذا موجودہ اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو ختم کرنے

کے لیے ان فلسفوں پر ہمیشہ چلانا اور انھیں سچ و سچ سے اکھاڑ پھینکنا ناگزیر ہو گا۔ ورنہ جب تک

یہ جڑیں اور بنیادیں باقی رہیں گی ان سے برگ و بار بھی نمودار ہوتے رہیں گے۔

یہ خرابیاں اس لیے پیدا ہوئیں کہ عقل و عقل کے حدود کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور یہ نکتہ فراموش کر دیا گیا

کہ عقل اگرچہ کتنی ہی تیز اور باریک بین کیوں نہ ہو وہ مجرد طور پر فوق الطبعی امور کا ادراک نہیں کر سکتی



اور انسان کو کوئی ضابطہ حیات ہمایا نہیں کر سکتی۔ مشہور فلسفی بیکن کا کہنا ہے کہ فلسفہ مذہب اور سائنس کی سرحدیں جدا جدا ہیں ان میں خلط مبحث نہیں کرنا چاہیے۔ اور عقل کے حدود متعین کرنے میں زمانہ حال کے نامور فلسفی کانٹ (۱۷۲۴-۱۸۰۴) نے نہایت قابل قدر کام کیا ہے اور ایک ایسا ہی تنقیدی فلسفہ مرتب کر ڈالا ہے جو اس سلسلے میں نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی کتاب کا نام ہی ”تنقید عقل محض“ ہے جو شہرہ آفاق حیثیت رکھتی ہے۔

غرض ان فلسفوں کی تردید و اشاعت اس لیے ممکن ہو سکی کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے دور میں عیسائی مذہب علم و تمدن کا ساتھ دینے اور انھیں فطری طریقوں اور تقاضوں کے مطابق پروان چڑھانے میں قطعاً ناکام رہا، بلکہ اس کے منفی اور مخالفانہ رویہ کے باعث مذہب سے بغاوت اور کنارہ کشی وجود میں آئی، نتیجہ یہ ہوا کہ اہل دانش نے مذہب کو ایک ڈھکوسلہ قرار دے کر اس کا جو اپنے کندھوں سے اتار پھینکا اور معاشرتی، تمدنی اور اجتماعی غرض زندگی کے تمام مسائل میں آزادانہ طور پر غور و خوض کرنے لگے اور ان تمام مسائل و مشکلات کا حل مادی نقطہ نظر سے نکالا جانے لگا۔ یہ ہے ان فلسفوں اور ازموں کے نشو و نما اور عروج پانے کا صحیح پس منظر۔

باقی آئندہ۔

۱۔ ملاحظہ ”تاریخ فلسفہ جدید“ از ڈاکٹر ہیرلڈ ہوفڈنگ، ۲۳۴/۱، مطبوعہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔  
۱۹۳۱ء۔

*Critique of Pure Reason.*

۵

# وحدتِ ادیان کا نظریہ اور اسلام

انما جناب ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ بی۔ ایچ۔ ڈی،

پروفیسر دینیات مسیحتیہ لوجی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

(قسط نمبر ۲)

## وحدتِ ادیان کے تصور کی حقیقت

اب تک ہم نے جو کچھ بیان کیا وہ یہ تھا کہ وحدتِ ادیان کا یہ تصور کہ تمام مذاہب عالم یکساں طور پر حق ہیں اور ان کے اختلافات سطحی اور غیر حقیقی ایک باطل تصور ہے اور انسانیت کے لیے تباہ کن۔ اب ہم یہ بتائیں گے کہ یہ تصور اپنی صحیح شکل میں کیا ہے اور ادیان و مذاہب کی وحدت کا کیا مطلب ہے؟

مذاہب عالم کے مشترک عناصر | اگر ہم مذاہب عالم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ بعض ایسے عناصر ہیں جو مشترک طور پر سارے مذاہبوں میں نہ صرف پائے جاتے رہے ہیں بلکہ جو ان کی بنیاد رہے ہیں اور اپنے غیر منقطع تاریخی تسلسل کی بنا پر عالم انسانیت کا مشترک سرمایہ بن چکے ہیں۔ یہ عناصر اگرچہ مذاہب کے بنیادی اصولوں کی حیثیت سے تاریخ کی ابتداء سے شروع ہو کر اس کے ہر دور میں موجود رہے ہیں تاہم یہ ضرور ہے کہ مختلف انسانی محرکات و عوامل کی بنا پر کبھی ان کی کوہنایت تیز ہو گئی ہے اور کبھی مدہم۔ اس کے ساتھ ان کے ظاہری اثرات و نتائج کی شدت بھی اسی تناسب سے کم زیادہ ہوتی رہی ہے۔ یہ بنیادی عناصر یا اصول حسب ذیل ہیں:

۱۔ انسان مادہ کے علاوہ ایک ربطِ مادہ دار مادہ سے رکھتا ہے | ہر مذہب نے کسی نے نہ کسی شکل میں اس امر کا اثبات کیا ہے کہ انسان صرف اس ظاہری مادی وجود سے عبارت نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ اور بھی ہے۔ مادہ دار مادہ سے اس کا بنیادی ربط ہے۔ انسانی زندگی سے اس مادہ دار ربط کا کبھی انقطاع نہیں ہوتا۔ حیاتِ انسانی اپنی ابتدا میں 'دورانِ حیاتِ دنیوی' اور اس زندگی کے بعد بھی مادہ دار مادہ سے مسلسل ربط رکھتی ہے۔

اس حقیقت کا ادراک کہ انسانی وجود صرف ایک مادی وجود کا نام نہیں بلکہ اس کا انسان ہوتا اس کے مادہ دار مادہ ربط پر موقوف ہے انسان کے اس اخلاقی شعور کو جنم دیتا ہے جو اسے ہر مادی وجودِ جمادات، نباتات اور حیوانات سے نوعی طور پر ممتاز کر کے اسے علیحدہ مخلوق قرار دیتا ہے۔ اس اخلاقی شعور کے مضمرات یہ ہیں کہ انسان اور غیر انسان میں بنیادی اصولی اور نوعی فرق ہے۔ انسان اشرف مخلوقات ہے۔ عالمگیر انسانی اخوت اور مساوات کے تصورات اسی اخلاقی شعور کی کامل تربیت کا براہِ راست نتیجہ ہیں۔

انسان کے مادہ دار مادہ ربط کا کامل ظہور خدا کے عقیدے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور نہ صرف وجودِ خداوندی کے اعتراف بلکہ وحدتِ الہ اور توحیدِ خداوندی کے اقرار کی شکل میں۔ عالمگیر انسانی اخوت و مساوات جو انسان کے اخلاقی شعور کی تربیت کا نتیجہ ہیں ان کی بقا اور قیام توحید کے نظریے کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کے ساتھ انسان کا اپنے اعمالِ خیر و شر کے لیے ذمہ دار ہونا بھی اس کے اخلاقی شعور کا تقاضا ہے۔ ان سب امور کو ایک ساتھ سامنے رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ انسان کے اخلاقی شعور کے مکمل امکانات، اس کا اپنے افعال کے لیے ذمہ دار ہونا، انسانی شرف، اخوت اور مساوات کے ادارے یہ سب اپنے قیام و بقا کے لیے ایک خدا کے عقیدے کے محتاج ہیں، چنانچہ ہر مذہب اس مادہ دار مادہ حقیقت سے شدید ترین ربط کی تلقین کرتا رہا ہے جس پر انسانی امکانات کی کامل ترین تشوینا منحصر ہے اور اگر کسی مذہب نے یہ خلا باقی رکھا بھی تو فطرتِ انسانی نے اس پر قناعت نہ کرتے ہوئے اسے دیگر ذرائع سے پُر کر دیا۔



دشمال کے طور پر بیدھمت میں پایا جانے والا یہ خلا خود بیدھمتی کی پرستش سے پُر کیا گیا۔ یہ مذہب گویا اس طرح بغیر خدا کے کسی مذہب کو چلانے کا ایک ناکام تجربہ ثابت ہوا۔ توحید اور ہستی خداوندی سے ربط یہ چیز ابتدائے تاریخ انسانی سے مذہب کے بنیادی عنصر کی حیثیت سے موجود رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے نقش و نگار کبھی دھندلے اور ماند پڑ گئے اور کبھی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ فگن رہے۔

۲۔ پاکیزگی | روحانی اور جسمانی پاکیزگی کا احساس اور اس کا حصول یہ ہر مذہب میں اساسی طور پر شامل رہا ہے۔ اس احساس پاکیزگی کو انسان میں پیدا کرنا، اسے ترقی دینا اور کمال تک پہنچانا ہر مذہب کا مطمح نظر رہا ہے۔ یہ احساس پاکیزگی داخلی طور پر انسان کو ہر گندے اور باطل تصور، فکر، جذبے اور ارادے سے اور خارجی طور پر ہر ناپاک اور غلط عمل سے باز رکھتا ہے۔ انسانی زندگی طہیات سے آراستہ اور خیانت سے پاک اسی کی بدولت ہوتی ہے۔ مادہ سے انتہائی ربط، انسانی اخلاقی شعور کی مکمل بیداری، خیر سے اتصاف اور شر سے انحراف اسی احساس پاکیزگی کی تکمیل کے بغیر متصور نہیں۔

۳۔ توازن و عدل | انسانی زندگی میں عدل و توازن پیدا کرنا اور اسے قائم و باقی رکھنا بھی ان مشترک اصولوں میں سے ایک ہے۔ اس کا تبادُل فرد کے داخلی شعور سے ہوتی ہے اور اس کے کمال کا اظہار فرد و معاشرے کے تعلقات، انسان اور غیر انسان، نیز ادارہ و مادہ سے روابط میں ہوتا ہے۔ توازن و اعتدال کے اس احساس اور اتصاف کے اس ادارے کو نفس انسانی میں جاگزیں کرنا ہر مذہب کا مطمح نظر رہا ہے۔ اس کے بغیر مذہبی زندگی کی تکمیل کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ فرد کے داخلی احساسات و جذبات کی کشمکش باہم ہر باطن و عقل و خرد کے تقاضوں اور جذبات کی زور آزمائی یا فرد و معاشرے کی پیچ آزمائی، ان مختلف سمتوں میں کھینچنے والی متخالف قوتوں میں عدل و توازن کا قیام مذہب کا خاص فریضہ رہا ہے۔

۴۔ مادیت پر روحانیت کا غلبہ | انسانی وجود کو صرف مادی وجود تسلیم نہ کرتے ہوئے اس کے اندر

ایک غیر مادی عنصر کا اثبات اور اس مادہ عنصر کو مادے کی خراباں روحانی سے نجات دلانے کی کوشش بھی ہر مذہب کا نصب العین رہی ہے۔ یہ اصول ان تمام مذہبی اخلاق کو جنم دیتا ہے جس کا حصول مادیت کے غلبہ اور اس کے زور کو توڑنے پر منحصر ہے۔ ایثار، سخاوت، توکل، صبر، مان، جال اور عزت و جاہ کی محبت کو مضحک کر کے محبت خداوندی کو قلب انسانی میں دیوست کرنا یہ سارے اخلاق اسی کا نتیجہ ہیں۔ مزید برآں یہ اصول انسانی زندگی کو معنویت عطا کرتا ہے اور اس کا مقصد متعین کرتا ہے۔ روحانی ترقیات کے سارے تصورات نیز جزا و سزا کے بارے میں خیالات اسی اصول سے متفرع ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا چہارگانہ اصول یا عناصر اربعہ وہ ہیں جو ہر مذہب کا اولین مقصد رہے ہیں۔ جن کی تجدید، تائید اور درجہ بدرجہ تکمیل کے لیے یا بنیاد مذہب آتے رہے ہیں۔ ہر مذہب کی بنیادی عمارت انھیں اصولوں پر اٹھی ہے۔ انبیاء کی دعوت کے مرکزی نقاط بھی یہ ہیں۔ مذاہب کی غیر منقطع تاریخی جہد مسلسل نے انھیں بالآخر تمام انسانیت کا مشترکہ ورثہ بنا دیا ہے۔ اور یہ عالم انسانیت کا کلمہ سوار بن چکے ہیں۔ کسی خاص فرد، گروہ، قوم یا ملک کی ملکیت نہیں۔ اصول اربعہ کا یہ آمیزہ سارے مذاہب عالم کا نقطہ وصال ہے اور یہ وہ رختہ ہے جو سب کو ایک لڑی میں پر دتا ہے۔ وحدتِ ادیان کا صحیح مطلب اور حقیقی تصویر یہ ہے۔

### صرف اسلام دینِ حق ہے

جیسا بتایا گیا ہر مذہب ان بنیادی حقائق کو لے کر آیا اور جو مذہب بھی انھیں لے کر آیا وہ حق محض تھا۔ وہ چاہے کسی ملک و قوم اور زمانے میں آیا ہو۔ اس کا نام اسلام ہی تھا جس کا حاصل یہی تھا کہ سب سے بڑی مادرائی حقیقت یعنی خدائے واحد سے شدید ترین رابطہ کے نتیجہ میں انسانی اخلاقی شعور کی بیداری، روحانی و جسمانی پاکیزگی کا حصول، توازن و اعتدال کے تقاضوں کا لحاظ اور مادیت کے غلبہ سے نفس انسانی کو نجات دلانا نیز اس دور کے احوال و ظروف کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان سب کی امکانی حد تک تکمیل لیکن ساتھ ہی ان امور کو پیش نظر

رکھنا ضروری ہے کہ :-

- ۱۔ یہ اصول و حقائق اپنی انتہائی مکمل شکل میں انسان کو ایک دم نہیں دیے گئے بلکہ ان اصولوں کا ایک مسلسل سفرِ نسا دگی سے پیچیدگی و پرکاری کی طرف رہا ہے۔ انسان جیسے جیسے ہر اعتبار سے ترقی کرتا گیا اسے یہی اصول کامل سے کامل ترین شکل میں بار بار دیے جاتے رہے، چنانچہ مذہبی ارتقاء کا ہر بعد کا مرحلہ پہلے مرحلے سے کامل تر ہوتا چلا گیا اور پہلا مرحلہ ان اصولوں کے منظر کے بجائے صرف ایک تاریخی دیکھی کی چیز بننا چلا گیا۔
- ۲۔ ان اصولوں کے بارے میں مجموعی انسانی رویہ یہ رہا کہ جہاں وہ بحیثیت مجموعی ان سے آہستہ آہستہ متاثر ہوتا رہا وہاں خود ان اصولوں میں مختلف مصالح کے پیش نظر دو بدل، ترمیم و تنسیخ، اضافہ و کمی کا انسانی عمل بھی مسلسل جاری رہا جس کے نتیجے میں اصل مذہب میں اس طرح کے تغیرات ہو گئے کہ بعض اوقات ان اصولوں کی شکل مسخ ہو گئی اور بعض مرتبہ ان کے مقابلے پر نئے اصول وضع کر لیے گئے۔ لیکن مذاہب کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ ایسی ہستیاں ہر زمانے میں اٹھتی رہیں جو ان اصولوں کو ان کی اصلی، نکھری ہوئی اور بہتر سے بہتر شکل میں پیش کرتی رہیں۔ یہ ہے دین حق کا وہ غیر منقطع تسلسل جو تاریخ میں پوری انسان سے جاری رہا۔ ہر دور میں صرف یہی دین حق تھا اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی تھا وہ انسانی مختراعات اور ذہن انسانی کی کج روایاں۔

قرآن کا ایک طرف یہ دعویٰ ہے کہ اس نے ان اصولوں کو ان کی حقیقی کامل ترین شکل میں پیش کر دیا اور اس طرح وہ اپنے آپ کو دین حق کے اس ارتقاء عمل کا نقطہ عروج کہتا ہے جو تاریخ مذاہب میں ابتدائے آفرینش انسانی سے بغیر کسی انقطاع کے مسلسل بہ رہا تھا اور اپنے آپ کو ان اصول اربعہ کا دارت اور کامل ترین منظر کہتا ہے جو کل انسانیت کا مشترک ورثہ ہیں۔ اور اس طرح اپنا مخاطب ہر انسان کو بناتا ہے اور بلا لحاظ کسی اختلاف کے اس مشترک ورثے کی طرف اسے دعوت دیتا ہے۔ دوسری طرف قرآن کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ



اس کے پیش کردہ دین کے علاوہ روئے زمین پر اب کوئی ایسا مذہب نہیں جو ان اصولوں کو ان کی اصل اندک اعلیٰ ترین شکل میں اپنے اندر محفوظ رکھتا ہو۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں وہ اس امر کو پیش کرتا ہے کہ کوئی ایسا مذہب موجود نہیں جس میں ان اصولوں سے جو انسان کی مذہبی تاریخ کا خسر اور عزیز ترین سرمایہ ہیں، ٹکرائے والے، متضاد و متناقض نظریات، عقائد و اخلاق، اعمال اور ادارے نہ پائے جاتے ہوں۔ اور ان کا وجود ہی اس بات کا قطعی اور یقینی ثبوت ہے کہ انھیں انسانیت کے مشترک مذہبی درجے میں خارجی اور بے میل عناصر کے طور پر زبردستی ٹھونس دیا گیا ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ صرف وہ تعلیمات جو اس نے اسلام کے نام سے پیش کی ہیں ان تضادات و متناقضات سے پاک ہیں، چنانچہ یہی تعلیمات ہیں جو دین حق کا تسلسل، پوری انسانی مذہبی زندگی کا خلاصہ اور اس کا جوہر اور انسانیت کا مشترک سرمایہ ہیں۔ نتیجتاً صرف یہی حق ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ اس مشترک انسانی درجے کا حریف، اس کا مد مقابل اور متجانباً بالی ہے۔ صرف اسلام کل انسانیت کا دین ہے، چنانچہ یہی مطلب ہے اس کا کہ دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین اختیار کرے گا اسے قبول نہ کیا جائے گا؛ اسی کا غلبہ مقصود حق ہے، اس کی وہ سہتی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اسے ہر دین پر غالب کر دے۔

اس نکتے کی وضاحت | اس نکتے کی وضاحت ہم چند مثالوں کے ذریعہ کریں گے:-

ہمارے سامنے اس کی نمایاں ترین مثال شرک کی صورت میں آتی ہے۔ پروردگار عالم کے بجائے یا اس کے ساتھ ساتھ کائنات کے بعض مظاہر یا اشیاء کو خواہ وہ جانور ہو یا پتھر یا انسان یا کوئی اور مخلوق، عقیدت و عبادت کا مرکز بنانا، ایسی چیز ہے جو شرافت انسانی پر براہ راست ضرب ہے۔ انسان اس کائنات کا خدا کے بعد مالک و فرماں روا ہے، شرک اس کو اس عظمت و شرافت سے محروم کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ ادارہ براہ راست ان اصول و رعبے متضاد ہے جو انسانیت کا کلمہ سوار ہیں اور اس کا مشترک اور متفق علیہ سرمایہ۔

کسی کو یہ بات کہنے میں پاک نہیں ہو سکتا کہ یہ ایک ایسا خارجی اور ناقابل ادارہ ہے جو برہستی مذہب میں ٹھونس دیا گیا۔ آج کوئی انسان کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اس بات کی حرات نہیں کرتا کہ شرک کی براہ راست و کالت کرے۔ اس طرح دراصل وہ اپنے مشترک تاریخی مذہبی ورثے سے اس کے متناقض و متضاد ہونے کی بنا پر اسے رد کرتا ہے۔

ذات پات، نسل اور رنگ کی بنا پر صالح و غیر صالح کی تفریق کرتا، اخوت و مساوات انسانی کے مشترک انسانی ورثے کی کمیٹہ نفی کرتا ہے اور انسانی افعال کو خیر و شر کی ذمہ داری سے ماری قرار دیتا ہے۔ اسی طرح تشاخص کا نظریہ انسان اور غیر انسان کے اس جوہر کا فرق کو مٹاتا ہے۔ انسانی شرافت کی بنیاد ہے۔ اور جو اسے اخلاقی شعور بخشتا ہے۔ تثلیث کا عقیدہ جسے توحید کے بدل کے طور پر مذہب میں داخل کر دیا گیا، انسانی شرافت اور اخوت کے بنیادی اصول کی تردید کرتا ہے۔ یہ تصور کہ کسی ہستی نے تمام انسانیت کی طرف سے اس کی تمام لغزخوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے اور وہ عالم کائنات کا نجات دہندہ (Saviour) ہے اس اصول کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے کہ انسان اپنے اعمال خیر و شر کا ذمہ دار ہے۔ رہبانیت اور جوگ اور نفس کشی کے ادارے انسانی زندگی کو توازن سے محروم کر دیتے ہیں۔ خدا کا قائل نہ ہونا جو بدھ مت کی خصوصیت ہے، انسان کے اخلاقی شعور نیز اس کے مادہ و مادہ وجود کو بے معنی قرار دیتا ہے۔ روحانی اخلاقی یا جسمانی نیجاستوں اور خباثتوں کو مذہبی زندگی کا جز سمجھنا یا کم از کم ان سے پرہیز کو ضروری نہ سمجھنا یہ بات احساس پاکیزگی کے اصول کو ملیا میٹ کر دیتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی زندگی کے یہ سارے عناصر مذکورہ بالا اصول اور جسم میں سے کسی نہ کسی اصول یا اس کے براہ راست تقاضوں سے متصادم ہیں اور نتیجہ کے طور پر مشترک انسانی مذہبی ورثے سے خارج اور باطل ہیں۔ سبھی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب وہ خارجی اور بے میل عناصر ہیں جو برہستی مذہب میں ٹھونس دیے گئے ہیں۔

اسلام میں ختم نبوت اسی کا نام ہے کہ قرآنی تعلیمات کے علاوہ، جو اس مشترک انسانی

مذہبی ورثے کا بہترین اور کامل ترین منظر ہے، ہر مذہبی تعلیم چاہے اس سے پہلے کی ہو یا بعد کی، ان اصولوں کی صراطِ مستقیم سے ہٹی ہوئی ہے اور اسے کسی قیمت پر انسان کے اس مشترک اور متفق علیہ مذہبی ورثے میں شامل نہیں کیا جاسکتا، اپنی کامل ترین اور واضح ترین شکل میں یہ صرف قرآنی تعلیم میں ملے گی جس کا نام اسلام ہے۔ اب مذاہب و دین صرف یہی ہے باقی سب مذاہب انسانی مذہبی تاریخ کی کج روایاں (Deviations) ہیں۔ یہ بات صرف دو مثالوں ہی سے واضح ہو سکتی ہے یعنی توحید اور انسانی اعمال کی ذمہ داری اور جزا و سزا کا تصور۔ اسلام کے بعد پیدا ہونے والے مذاہب کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ توحید کی جو کامل اور واضح ترین شکل قرآن نے دی اس میں ان بعد میں پیدا ہونے والے مذاہب نے بعض تاہین و تبدیلیاں کر کے تو اپنا یا مگر اس سے بہتر یا کامل تر تصور کے طور پر کچھ بخش نہیں کیا، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ یہ سب اسی تصور کے دھندلے نقوش اور عکس ہیں اور یہ جس قدر اصل سے قریب ہیں اتنے ہی حق سے زیادہ قریب ہیں اور جتنے اس سے دور ہیں اتنے ہی حق سے دور ہیں۔ (ختم شد)

## اردو ادب کی تاریخ، (حصہ اول نظم)

اردو زبان و ادب کی تاریخ اور ارتقاء پر ایک بلند اور معیاری کتاب۔

۱۵۰۰ ق۔ م سے لے کر دورِ حاضر تک تمام لسانی، فکری اور ادبی تحریکوں کا

جائزہ اور ان ادوار کے تقریباً دو سو نامندہ شاعروں کی تخلیقات پر تنقید

و تبصرہ مع نمونہ کلام، کتابت و طباعت پاکیزہ۔ دیریز ٹائٹل صفحہ ۲۲۸۔

قیمت ۱۶/۰ روپے

پتہ: مکتبہ برہان، اردو بازار جامع مسجد، دہلی، ۷



# پاکستان، جنوبی افریقہ اور پیر پاکستان

سعید احمد اکبر آبادی

(۱)

ہیمنہ غالباً مئی یا جون ۱۹۷۷ء کا تھا کہ اسلام آباد سے وزارت قانون کے سکرٹری کا خط ملا جس میں تحریر تھا "پاکستان گورنمنٹ نے ہجری صدی تقریبات کے سلسلہ میں ایک بین الاقوامی سیمینار "دنیا کی تہذیب و تمدن کی ترقی میں اسلام کا حصہ" کے موضوع پر دسمبر کے ماہ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے، عنوانات مباحث کی ایک فہرست منسلک ہے، آپ سے درخواست ہے کہ ان عنوانات میں سے کسی دو پر آپ مقالے لکھیں، ستمبر تک یہ مقالے مل جانے چاہئیں" میں نے دعوت منظور کر لی اور اسلام میں علم کا تصور اور اس کی اہمیت، اور اسلام اور خواتین کے دو موضوعات پر مقالے لکھنے کا وعدہ کر لیا۔ ارادہ یہ تھا کہ انگریزی میں لکھوں گا۔ وعدہ کر تو لیا۔ لیکن خدا کا حکم! ۱۵ مئی کو میری اہلیہ پرفالچ کا شدید حملہ ہوا، میڈیکل کالج میں داخل کر دی گئیں، دو چھینے تک علاج معالجہ چلتا رہا۔ لیکن جاں بزنہ ہو گئیں اور ۲۴ جولائی کو خدا کو پیاری ہو گئیں۔ اس حادثہ نے میری زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا اور لکھنے پڑھنے کا نظام درہم و برہم ہو کر رہ گیا، تاہم وعدہ کا ایفا ضروری تھا، جس طرح بن پڑا "علم" پر ایک مقالہ اردو میں لکھ کر تیار کر لیا اور ۲۴ ستمبر کو میری ایک بچی ہوائی جہاز سے کراچی واپس جا رہی تھی اس کے ہاتھ مقالہ روانہ کر دیا۔ ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد اسلام آباد سے مقالہ کی رسید آئی اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی کہ اب کانفرنس دسمبر کے بجائے جنوری ۱۹۷۸ء میں ہوگی، پھر یہ خبر ملی کہ جنوری میں بھی نہ ہوگی، مارج

میں ہونے کا امکان ہے۔

۲۰۔ ۲۳ فروری تک حیدرآباد میں جماعت اسلامی کی چھٹی آل انڈیا کانفرنس تھی اور پھر ۲۴ و ۲۵ کو دارالعلوم حیدرآباد کی طرف سے دینی تعلیم اور مدارس کے نظم و نسق پر ایک آل انڈیا سیمینار تھا۔ یہ دونوں اجتماعات نہایت عظیم الشان اور اپنے اداروں کی شہرت و عظمت کے شایان شان تھے۔ میں ان میں شرکت کا وعدہ کر چکا تھا اور یوں بھی حیدرآباد کی سوسائٹی، یہاں کا کلچر اور تہذیب و ثقافت جو اچھے ہوئے گلشن میں باد بہاری کی ایک تازہ لہر اور موج نو ہے، مجھے اس درجہ پسند اور مرغوب ہے کہ وہاں جانے کا بہانہ ڈھونڈتا ہوں اور وہاں کی علمی و ادبی مجلسوں میں وقت گزار کر دل و دماغ کی سیر و تفریح کا سامان کر لیتا ہوں، بہر حال ان اجتماعات سے فارغ ہو کر ہوائی جہاز کے ذریعہ (جس کا انتظام دارالعلوم حیدرآباد نے کیا تھا) ۲۷ فروری کو علی گڑھ پہنچا تو ڈاک میں پاکستان گورنمنٹ کا ایک خط بھی ملا کہ: ”محوزہ کانفرنس اسلام آباد میں ۷ سے ۱۰ مارچ تک منعقد ہوگی، آپ اس میں شریک ہوں“ اس کے بعد دوسرے دن یعنی ۲۸ فروری کو نئی دہلی سے افضل محمود صاحب منسٹر پاکستان ایمبیسی کا ٹیلیگرام ملا کہ فوراً مطلع کیجیے کہ آپ پاکستان جا رہے ہیں یا نہیں؟ پہلی مارچ کو اتوار تھا۔ اس لیے میں پیر کے دن ۲ مارچ کو صبح کی ٹرین سے نئی دہلی پہنچا۔ پاکستان سفارت خانہ میں افضل محمود صاحب سے ملا۔ بڑے تپاک اور خوش اخلاقی سے پیش آئے، علمی اور ادبی ذوق کے آدمی ہیں، کچھ دیر اس کے مطابق گفتگو کرتے رہے، اس کے بعد اپنے اسسٹنٹ ظفر صاحب کے حوالہ میرا معاملہ کر دیا، ظفر صاحب نے ویزا کے فارم دیے اور کہا کہ اگرچہ کانفرنس ۷ سے شروع ہے، لیکن آپ کو ایک دن پہلے یعنی ۵ کو اسلام آباد پہنچنا ہوگا۔ کیونکہ ۶ کو P.O.A کی پرمانہ لاہور کے لیے نہیں ہے، مجھے اس میں کیا غدر ہو سکتا تھا۔ ظفر صاحب نے اسی وقت جہاز کے آفس کو فون کر کے میری سیٹ زبردستی یہاں سے روانہ ہو کر میں اردی عربیہ کے سفارتخانہ آیا۔

بعض دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات کی۔ انھوں نے مکلف چائے سے تواضع کی اور عربی مجلات و رسائل اور چند کتابوں کا پیکٹ میرے ساتھ کر دیا، دفتر برہان پہنچ کر مفتی صاحب سے ملا۔ کھانا کھایا، آرام کیا اور شام کی ٹرین سے علی گڑھ واپس آ گیا۔

پاکستان کے لیے روانگی | ۵ رکی صبح کو علی گڑھ سے روانہ ہوا۔ پاکستانی سفارت خانہ پہنچتے پہنچتے گیارہ بج گئے تھے، جہاز کی اڑان ساڑھے تین بجے سب سہریں تھیں اور ابھی کام کئی ایک کرنے کے تھے اس لیے طبیعت متوحش تھی کہ دیکھے کیا ہوا! لیکن گجرات یونیورسٹی احمد آباد کے شعبہ اقتصادیات کے استاد ڈاکٹر جعفر لالی بھی ہمارے ڈپٹی گیشن کے ایک ممبر تھے، وہ ابھی ہوائی جہاز کے ذریعہ احمد آباد سے نئی دہلی پہنچے اور اس وقت پاکستانی سفارت خانہ میں بیٹھے ویزا فارم کی خانہ پڑی کر رہے تھے۔ ان سے میری ملاقات ہوئی تو ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کو اطمینان ہوا۔ میرے کاغذات کی تکمیل ہو چکی تھی، لیکن معیت کے خیال سے میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ جب ڈاکٹر جعفر لالی کے کاغذات کی بھی تکمیل ہو گئی اور انھیں ویزا مل گیا تو اس وقت بارہ بجے تھے اور ابھی ہم کو امیگریشن سرٹیفکیٹ بھی لینا تھا۔ اس لیے وہاں دو ماں سفارت خانہ سے باہر آئے، ایک اسکوٹر پکڑا اور شاستری بھون پہنچے یہاں پاسپورٹ آفس میں داخل ہوئے تو مردوں اور عورتوں کا ہجوم بے پناہ دیکھتے ہی اوسان خطا ہو گئے، اس دفتر میں میرے ایک شاگرد افسر ہیں ان کو تلاش کیا تو پتہ چلا کہ ان کا تبادلہ ہو گیا ہے، بہر حال ہم دونوں نے امیگریشن سرٹیفکیٹ کے فارموں کی خانہ پڑی کی اور انھیں داخل دفتر کر کے کیوں کھڑے ہو گئے، ایک بجے ہماری باری آئی۔ اب ہم نے شاستری بھون سے پھر ایک اسکوٹر پکڑا اور ٹکٹ لینے کی غرض سے P. J. A. کے دفتر پہنچے، وہ لوگ ہمارا انتظار کر ہی رہے تھے اور تاخیر ہو جانے سے پریشان تھے، بہر حال انھوں نے ٹکٹ بنانے شروع کیے، میرا سامان دفتر برہان میں تھا اس لیے میں ڈاکٹر لالی کو وہاں چھوڑ کر اسی اسکوٹر میں دفتر آیا اور اپنا سامان لے کر فوراً واپس ہو گیا۔ اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ دو تھے حلق میں ڈالوں۔ پی، آئی، اے، کے



دفتر پہنچا تو ٹکٹ تیار تھے۔ اب پونے دو بج چکے تھے اور دو بجے ہم کو ایرپورٹ پر رپورٹ کرنی تھی۔ اب دفتر سے سیدھے پالم کو ہی ہم دونوں روانہ ہوئے اور وقت پر پہنچ گئے۔ سب کام جو سفر پاکستان کے لیے ضروری تھے پورے ہو گئے تھے۔ البتہ میرا اپنا ایک اور ضروری کام نہیں ہو سکا اور وہ یہ تھا کہ ۳۰ مارچ سے ۲ اپریل تک خرطوم (سوڈان) میں ایک کانفرنس (الدعوة الى سلامة صيغة) کے موضوع پر ہونے والی تھی۔ مجھ کو اس میں شرکت کی دعوت ملی تھی جو میں نے منظور کر لی تھی، اور کانفرنس کے لیے ان لوگوں کی فرمائش کے مطابق ایک طویل مقالہ انگریزی میں ”ہندوستان میں اسلام کا مستقبل“ کے موضوع پر لکھ کر خرطوم روانہ کر بھی چکا تھا۔ اب خیال تھا کہ نئی دہلی میں سفارت خانہ سے سوڈان کا ویزا بھی لے لوں گا تاکہ پاکستان سے ہی سیدہ دہاں چلا جاؤں، افسوس ہے وقت کی تنگی کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا اور چونکہ پاکستان میں دن زیادہ لگ گئے اس لیے سوڈان کا سفر بھی نہ سکا، البتہ میرا مقالہ کانفرنس کی کارروائی میں شامل ہو گیا۔

اب ہم دونوں ایرپورٹ میں داخل ہوئے اور ڈاکٹر جعفر لالی نے جہاز میں بیٹھے (Embarkation) کی سوریہ پیر فیس ادا کرنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سوریہ کانوٹ غائب تھا۔ کسی نے نکال لیا یا گر گیا، ڈاکٹر صاحب کا چہرہ فق ہو گیا کہ فیس کہاں سے دیں گے، میرے پاس روپے موجود تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی نذر کیے، ان کی جان میں جان آئی۔ کہنے لگے: یہ روپیہ قرض ہے میں آپ کو پاکستان پہنچ کر ادا کر دوں گا۔ میں نے کہا: ہرگز نہیں، قرض نہیں بلکہ آپ کی نذر ہے۔

بہر حال کسٹم وغیرہ سے فراغت کے بعد ہم دونوں لاڈیج میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سید صباح الدین عبدالرحمن (اعظم گڑھ) ڈاکٹر ثناء احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی) سید اوصاف علی (انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی) اور ڈاکٹر عبد المعز منظر دہاں پہلے سے موجود تھے، سب اپنے جانے پہچانے اور بے تکلف دوست تھے، البتہ

منظر صاحب سے ملاقات پہلی مرتبہ ہوئی، معلوم ہوا کہ ٹپنہ کالج بہار میں اقتصادیات کے استاد ہیں اور ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا ان کا یہ پہلا موقع ہے، اس بنا پر کسی قدر گھبراہٹ محسوس کر رہے تھے، اب ہم کو دیکھا تو ان کو سکون ہوا اور ہم نے بھی ان کو جلد بے تکلف بنایا۔

۱۳ اور چار بجے کے درمیان جہاز رٹا، اور ۵۴ منٹ میں لاہور پہنچا دیا۔ یہاں اسلام آباد کے لیے جہاز تبدیل کرنا تھا۔ میں نے لاہور ٹیلیگرام دے دیا تھا، دریں بھی، خجارت میں خرچہ پگھی تھی کہ انڈین ڈی اگیشن آج پہنچ رہا ہے اس لیے میاں اسلام آباد و فیصلہ محمد اسلام پنجاہ یونیورسٹی لاہور بچوں کے ساتھ موجود تھے، لیکن چونکہ ایک پاکستانی طیارہ کے اغوا کا واقعہ چند روز پہلے ہی ہو چکا تھا اس لیے جگہ جگہ پر اس کا ردک ٹوک تانت بھی اور مسافروں کو غیر مسافروں سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ میاں اسلام آباد بہت سے لوگ، سب گیسٹ کے باہر کھڑے ہوئے تھے، اب اسلام آباد جانے والے جہاز میں بیٹھنے کے لیے ہمیں جس لاؤنچ میں انتظار کرنا تھا اس کی طرف جانے کے لیے ہم کو اسی گیٹ کے سامنے سے گزرتا پڑا اور بچوں کی نگاہ مجھ پر پڑی تو ٹانا، ٹانا، کہتے ہوئے وہ اور میاں اسلام میری طرف لپکے اور میں انھیں دیکھ کر ٹھٹھک کے گیٹ پر آگیا، لیکن گیٹ بند تھا اور اس پر پہرہ دار بھی موجود تھا۔ رداردی میں میاں اسلام صرف یہ کہہ سکے کہ ہمارا خیال تو یہ تھا کہ آپ کانفرنس سے ایک دن پہلے آرہے ہیں تو آج لاہور میں قیام کریں گے اور کل شام میں اور آپ دونوں اسلام آباد چلیں گے، اس خیال کی دیر سے ریحانہ یہاں نہیں آئی ہیں اور گھر پر آپ کے لیے چائے لیے بیٹھی ہوں گی“ میں نے کہا: ہم لوگ یہاں ٹرانزٹ پر ہیں کہیں آنے جانے کا سوال ہی نہیں! بس اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ گیٹ کے پہرہ دار نے خوش اخلاقی سے کہا: چلیے، تشریف لے چلیے“ میں سمجھ گیا کہ بات کو ابھی ممنوع نہیں تو نا پسندیدہ ضرور ہے، اس لیے میں آگے بڑھ گیا۔

اسلام آباد میں لاہور میں ہم نے عسکر کی اور اس کے بعد مغرب کی بھی نماز پڑھی، ۱۴ پر جہاز رٹا اور آٹھ بجے راولپنڈی ایرپورٹ پہنچ گئی، یہاں کانفرنس کی استقامت ایہ کمیٹی کی طرف سے دو

حضرات موجود تھے، ایمر پورٹ کی رسمی کارروائی کے بعد تین بڑی کارروائیوں میں ہم لوگ روانہ ہوئے اور اسلام آباد ہوٹل میں مقیم ہوئے، میرے کمرہ کا نمبر ۵۶ تھا۔ منظر صاحب میرے پڑوس میں تھے اور باقی سب احباب اوپر کی منزلوں میں کوئی کہیں اور کوئی کہیں تھا۔ یہ ہوٹل پنج کوکبی (یعنی Five Star) ہے اس لیے یہ بتانا فضول ہے کہ کمرے کیسے رکھتے آراستہ، پیرستھے! احباب کی آمد ابھی میں استقبالہ (Reception) میں کھڑا کمرہ پر قبضہ کرنے کی رسمی کارروائی کر رہی رہا تھا کہ محب قدیم و صمیم پروفیسر عبدالواحد ہالی پوتہ، ڈاکٹر کٹر، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ڈاکٹر منیر احمد مغل (رہنما) مولانا طاہر السورتی، مسٹر محمود احمد غازی اور ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی تشریف لے آئے۔ ایک مدت کے بعد ان احباب سے ملاقات کر کے اور یہ محسوس کر کے ہم لوگوں کے ہوٹل پہنچے ہی یہ احباب ازراہ کرم داخل تشریف لے آئے قلبی اور روحانی مسرت ہوئی، لیکن میں ان حضرات سے پندرہ منٹ کی اجازت لے کر اپنے کمرہ میں گیا، سامان ایک جگہ رکھوایا، ہنہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور اب چونکہ ڈنر کا وقت بھی ہو گیا تھا اور دوپہر کا کھانا نہ کھانے کی وجہ سے اشتہا بھی شدید تھی اس لیے میں احباب کو لے کر ڈائننگ ہال میں آیا اور کھانے کا آرڈر دیا۔ اس وقت ڈاکٹر نثار احمد فاروقی بھی اپنے کمرہ سے آگئے اور شریک طعام ہوئے، کھانے کے درمیان گفتگو ہوتی رہی، اس وقت جو احباب جمع تھے ان میں صرف ایک ڈاکٹر منیر احمد مغل ایسے تھے جن سے میں پہلے سے واقف نہیں تھا۔ پروفیسر ہالی پوتہ انھیں ساتھ لائے تھے انھوں نے موصوف کے تعارف میں فرمایا: ”یہ جج ہیں لیکن بہترین علمی صلاحیتوں کے مالک ہیں، انھوں نے پروفیسر ہالی پوتہ کی تحریر کی موت نے عبد اللہ سندھی پر انگریزی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر لی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔“ آج کل مولانا کی تفسیر کو اپنی تحقیق اور حراشی کے ساتھ بڑی محنت سے اوٹ کر رہے اور اس کا انگریزی اور اردو ایڈیشن مع ایک طویل مقدمہ کے مرتب کر رہے ہیں۔



مولانا عبید اللہ سندھی پر میری کتاب | اس موقع پر یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ مولانا عبید اللہ اور سندھ میں اس کی مقبولیت سندھی کو خاص سندھ میں عظمت و تقدس کا جو مقام رفیع حاصل ہے وہ عہد حاضر کی کسی شخصیت کو حاصل نہیں ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا اس کے مستحق تھے بھی، مولانا کے ساتھ اس تعلق کا ہی نتیجہ ہے کہ سندھ کے علماء اور دیگر ارباب علم و ادب میری کتاب پہ "مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد" کو بہت عزیز رکھتے اور اس کی وجہ سے کتاب کے مصنف سے محبت کرتے ہیں، چنانچہ پروفیسر عالی پوتہ کو خاکسار راقم الحروف کے ساتھ جو قلبی تعلق اور محبت ہے اس میں بڑا دخل اُن کے سندھی ہونے کو بھی ہے، اور اس محبت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ میں نے ہوٹل میں قدم رکھا ہی تھا کہ ڈاکٹر مغل کے ساتھ تشریف لے آئے اور دیر تک قیام فرما رہے۔

۱۔ اس کتاب کی تالیف کو چھتیس برس گزر گئے، نئی نسل کو اس کے سبب تالیف کا کیا علم ہوگا۔ اس لیے مختصر عرض یہ ہے کہ میں نے برہان میں ہزاروں صفحات لکھے ہیں، لیکن میرے دو مضمون ایسے چھپے ہیں جنہوں نے برصغیر کے علمی اور ادبی حلقوں میں دھوم مچادی اور سخت ہیجان و بحران کی کیفیت پیدا کر دی: (۱) مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد اور (۲) جامع المجددین مرتبہ مولانا عبد الباقی ندوی پر تبصرہ۔ اول الذکر مقالہ لکھنے کی تقریب یہ ہوئی کہ مولانا عبید اللہ سندھی کے انتقال کے بعد معارف اعظم گڑھ میں مولوی مسعود عالم ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں مضمون نگار نے مولانا پر اتحاد و زندہ کا الزام لگایا تھا۔ میں نے یہ مضمون پڑھا تو سخت طیش کے عالم میں اسی وقت اس کا جواب لکھنے بیٹھ گیا جو سات قسطوں میں شائع ہوا۔ اس مقالہ نے ملک میں دھوم مچادی اور دفتر برہان میں خطوں کا انبار لگ گیا، انہیں دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک دن ایک پارٹی میں میں کسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے بڑے زور سے "وہ مارا" "وہ مارا" کہتے ہوئے پیچھے سے میرے دھپ مارا۔ میں نے حیرت دیکھا تو بابائے اردو مولوی عبدالحق تھے۔ (باقی صفحہ ۴۵ پر)

یہ تو تھے پروفیسر ہانی پوتہ اور ڈاکٹر مغل، ان کے علاوہ باقی تینوں حضرات ادارہ تحقیقات اسلامی جو پاکستان گورنمنٹ کا بڑا نامور اور مشہور ادارہ ہے اُس سے متعلق میں مولانا السورتی جو عربی زبان و ادب کے نامور محقق اور ادیب مولانا محمد السورتی کے فرزند ارجمند اور علم و فضل میں الولد ستر لابیہ کے مصداق ہیں اس ادارہ میں ریڈر اور غازی اور اصلاحی صاحبان اس میں فیلو

(بقیہ جانشیہ ص ۳۳) میں کھڑا ہو گیا اور پوچھا: مولانا آپ کیا فرما رہے ہیں! کس نے مارا اور کس کو مارا؟ میں سمجھ نہیں سکا، مولانا کڑک کر بولے: ارے میاں! وہی تمہارا مضمون جو برہان میں نکل رہا ہے، میں نے عرض کیا: ”حضرت! آپ یہ کیا فرماتے ہیں، مجھے تو اطلاعات مل رہی ہیں کہ اس مضمون کا جواب دارالمصنفین اعظم گڑھ ندوۃ العلماء لکھنؤ، دفتر ترجمان القرآن، پٹھان کوٹ اور جامعہ دارالسلام، عمر آباد میں لکھا جا رہا ہے اور مضمون کے ختم ہوتے ہی چاروں طرف سے مجھ پر یورش ہوگی۔“ مولانا نے بڑے زور سے کہا: غلط اور بالکل غلط، تمہارا مضمون لا جواب ہے، میں یقین دلاتا ہوں کہ ایک شخص بھی اس کے جواب میں نہیں لکھ سکے گا، ہوا تو واقعی یہی کہ کہیں سے کوئی تحریر جواب میں شائع نہیں ہوئی، لیکن علماء میں بحران بہت زیادہ پیدا ہوا، یہاں تک کہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم، مولانا صبغة اللہ بختیاری مدراس اور چند علماء نے اس مضمون کے خلاف سخت احتجاجی خطوط مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کر لکھے، اور ان خطوط سے متاثر ہو کر ایک مرتبہ مولانا حفظ الرحمن صاحب نے ناراضگی کے لہجہ میں فرمایا کہ ”بھئی! تم غریب مسعود عالم کا قصور بھی معاف کر دے گے بھی یا نہیں، بہت لکھ چکے، اب ختم کر دے“ میں نے جواب دیا: میں ہرگز ختم نہیں کروں گا۔ جب تک چور کو اس کے گھر نہیں پہنچا دوں گا دم نہ لوں گا، ہاں البتہ میری تحریر میں کوئی بات غلط اور بغیر حوالہ کے ہے تو اس کی نشان دہی ضرور کیجیے۔ میں اس پر غور کروں گا اور پھر میری بات غلط ثابت ہوئی تو میں اس سے رجوع کر لوں گا، مولانا نے یہ سنا اور مسکرائے لگے۔

ہیں ان تینوں حضرات سے میرا تعلق پہلے سے ہے، کھانے سے فراغت کے بعد ہم سب چہل قدمی کی غرض سے ہوٹل سے باہر چلے گئے، ایک دکان پر مولانا السورتی نے پانوں سے تواضع کی، اس سے فراغت کے بعد ہم ہوٹل واپس آئے تو میں نے اجاب سے اجازت لی اور کمرہ میں آکر عشا کی نماز پڑھی، حسبِ مول مطالعہ کیا اور سو گیا، پروردن دھڑ دھوپ میں گذرا تھا اس لیے نیند بہت اچھی آئی اور روز گزشتہ کی سب تھکن دور ہو گئی۔

دوسرے دن تماشہ سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرہ سے باہر نکلا تو اس استقبال (Reception) کے سامنے پروفیسر منظور احمد، صدر شعبہ فلسفہ کراچی یونیورسٹی اور پروفیسر خورشید احمد (ماہر اقتصادیات) مل گئے۔ دونوں سے دیرینہ تعلق ہے، بڑے تپاک سے ملے، خیریت طلبی اور مزاج پرسی کے بعد پروفیسر منظور احمد جو کالفرنس کی آرگنائزنگ کمیٹی کے بڑے فعال اور ممتاز ممبر بھی ہیں، فرمایا: کل کالفرنس شروع ہو رہی ہے، اس کی ایک کمیٹی کے دو چار جلسہ کی صدارت آپ کو کرنی ہے، ہم نے باامید منتظر رہی پر دو گرام میں آپ کا نام درج کر دیا ہے، امید ہے آپ کو اعتراض نہ ہوگا۔ میں نے پر دو گرام کمیٹی کا شکریہ ادا کیا اور کہا: مجھے تعمیل ارشاد میں کیا عذر ہو سکتا ہے، ”سر تسلیم خم ہے جو مزاج یا میں آئے“ اس کے بعد میں نے پروفیسر خورشید احمد سے کہا: آپ اور ڈاکٹر ظفر اسحق انصاری (سعودی عرب) دونوں نے ملی کر کتاب ”مدرسہ ابوالاعلیٰ مودودی (Islamic Perspicution) جو اسلامک فاؤنڈیشن لندن کی طرف سے شائع ہوئی ہے اڈٹ کی ہے، میں نے اس کتاب پر ”اسلامک کلچر، حیدرآباد“ کے لیے ریویو لکھا ہے جو اپریل ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں طبع ہوگا۔ مگر اسلامک کلچر والے ستم یہ کرتے ہیں کہ کتاب تبصرہ نگار کے پاس نہیں چھوڑتے، واپس منگوا لیتے ہیں، چنانچہ میں نے کتاب واپس کر دی۔ اب آپ ہی ازراہ کرم کتاب کا ایک نسخہ میری لائبریری کے لیے دے دیجیے۔“ پروفیسر خورشید صاحب نے کہا: ضرور ابھی لیجیے اور کھوڑی دیر کے بعد کتاب اپنے دستخط کے ساتھ میرے کمرہ میں پہنچی دی، ابھی میں ان حضرات سے گفتگو کر رہی رہا تھا کہ جناب اے۔ کے بروہی



وزیر قانون جو کالفرنس کی تنظیمی کمیٹی کے حیرین بھی ہیں تشریف لے گئے، نہایت ناشائستہ اور اعلیٰ ذوق علمی و ادبی کے انسان ہیں، ان سے ملاقات کر کے ہمیشہ طبیعت مسرور ہوتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد مولانا السورتی اور اصلا حی صاحب آگئے، ان کے ساتھ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اور ایک کار میں بیٹھ کر شہر کی سیر کر گئے۔ جمعہ کے دن یہاں ایک بازار لگتا ہے جو جمعہ بازار کہلاتا ہے، اس کو عرب کے سوق عکاظ کا ایک نمونہ کہنا چاہیے کیونکہ اس بازار میں بدادت کا رنگ غالب ہوتا ہے، ہر قسم کی چیزیں با فراط اور نسبتاً سستی ملتی ہیں، مرد اور خواتین سب، باستثنائے چند سادہ شلو اور قمیص میں ملبوس مگر نہایت تندرست اور تہمند، سرخ و سپید اور چہت! اس منظر کو دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر بعض عمارتیں دیکھیں، ہوٹل واپس آ کر قریب ہی وسیع انداز کا شاہ مرکزی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ اب چونکہ کل سے کالفرنس شروع ہے اس لیے مندوبین کی آمد شروع ہو گئی ہے اور ہوٹل میں بڑی گھاگھی اور چہل پہل سے آنے والوں میں میرے لیے بہت سے چہرے نئے ہیں لیکن چند اجاب وہ بھی ہیں جن سے دیرینہ تعارف ہے۔ یہاں معلوم ہوا کہ ہندوستان سے آنے والوں میں ہم چھ افراد کے علاوہ چند اور اصحاب بھی تھے جو پشتاور کے ایک سیمینار میں بھی مدعو تھے اور اس سے فارغ ہو کر اب اسلام آباد پہنچے تھے۔ ان حضرات کے نام یہ ہیں: (۱) ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈلیسانی ڈاکٹر محکمہ آثار قدیمہ ناگپور، (۲) ڈاکٹر ایس۔ ایم انصاری، شعبہ طبیعیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، (۳) ڈاکٹر اوصاف احمد شعبہ اقتصادیات جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور ہاں! ہمارے دیرینہ دوست ڈاکٹر برکات احمد بھی پہلے سے وہاں موجود تھے، وہ بھی شریک ہونے اس طرح ہندوستان کے مندوبین کی تعداد عشرت کا کاملہ ہو جاتی ہے، ہندوستان سے پانچ چھ اور حضرات مدعو تھے جن کے نام مندوبین کی فہرست میں درج تھے لیکن وہ شریک نہیں ہو سکے، ہاکت ان کو شامل کر کے کل ۳۲ ملکوں کے نمائندے، شریک کالفرنس ہو گئے جن میں ایک سو پندرہ نمائندے پاکستان کے تھے اور ۸۸ ممالک غیر کے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ممالک غیر کے مندوبین میں سب سے بڑی تعداد انڈیا کے مندوبین کی تھی،

اور عالمِ اسلامی بین الاقوامی کانفرنسوں کے خلاف خواتین کی تعداد بھی کافی تھی، قیام کا انتظام دو جگہ تھا، ممالک غیر کے مندوبین اسلام آباد ہوٹل میں اور پاکستان کے مندوبین راولپنڈی کے انٹرنیشنل ہسٹل ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے، میاں اسلم جو پاکستان کے مندوب آج شام کو ہی لاہور آئے تھے، مگر مؤخر الذکر ہوٹل میں مقیم تھے۔ میں اپنے ہوٹل میں ان کا منتظر رہا۔ صبح جب ملاقات ہوئی تو حقیقت حال کا علم ہوا، آج شام کو مغرب کے بعد پروفیسر ہالی پوتہ پھر آئے مگر اس وقت ان کے ساتھ بیگم بھی تھیں جو سندھ کے ایک زمانہ کالج میں اسلامیات کی پروفیسر ہیں اور کانفرنس میں مندوب بھی ہیں، تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر منیر احمد مغل آ گئے، مولانا عبید اللہ سندھی کی تفسیر قرآن کا انہوں نے جو انگریزی ترجمہ اپنی شرح اور حواشی کے ساتھ کیا ہے، اس کی دو بھاری بھاری ضخیم جلدیں اپنے ساتھ لیتے آئے تھے، پروفیسر ہالی پوتہ اور ڈاکٹر مغل دونوں کا اصرار تھا کہ میں ان جلدوں کو پڑھ لوں اور ان کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر دوں، یہ حضرات اگر اصرار نہ کرتے تب بھی دل کا تقاضا تھا کہ میں انہیں انا دل تا آخر غور اد توجہ سے پڑھوں۔ لیکن کانفرنسوں کا عالم یہ ہوتا ہے کہ ”فرصت کہاں کر تیری تمنا کرے کوئی“ کیونکہ مقالات کی تعداد تین چار نشستوں کے علاوہ، لیچ، ڈیز اور عصرانہ اور دوسرے ضمنی پروگراموں کی مصروفیتیں بھی تو ہوتی ہیں جو کسی اور کام کا نہیں رکھتیں، تاہم کتاب اہم اد میری خاص دلچسپی کی تھی اس لیے میں طرہ میں پڑا کتاب کا فاضلانہ مقدمہ اور شروع کے سو صفحات تو مسلسل پڑھے اور اس کے بعد کتاب کو الٹ پلٹ کر ادھر ادھر سے دیکھا اور اس سے بڑی مسرت ہوئی۔

مسرت کی اصل وجہ دیکھیں: (۱) ایک یہ کہ باہم علم و فضل و کمال و دقت نظر مولانا عبید اللہ سندھی میں ایک نقص یہ تھا کہ وہ تقریر و تحریر پر قدرت تامہ نہیں رکھتے تھے اور اس بنا پر تقریریں زیادہ اور تحریریں ان کی زبان اور قلم سے بعض اوقات ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جو ان کی نسبت غلط فہمی کا باعث ہو سکتی تھیں اور ارباب غرض ان سے فائدہ اٹھاتے تھے، خود مولانا کو اس کا شدید احساس تھا۔ چنانچہ جب وہ دہلی میں مقیم تھے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں رہتے تھے، ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا:



افسوس ہے کہ میں اپنے مافی الضمیر کو کما حقہ، ادا کرنے پر قادر نہیں ہوں اس لیے لوگ اپنی استعداد اور ذوق کے مطابق میری باتیں کچھ سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں سمجھتے اور کچھ انہیں اپنے طریقہ پر بیان کرتے ہیں جس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، اس کے بعد ارشاد ہوا: بس ایک ہی حل میری سمجھ میں آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم سبقاً سبقاً حجۃ اللہ البالغہؑ مجھ سے پڑھ لو اور ہر سبق کی تقریر کو قلمبند کر کے دوسرے دن مجھے دکھا دو، مجھ کو تمہاری فہم اور قلم دونوں پر اعتماد ہے، یہ کام مکمل ہو جائے گا تو میں بڑی خوشی سے اعلان کر سکوں گا کہ میرے افکار و نظریات کے بارہ میں صرف اس کتاب پر اعتماد کیا جائے، میری خوش قسمتی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی تھی کہ خود مولانا مجھ کو درس حجۃ اللہ البالغہؑ کی خواہش کریں اور ساتھ ہی اپنی ترجمانی کا شرف بھی عطا فرمائیں۔ میں نے فوراً ہامی بھر لی، مگر مشکل یہ تھی کہ مولانا جامعہ میں رہتے تھے اور میں شیدی پورہ (قرولباغ) میں، اور دونوں میں ۸ یا ۹ میل کی مسافت حائل تھی، مولانا نے تجویز کی کہ مسجد فتح پوری میں ایک کمرہ کا انتظام کر لیا جائے ہفتہ میں تین مرتبہ مولانا جامعہ سے وہاں پہنچیں گے اور میں شیدی پورہ سے مغرب سے عشاء تک درس ہو گا اور اس کے بعد مولانا شب یہیں بسر کریں گے، میں نے ہر چند عرض کیا: حضرت! آپ زحمت نہ کریں، میں خود جامعہ حاضر ہو جایا کروں گا، مگر مولانا نے مانے، فرمایا: اگر تمہیں کبھی بس نہ ملی تو اہل خانہ پریشان ہوں گے، اللہ اکبر! عالم اسلام کے اس ضعیف العمر مرد مجاہد کا ولولہ فیض رسانی اور اس کے لیے عزم جفا کشی! بہر حال یہ طے ہو گیا کہ درس مسجد فتح پوری کے ایک کمرہ میں ہو گا، لیکن پروگرام شروع ہونے والا تھا ہی کہ صاحبزادی کی علالت کی خبر آئی اور مولانا لاہور چلے گئے اور کچھ دہلی نہ آ سکے، کچھ دنوں کے بعد انتقال ہو گیا، اور ”مادر چہ خیالیم و فلک در چہ خیال“ یہ حسرت دل کی دل میں رہ گئی، تو اب ڈاکٹر مغل کی کتاب دیکھ کر بڑی خوشی اس سے ہوئی کہ مولانا جو کام مجھ سے لینا چاہتے تھے وہ ڈاکٹر مغل کے ذریعہ بحسن و خوبی ایک بڑی حد تک انجام پذیر ہو گیا۔

(۲) اہل دوسری خوشی کتاب کے اس مسودہ کو دیکھ کر اس بات سے ہوئی کہ بعض حلقوں میں



مولانا کی نسبت جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ دور ہو جائیں گی، مثلاً مولانا کی نسبت ایک عام خیال ہے کہ وہ کمیونسٹ تھے۔ اس کتاب سے اس کی خاطر خواہ تردید ہوتی ہے، کیونکہ مولانا نے تفسیر میں کمیونزم پر سخت تنقید کی ہے اور اسے شرک کی ایک قسم قرار دیا ہے۔

اب کل سے کانفرنس شروع ہے، آج شب میں ہم لوگوں کو کانفرنس کے سلسلہ کا لٹریچر مقالات کی آٹھ جلدیں جن میں سے دو اردو کے مقالات کی ہیں اور باقی چھ انگریزی مقالات، اور ایک اعلیٰ قسم کا ایچی کیس وغیرہ یہ سب چیزیں مندوبین کے کمروں پر پہنچا دی گئیں۔ ابھی چند روز پہلے ہائی جیکنگ کا واقعہ پیش آچکا تھا اس لیے خصوصاً سکورٹی انتظامات بہت وسیع اور سخت ہیں۔ ہوٹل اور اس کے ارد گرد جگہ جگہ پولیس تعینات ہے اور خفیہ پولیس کے لوگ بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں، ہوٹل میں آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے۔ مندوبین کو یہ ہدایت ہے کہ ہوٹل سے باہر زیادہ دور تک پیدل نہ جائیں، ہر مندوب کے لیے ضروری ہے کہ اپنے رنگین نوٹو کے ساتھ (جس کا انتظام ہوٹل میں موجود ہے) بیج بروقت لگائے رکھے ورنہ اس کے بغیر وہ کانفرنس ہال میں داخل نہ ہو سکے گا۔ (باقی آئندہ)

# اردو عربی ڈکشنری

مؤلف مصباح اللغات

جناب ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ صاحب بیاضی کی دوسری کاوش۔ اردو داں طلبہ و اساتذہ کے لیے اس کی شدید ضرورت تھی۔ موصوف نے یہ کتاب تالیف کر کے یہ ضرورت پوری کر دی۔ تقطیع خورد ۴۰۰/۱۶ قیمت مجلد - /۱۰ روپے۔

صلیٰ کا پتہ:  
مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد دہلی

# دشوا بھارتی یونیورسٹی کے

## فارسی، عربی اور اردو مخطوطات

عبدالوہاب صاحب بدرستی، سنٹرل لائبریری، دشوا بھارتی یونیورسٹی شانتی نیکیتی  
(دہلی بنگال)

کیا پ فارسی مخطوطات  
(۳)

۲۔ مدد محالت (مثنوی) مترجم بفارسی شیخ نور محمد۔ صفحات ۶۰، کتابت خوشخط، کاتب  
محمد رفیع، سال کتابت ۱۲۹۹ جلوس بادشاہ محمد شاہ غازی درصوبہ داری نواب علی وردی خان  
(موتی ۱۱۶۴ھ)

مثنوی مذکور کے درمیانی تقریباً چار صفحات ناقص ہیں۔ لیکن اس نقص کے باوجود نسخہ بہتر  
حالت میں ہے۔ یہ نسخہ ہندوستان میں صرف دو جگہوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک دشوا بھارتی  
یونیورسٹی اور دوسرا کلکتہ کی نیشنل لائبریری کے بورا کلیکشن میں۔

اصل میں یہ مثنوی شیخ منجھن کی ایک منظوم ہندی (راودھی) عشقیہ داستان کا منظوم فارسی  
ترجمہ ہے جیسا کہ مترجم شیخ نور محمد نے لکھا ہے :

چناں اندیشہ برمن گشت روشنی  
بگویم فارسی از شعر ابیات  
ہزاراں آفرین بر شیخ منجھن  
کہ مدد محالت زبان ہندی منجھن  
دروغ و راست ادا اندیا بیات  
بشعر ہندی بود است پر فن

کمل فارسی ترجمہ کے اشعار کی تعداد ایک ہزار تھی جو ۱۰۵۹ھ میں تمام ہوئی چنانچہ مترجم کے آخری اشعار سے واضح ہوتا ہے:

”شہر دم چوں ہم اینجارو باسجام ہزار ابیات آمد نظم امتام

شدی ہند و محبت نامہ امتام بنظم فارسی نیکو سرا سراجام

ہزار و پنچہ و نہ سال می شود کہ این نو بادۂ نظم آدری بود“

لیکن اس نسخہ مذکور میں کل ۸۲۹ اشعار ہیں، باقی ۱۷۱ اشعار ناقص ہو گئے ہیں۔

یہ ہندو عشقیہ داستان ”مدھالت“، ”مدھالتی“، ”منہرود مدھالتی“ وغیرہ کے مختلف

ناموں سے مشہور ہے جسے فارسی، اردو اور ہندی ادیبوں نے اپنے اپنے طور پر بصورت

نظم و رشتاس کرایا ہے۔ لیکن شیخ منہس کی ”مدھالت“ کے اب تک صرف دو فارسی ترجموں

کے قیوت مل سکے ہیں۔ ان میں سے پہلا ترجمہ تو یہی ہے اور دوسرا ترجمہ اس کے پانچ سال

بعد ۱۰۶۲ھ میں عاقل خاں رازی (متوفی ۱۱۶۶ھ) نے ”ہردماہ“ کے نام سے کیا تھا۔

انڈیا آفس لائبریری لندن اور مسٹر ڈی ایس مارشل (D.N. Marshall) کی تحریر کے

مطابق عاقل خاں رازی کی ”ہردماہ“ کا زبان دکنی ترجمہ مولانا نصرانی بیجاپوری (متوفی ۱۱۸۳ھ)

میں کیا تھا جو ”گلشن عشق“ کے نام سے مشہور ہے۔

افسوس کہ اولین مترجم ”مدھالت“ شیخ نور محمد کی حیات سے متعلق مختلف اور متعدد کتب

کی درستی گردانی کے باوجود کہیں سے بھی کوئی مواد فراہم نہ ہو سکا۔ حیرت تو یہ ہے کہ یورپین مصنفین مسٹر

۱۵۔ یہ عہد عالمگیری میں دہلی کے گزرتھے جن کے حالات زندگی مختلف کتب تواریخ فارسی اور اردو میں

بالتفصیل موجود ہیں۔ ۱۶۔ Mughal Bibliography, by D.N. Marshall; P29

Catalogue India office

Library, v.1: P. 894. ایضاً۔



چارلس ریو اور سٹراٹج ایچ جیسے محققین مشرقیات نے صرف اسم منجھن اور نام مترجم ذکر کیا اور دیگر ان کے مخصوص حالات سے دامن اور اق بچا گئے۔

بنائیں خیال ہوتا ہے کہ اس بے اعتنائی کو لائق اعتنا بنا کر پیش کیا جائے تاکہ برہان کے ذریعے کچھ حد تک تسلی بخش معلومات اردو دان حضرات تک پہنچ جائیں لیکن مترجم شیخ نور محمد کے سلسلے میں کچھ عرض کرنے سے معذوری ہے جس کا اشارہ پچھلے صفحات میں کر دیا گیا ہے۔ البتہ اور سچل تصنیف اور اس کے مصنف شیخ منجھن کے بارے میں چند سطری عرض کی جاسکتی ہیں۔

شیخ منجھن کے سلسلے میں بھی کسی اردو مصنف کی کوئی قابل اطمینان تحریر اب تک میری نظر سے نہیں گزری۔ اگر کسی نے ہمت بھی کی تو صرف شیخ منجھن اور ان کی مدد محالیت کا نام لکھ کر اپنا رہوار قلم آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ہاں ہندی مصنفین کے توسط سے کچھ ذرائع معلومات فراہم ہو سکے ہیں۔ ان ہندی اہل قلم میں خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر شیو گوپال مہرا (معلم سائنس الہ آباد یونیورسٹی) اور ڈاکٹر تاپر شاد گپتا (الہ آبادی مرحوم رسالہ صدر شعبہ ہندی راجستھان یونیورسٹی) قابل ذکر ہیں جنہوں نے شیخ منجھن کی تصنیف کو پوری تحقیق کے ساتھ مع تشریحات کے مرتب کر کے شائع کرایا ہے۔ انہیں دونوں مرتب شدہ ملبومہ ہندی کتابوں کی بنیاد پر چند اطلاعات عرض کی جا رہی ہیں۔

ڈاکٹر مہرا اور ڈاکٹر گپتا صاحبان نے یہ غدر ظاہر کیا ہے کہ شیخ منجھن کے حالات زندگی سے متعلق کوئی دوسرا ذریعہ مواد میسر نہیں، البتہ خود شیخ موصوف کی ”مدھالیتی“ کے ابتدائی اشعار سے زندگی کا ایک ہلکا سا خاکہ مرتب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر شیو گوپال مہرا کی مرتب شدہ ”مدھالیتی“ ہندی پرچارک پستکالیہ، بنارس سے ۱۹۵۷ء اور ڈاکٹر تاپر شاد گپتا کی ”مدھالیتی“ مترپراکاشن پرائیویٹ لیڈ، الہ آباد سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی ہے۔  
 لکھ دیا چہ مہرا: ص ۱۷ اور دیا چہ گپتا: ص ۱۳۔

کچھ ہندی مصنفین کا خیال ہے کہ شیخ منہن ہندو تھے لیکن ڈاکٹر مصر اور ڈاکٹر گپتا نے ثابت کیا ہے کہ وہ بلاشبہ مسلمان اور شطاری سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ محمد غوث گوالیار (متوفی ۹۶۲ھ) کے مریدوں میں سے تھے۔ شیخ منہن کا وطن چنار (ضلع مرزا پور، یوپی) تھا۔ والد کے انتقال کے بعد بارہ سال تک پہاڑی غاروں میں جا جا کر حصولِ روحانیت کے لیے ریاضتیں کرتے رہے۔ اس ریاضتی مدت کے بعد ہی ۹۵۵ھ میں داستانِ مدھالٹی بصورتِ نظم تخلیق کی گئی۔ یہ وہ سال تھا جب شیر شاہ سوری کی وفات ہوئی اور اس کا لڑکا سلیم شاہ سوری (متوفی ۹۶۳ھ) تختِ ہند پر متمکن ہوا۔

ڈاکٹر گپتا کی ”مدھالٹی“ میں کل ۵۳۹ چھند ہیں جن میں سے چھند ایک تا تینتالیس میں حمد باری تعالیٰ، نعت نبیؐ، مدح خلفاءِ اربعہ، منقبتِ سلیم شاہ سوری، اپنے پیر شیخ محمد غوث گوالیار کی کرامات و بزرگی اور اپنے وطن چنار وغیرہ کا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد چھند چالیس سے اصل داستانِ عشق کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مترجم شیخ نور محمد نے صرف اسی حصہ کا ترجمہ کیا ہے اور باقی ابتدائی یعنی چھند ایک سے تینتالیس تک کا ترجمہ نہیں کیا۔ معلوم نہیں مترجم موصوف نے کس مصلحت کے پیش نظر انھیں نظر انداز کر دیا۔ اگر ان مقدّمات چھندوں کا بھی ترجمہ کر دیا ہوتا تو اہلِ فارسی اور اردو بھی مستفیض ہو سکتے تھے۔

شیخ منہن کی اصل ”مدھالٹی“ کے چار نسخے ہمارے ہندوستان میں دستیاب ہیں۔ ان میں سے دو فارسی رسم الخط اور دو ناگری (ہندی) میں ہیں۔ ایک فارسی رسم خط والا نسخہ نواب رامپور کی لائبریری اور دوسرا ”بھارت کلا بھون بنارس“ میں ہے۔ باقی دو ناگری حرفِ دالے بھی ”بھارت کلا بھون بنارس“ میں ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر مصر: ص ۱۹ اور ۲۱۔ ۲۔ ڈاکٹر گپتا: ص ۱۶۔ ۳۔ ڈاکٹر مصر: ص ۲۳۔ ۴۔ ڈاکٹر گپتا: ص ۲۷۔

ڈاکٹر مصرا نے زبانِ ہندی کے عالموں اور مصنفوں پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ شیخ منجن کی ”مدھالتی“ عرصہ دراز سے گوشہ گنہامی میں پڑی رہی، کسی نے بھی اسے لائقِ اعتنا نہیں سمجھا۔ جس کی وجہ سے ناظرینِ ہندی ادبیات اس کے تعارف سے یکسر محروم تھے۔ سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں شری جگموہن دومانے اسے متعارف کرایا۔ ڈاکٹر مصرا کا خیال ہے کہ جملہ عشقیہ داستانوں میں سب سے بہتر داستان منجن کی یہی ”مدھالتی“ ہے۔ اس میں جو خیالات اور عشق و محبت کے پردے میں زندگی کے جو اعلیٰ اصول پیش کئے گئے ہیں وہ کسی بھی دوسری کہانیوں میں نہیں پائے جاتے۔

کہانی کا خلاصہ | شہر کنے گہری گڈھ کے راجہ سورج بھان کا ایک جوان اور خوبصورت لڑکا ”منوہر“ نامی تھا جو ایک رات گہری نیند میں سو رہا تھا کہ کچھ پریاں اُس کی خواب گاہ میں آکر پلنگ سمیت اسے اٹھا لے گئیں اور شہر مہاراجہ کے راجہ بکرم راج کی لڑکی ”مدھالتی“ کی خواب گاہ میں لے جا کر اس کی چار پائی کی بغل میں رکھ آئیں۔ کچھ دیر بعد جب پہلے منوہر کی آنکھ کھلی تو دیکھتا ہے کہ ایک نازک حسینہ سامنے پلنگ پر موجود خواب ہے، دیکھتے ہی اس کے حسن پر ذلیفہ ہو جاتا ہے۔ اتنے میں مدھالتی کی بھی آنکھ کھل گئی اور اپنے کمرے میں ایک اجنبی جوان کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے لیکن فوراً ہی دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہو کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور آپس میں یہ عہد کر لیتے ہیں کہ اب کوئی طاقت ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی لیکن دوسری رات نیند کی حالت میں پریاں پھر منوہر کو مع پلنگ اس کے اپنے گھر واپس پہنچا دیتی ہیں۔

جب منوہر اور مدھالتی اپنے اپنے بسترِ خواب بے بیدار ہو کر کیفیتِ خراق کا اندازہ لگاتے ہیں تو دیکھتے ہیں تو وصالِ یار کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ غمِ محبوب میں منوہر کی جسمانی حالت دن بدن خراب ہونے لگی۔ والدین نے سمجھا کہ کوئی عام بیماری سخت جگر کو لاحق ہو گئی ہے۔ حکماء



اور وید طلب کیے گئے، سب نے کہا کہ اس راہ زادہ پر مرضِ عشق کا شدید حملہ ہے۔ چنانچہ کنور منوہر نے اپنے والدین سے مددھالتی کی تلاش میں نکلنے کے لیے اجازت طلب کی۔ اجازت نہ ملنے پر ایک دن وہ اپنے دس ہراسوں کو لے کر گھر سے نکل پڑا ہے۔ چلتے چلاتے وہ ایک سمندر کے پاس پہنچتا ہے جہاں سے ایک کشتی کے ذریعے دریائی سفر شروع ہوا۔ چار ماہ تک مسلسل سمندری سفر کے دوران کشتی ایک طوفانی حادثے کا شکار ہو گئی جس سے منوہر کے سبھی ہمراہی غرقاب ہو گئے، صرف وہ خود کسی طرح بچے بچاتے ایک ساحلی جنگل تک پہنچ گیا جہاں سامنے اسے ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا۔ جب مکان تک پہنچتا ہے تو وہاں ایک جوان لڑکی کو موجود دیکھا۔ منوہر کے دریا زنتِ حال پر لڑکی نے اپنا تعارف کرایا کہ میرا نام پنیا ہے، شہر چیت پٹراؤں کے راہ چتر سین کی لڑکی ہوں، اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک دن باغ میں کھیل رہی تھی کہ اچانک ایک ناموافق حالت سے ڈر کر سہیلیاں مجھے تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں، اُسی وقت ایک راکھشش آیا اور مجھے تنہا پا کر یہاں جنگل میں اٹھالایا۔ راکھشش کا نام سنتے ہی منوہر اس سسنان اور انجانے مقام سے فرار پر آمادہ ہوا۔ لیکن پنیا اس کے پاؤں پر گر کر التجا کرنے لگی کہ میرے اوپر رحم کرو اور اس جنگل سے نجات دلاؤ۔ حسن اتفاق سے راکھشش وہاں موجود نہیں تھا بلکہ وہ اپنی بہیمیت کی تسکین کے لیے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ پنیا سے یہ سارا ماجرا سن کر منوہر نے بھی اپنے فراقِ یار کی پوری کہانی پنیا سے کہہ ڈالی تو پنیا نے بتایا کہ مددھالتی تو میرے بچپن کی سہیلی تھی اب میں ایک سال سے یہاں راکھشش کے جنگل میں ہوں اس لیے ٹھیک سے نہیں بتا سکتی کہ وہ آج کل کہاں ہے؟ منوہر پنیا کی التجا اور مددھالتی کے ساتھ تعلق کا واقعہ سن کر خوش آمدتِ توقعات کے ساتھ تیار ہوا کہ راکھشش سے پیا کو ضرور نجات دلائے گا، چنانچہ پنیا نے راکھشش کے جس شدہ اسلحہ جات منوہر کے سامنے لا کر رکھ دیے کہ وہ اپنے مناسب ہتھیار مقابلے کے لیے منتخب کر لے۔ اتنے میں راکھشش آگیا اور ایک اجنبی انسان کو اپنے گھر دیکھ کر بہت برازدختہ ہوا۔

منوہر نے بھی اس کی خشم آلودہ باتوں کا جراتمندانہ جواب دیا۔ یہ جواب دینا تھا کہ راکھشش اس پر جھپٹ پڑا۔ دونوں میں دیر تک لڑائی ہوتی رہی۔ آخر کار منوہر نے اپنے مقابل کا خاتمہ کر کے پیماکو اپنے ساتھ لیا اور اس کے ماں باپ کے پاس گھر پہنچا دیا۔ پیماکے والدین منوہر کے اس عظیم احسان سے متاثر ہو کر دونوں کی ایک دوسرے سے شادی کر دینی چاہی۔ لیکن منوہر نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں نے پیماکو اپنی بہن بنا لیا ہے۔

چند دن بعد منوہر پیماسے رخصت ہو کر چلے جانے کی تمنا ظاہر کرتا ہے تو پیماکہتی ہے کہ پہلے مددھالتی چاند کی دوسری تاریخ کو میرے گھر برابر آیا کرتی تھی، اب میں یہاں آگئی ہوں اس لیے میری یہاں موجودگی کی اطلاع پا کر پھر وہ حسب معمول آسکتی ہے، اگر چند دن اور قیام کر دوں گی تو تمہیں اس سے ملا دوں گی، چنانچہ ایک دن مددھالتی اپنی ماں کے ساتھ پیماکے گھر آئی تو حسب وعدہ خفیہ طور پر ایک مخصوص کمرہ میں دونوں کا ملاپ کر دیا۔ تنہائی میں ایک بیگانے جو ان کے ساتھ مددھالتی کو اس کی ماں نے مخبر گفتگو دیکھا تو بہت ناراض ہوئی اور دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہماری خاندانی روایات اور عزت و آبرو پر اس لڑکی کی وجہ سے ایک بدنام داغ ہو گا، چنانچہ غصہ میں پانی پر منتر پڑھ کر مددھالتی پر تھپڑ مار دیا جس سے وہ اسی وقت چڑیا بن کر اڑ گئی۔ اس حیرتناک وقوع پر اس کے والدین غم میں کف افسوس منے لگے۔ اب مددھالتی چڑیا کے روپ میں اپنے محبوب منوہر کو تلاش کرتی پھری۔ ایک دن اڑتے ہوئے پونیری گڑھ مقام کے ایک راجکمار تارا چند کے گھر پر جا بیٹھی، اتنے میں اچانک تارا چند کی نظر اس خوبصورت چڑیا پر پڑی جسے راجکمار نے جال میں پھنسا کر ایک خوبصورت سوتا کے قفس میں بند کر لیا۔ راجکمار داتا دتا کا قفس میں کھانے کے لیے ڈالتا لیکن وہ بالکل نہ کھاتی۔ تارا چند نے جب نہ کھانے کا سبب معلوم کرنا چاہا تب چڑیا (مددھالتی) اپنی پوری رام کہانی سناتی ہے۔ اس کی غمناک داستان سن کر وہ بے حد متاثر ہوا اور وعدہ کیا کہ آج سے تم میری بہن ہو، تمہارے درد دل کا مداوا ڈھونڈھ نکالنے کی میں ہر امکانی کوشش کر دوں گا۔ چنانچہ تارا چند قفس لیے اپنے چند مصاحب کے

ہمراہ مددھالتی چڑیا کو لے جا کر اس کے گھر والدین کے حوالے کر دیا۔ اب ماں نے پھر سابقہ کی طرح پانی پر منتر پڑھ کر چڑیا پر چھڑک دیا تو فوراً ہی وہ اصل مددھالتی کی شکل میں منسلک ہو گئی۔ مددھالتی کے والدین نے اپنی کھوئی ہوئی دولتِ اولاد پا کر تارا چند کے احسان کا معاوضہ اس طرح ادا کرنا چاہا کہ وہ اپنی لڑکی شادی تارا چند سے کر دیں لیکن تارا چند نے کہا کہ وہ تو اب میری بہن بن چکی ہے اس لیے شادی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ البتہ اگر آپ لوگ مددھالتی کی شادی را جکار منوہر سے کر دیں تو یہ آپ سب کے لیے زیادہ مناسب اور مفید کارکردگی ہوگی۔

غرضیکہ ایک شہد اور میارک دن متعین ہو کر دونوں کی شادی ہو جاتی ہے اور کچھ دنوں بعد را جکار تارا چند کی شادی بھی پیا کے ساتھ ہو گئی۔

۳۔ قصہ سلطان محمود غزنوی | صفحات ۱۴، کتابت نیم شکستہ - مصنف، کاتب اور سال کتابت کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ شانتی نیکیتن لاہوری کے علاوہ ہندوستان میں اس کے مزید دو نسخوں کا سراغ ملتا ہے۔ ایک خدا بخش لاہوری پٹنہ اور دوسرا ایشیاٹک سوسائٹی لاہوری کلکتہ میں ہے۔ ان دونوں مقامات کے نسخوں میں بھی مصنف کا نام مذکور نہیں۔ اسی طرح انڈیا آفس لاہوری، لندن میں بھی جو نسخہ ہے اس کے مرتب فہرست مہراج، ایچ نے بھی قصہ مذکور کے مصنف کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً مصنف نے اپنی خاکساری کے تحت تشہیر نام مناسب نہیں خیال کیا۔ یہ قصہ سلطان محمود غزنوی اور ایک سوداگر بچے سے متعلق ہے جس کے ذریعے مصنف نے اخلاقیات کی تعلیم و تلقین پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ قصہ مذکور کا اردو خلاصہ حسب ذیل ہے :

”ایک بار تختِ شاہی پر بیٹھے ہوئے سلطان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ باشندگان شہر کے اعمالِ نیک و بد کو بحیثیت خود معائنہ کرنا چاہیے، چنانچہ سلطان ایک رات کو قوال کے ہمیں میں شہر کے ملاحظہ کے لیے نکل کھڑا ہوا، ناگاہ اپنے وزیر کے گھر پر اولاً نظر پڑی جس کے



بالا خانہ پر لٹھی رسی کے ذریعے ایک جوان چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کوتوال (سلطان) نے اُسی حالت میں اسے گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد دونوں میں تکرار شروع ہوئی۔  
جوان۔ آپ مجھے گرفتار کرنے والے کون ہیں؟

کوتوال۔ میں کوتوالِ شہر ہوں۔

جوان۔ مجھے چھوڑ دیجیے۔

کوتوال۔ احمق! چور کو گرفتار کرنے کے بعد فوراً ہی کہیں رہائی دی جاتی ہے؟

جوان۔ آخر آپ کا ارادہ کیا ہے اور میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟

کوتوال۔ تم نے جس قسم کی چوری کی جرأت کی ہے، اس کی سزا قتل ہے۔

جوان۔ (نالہ و فریاد کے انداز میں) مجھے میرے گھر لے چلئے تاکہ میرے والد کوئی ضمانت دے سکیں۔

چنانچہ کوتوال اس کو لیے ہوئے گھڑ تک پہنچا۔ جوان کے باپ نے جب یہ افسوسناک منظر دیکھا تو کہا کہ کوتوال صاحب! میں نے اس لڑکے کو بارہا منع کیا ہے کہ نصف شب میں گھر سے

مت نکلا کر ولیکن یہ میری ایک بات نہیں سنتا، اب یہ آپ کے قبضے میں ہے جو مناسب

سلوک آپ چاہیں کیجیے، مجھے کوئی ضمانت نہیں دینی ہے۔ باپ کے اس جواب سے سلطان

کے دل پر یہ تاثر ابھرتا ہے کہ کیا شفقتِ پدری دنیا سے رخصت ہو گئی؟

جوان جب اپنے باپ سے مایوس ہوا تو کوتوال سے کہا کہ میرا ایک مخلص دوست ہے

اس کے پاس چلیے! اب کوتوال اس کو لیے دوست کے گھر پہنچا۔ احوال معلوم کرنے کے بعد

دوست ضمانت پر راضی ہو گیا۔ کوتوال نے متحیر ہو کر کہا کہ اس جوان کا باپ تو ضمانت پر تیار

نہ ہوا لیکن تو کیونکر راضی ہو گیا؟ دوست نے کہا کہ وہ باپ تھا اور میں دوست ہوں:

دوست آں باشد کہ گیر دستِ دوست در پریشاں حالی و در ماندگی

اس کے بعد کوتوال جوان کو اس کے دوست کے پاس چھوڑ کر اپنے محل کی جانب

لوٹ رہا تھا کہ اچانک راستے میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جوان اور اس کے دوست کی حقیقت

معلوم کرنی چاہیے۔ چنانچہ کوتوال (سلطان) اس دوست کے نزد خانہ پہنچ کر خفیہ گوش برآواز ہوا۔ اس وقت وہ جوان اپنے دوست سے گرفتاری کا ماجرا سنار ہا تھا اور یہ بھی کہہ رہا تھا کہ دختر وزیر اور میرے درمیان یہ معاہدہ ہے کہ ہر شب ہم دونوں نصف نصف پرے قرآن کی تلاوت کیا کریں، اسی وعدہ کے مطابق میں وہاں ہر شب جایا کرتا ہوں اس لیے مجھے رخصتی کی اجازت دوتا کہ میں حسب وعدہ مبارک شغل ختم کر آؤں۔ دوست نے جواب دیا کہ بڑی مشکلوں سے پذیر یوضمانت میں تے تمہیں رہائی دلوائی اور اب پھر وہی شب گردشی تمہیں سو جھنے لگی۔ لیکن جوان کی بسیار منت و سماجت کے بعد دوست اسے رخصت کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اب پھر کوتوال (سلطان) اس کے خفیہ تعاقب میں لگ گیا کہ دختر وزیر کے ساتھ جوان کے تعلقات کا بھی پتہ چلانا چاہیے۔ غرض یہاں بھی اس نے دختر وزیر کو پہلے اپنی گرفتاری کی خبر سنائی اور کہا کہ وقتِ عمر کم ہے، قرآن لاؤ تاکہ ہم دونوں جلد تلاوت ختم کر لیں۔ وزیر زادی پورا ماجرا سننے کے بعد حد درجہ غمگین ہوئی اور اپنے دوست کے قتل کر دیے جانے کے حکم کی وجہ سے آہ و بکا کرنے لگی۔ جوان نے اسے دلاسا دیا کہ میرے مقدر میں جو ہونا ہے اسے تو کوئی روک نہ سکے گا۔ لیکن میری تم سے یہ التماس ہے کہ دربار شاہی میں میرے قتل کیے جانے سے قبل آخری بار تم مجھے اپنی صورت دکھا جانا۔ دختر وزیر نے کہا اطمینان رکھو ایسا ہی ہو گا۔ اس کے بعد وہ پھر اپنے دوست کے گھر آ گیا۔ (باقی آئندہ)

**وحدة الوجود : مؤلفہ، مولانا عبدالعلی صاحب بحر العلوم۔**

رسالہ وحدة الوجود و شہود الحق فی کل موجود کا مطلب خیر ترجمہ ہے۔ مترجم ۔

مولانا ابوالحسن صاحب فاروقی، جھولی تقطیع ۲۰x۳۰ صفحات ۱۳۶۔ قیمت -/۶ روپے۔

پتہ: مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔



## تبصرے

اقبال از مولوی احمد دین مرتبہ جناب مشفق خواجہ تقطیع متوسط ضخامت ۵۲۷ صفحات، کتابت دطباعت بہتر قیمت -/۴۰ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی نمبر (۱)

مولوی احمد دین کشمیری اقبال کے معاصر ہم پیشہ اور بے تکلف دوست تھے، شعر و ادب کا ذوق اعلیٰ تھا، اردو زبان کے ادیب، نقاد اور نامور مصنف تھے، انھوں نے اقبال پر ایک کتاب لکھی تھی جو ۱۹۲۳ء میں چھپی تھی۔ لیکن اقبال نے اس کو پڑھا تو ناپسند کیا۔ مصنف نے طیش میں آکر کتاب کی تمام مطبوعہ جلدیں نذر آتش کر دیں، صرف دو نسخے کسی طرح بچ نکلے، اس کے بعد مصنف نے کتاب کا دوسرا ایڈیشن تیار کیا جو ۱۹۲۷ء میں طبع ہوا۔ اس میں پہلے ایڈیشن کے مقابلہ میں ترمیم و اضافہ بہت کافی تھا لیکن عرصہ سے یہ کتاب ناپید تھی۔ جناب مشفق خواجہ جو اردو زبان و ادب کے نامور محقق اور صحیح معنی میں اس کے کوہکن ہیں ان کی نظر سے یہ کتاب گزری تو انھوں نے اس کو ایڈٹ کر کے شائع کرنے کا ارادہ کر لیا اور کتاب منظر عام پر آگئی۔

اگرچہ اب تک اقبال پر سینکڑوں کتابیں اور مقالات مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کا سلسلہ برابر جاری ہے اور رہے گا اور اس میں شک نہیں کہ فن تنقید نے بھی غیر معمولی ترقی کی ہے جس کی وجہ سے کسی شاعر کے کلام پر بحث کے نئے نئے گوشے اور پہلوئے بنوع نوع نکل آئے ہیں، لیکن اس کے باوجود مولوی احمد دین نے اقبال کی شخصیت اور ان کے فکر و فن پر



ایک عوم راز کی حیثیت سے جو مبصرانہ کلام کیا ہے وہ علمی تاریخی اور پھر ادب و انشا کے اعتبار سے بھی اپنی ایک خاص انفرادیت رکھتا ہے، مصنف کا انداز تنقید قدیم یعنی شبلی اور حالی جیسا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ ادل تو یہ طرز جس میں کلام کے محسنات لفظیہ و معنوی سے بحث ہوتی ہے بجائے خود اہم ہے اور پھر مصنف نے ہر باب میں متعدد نکات ایسے بیان کیے ہیں جن سے تنقید جدید فائدہ اٹھا سکتی ہے، اس بنا پر کتاب خود تو اہم اور طبع جدید کی مستحق تھی ہی لائق مرتب نے علمی اور تحقیقی حیثیت سے کتاب کی اہمیت دو چند بلکہ چار چند کر دی ہے، انھوں نے شروع میں چند صفحات کے دیباچہ کے بعد ایک طویل مقدمہ میں مولوی احمد دین کے حالات و سوانح اودان کے علمی و ادبی کارنامے غایت تحقیق اور کمال ذرف نگاہی سے لکھے ہیں اور آخر میں کتاب کے طبع اول و طبع دوم میں جو اختلافات تھے لائق مرتب نے تقریباً دو سو صفحات میں ان کا ذکر کیا اودان پر تعلیقات و حواشی بڑی کاوش اور محنت و دیدہ ددی سے تحریر کیے ہیں، جو لوگ خواجہ صاحب سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ موصوف جب تک بال کی کھال نہیں نکال لیتے انھیں چین نہیں آتا، مثلاً: اگر ان کو یہ معلوم ہے کہ مولوی احمد دین کا تعلق فلاں اخبار سے بھی تھا تو اب خواجہ صاحب کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ تعلق کب شروع ہوا اور کیوں ختم ہوا، اور اس کے تعلق کی مدت کتنے برس، کتنے مہینے، کتنے ہفتے، کتنے دن اور کتنے گھنٹے تھے، نیز یہ اخبار کب نکلتا شروع ہوا، کب اور کیوں بند ہوا وغیرہ وغیرہ۔ ان کا وہی انداز اس کتاب میں بھی ہے اس بنا پر نہ صرف اقبالیات بلکہ اردو زبان و ادب کے ہر ریسرچ اسکالر کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ غالب اور صغیر بلگرامی از مشفق خواجہ صاحب، تقطیع متوسط، ضخامت ۲۰۴ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ، قیمت مجلد - / ۲۵ روپے - پتہ: عصری مطبوعات ۷/۳۲۲، بلاک ڈی، نارتھ ناظم آباد، کراچی - ۲۳۔

صغیر بلگرامی غالب کے شاگرد بھی تھے اور مخدوم زادہ بھی، ان پر متعدد مقالات ادب ایک



کتاب بھی لکھی گئی ہے، لیکن خواجہ صاحب نے اب نئے اور کچھ نئے مآخذ کی روشنی میں غالب و صغیر کے تعلقات کی داستان بڑی کاوش و تحقیق سے از سر نو مرتب کی ہے، شروع میں صغیر کی داستان حیات خود ان کی زبانی سنائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صغیر ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ پھر صغیر کے خطوط بنام غالب اور غالب کے خطوط صغیر کے نام نقل کیے ہیں، اس کے بعد صغیر نے اپنی تصانیف اور تحریروں میں جہاں کہیں غالب کا ذکر کیا ہے یا صغیر کے تعلق سے کسی اگر کوئی کتاب لکھی یا خط لکھا ہے اور اس میں کسی عنوان سے بھی غالب کا ذکر آگیا ہے، خواجہ صاحب نے مختلف عنوانات کے ماتحت ان سب کو یکجا کر دیا ہے اور یہی نہیں بلکہ اپنے ذوق تحقیق و جستجو کے مطابق ایک ایک چیز کی اصل حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کی اور اس کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، چنانچہ خطوط کی تاریخ ارسال و تاریخ وصولیابی و اشاعت، خطوط اور صغیر کے غالب سے متعلق مختلف بیانات کے متون کا کتنا حصہ اصلی ہے اور کتنا جعلی، اختلاف نسخ و غیرہ ان سب پر تعلیقات و حواشی میں بڑا مہرمانہ کلام کیا ہے، اور اس سلسلہ میں اگر کسی محقق سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو دلائل کی روشنی میں اس کی نشان دہی کی ہے، علاوہ ازیں کتاب میں بعض بہت اہم لسانی، ادبی اور شعری مباحث بھی آگئے ہیں جن سے غالب کے بعض خاص افکار و نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے کتاب تحقیقی، تاریخی اور ادبی تنقید کے اعتبار سے اردو لٹریچر کی اعلیٰ اور بلند پایہ کتابوں میں ایک خوشگوار اضافہ ہے، نو واردان میدان تحقیق کو خصوصاً اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

ابیات از مستفق خواجہ تقطیع متوسط ضخامت ۱۵۱ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ، قیمت مجلد پندرہ روپے، پتہ: مکتبہ بنیاد دور-کراچی - ۵۔

یہ خواجہ صاحب کے کلام منظوم کا مجموعہ ہے، یہ عجیب بات ہے کہ خواجہ صاحب بلند پایہ محقق اور وسیع النظر ادیب و مصنف ہیں اور ساتھ ہی اردو زبان کے نثر گو شاعر بھی ہیں۔



یہ بات عجیب اس لیے ہے کہ ابن خلدون کی رائے کے مطابق جو شخص جتنا بڑا عالم ہوگا اسی قدر شاعر (ناظم نہیں) کم درجہ کا ہوگا۔ اس نظریہ کو اگر قاعدہ کلیہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو ہر کلیہ میں کچھ مستثنیات ہوتے ہیں اور خواجہ صاحب کا شمار انہی مستثنیات میں ہونا چاہیے، اس شعری مجموعہ کی خصوصیات کیا ہیں؟ ان کو خود شاعر نے رمز و ایہام کی زبان میں خود بیان کر دیا ہے، دیا چہ میں فرماتے ہیں:

یہی غزل مری محرومیوں کا لوحِ غم      یہی غزل ترا آئینہٴ جمال بھی ہے  
جو پاسکانہ تجھے میں تو کھو دیا خود کو      یہ مرا عجز بھی ہے یہ مرا کمال بھی ہے  
خواجہ صاحب کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، لیکن مختصر یہ ہے کہ میر کا سوز و گداز، اصغر گویندوی کا تخیل اور فیض کا آہنگ، یہ تین عناصر ہیں جنہوں نے باہم آمیختہ ہو کر "ابیات کا پیکر اختیار کیا ہے۔"

## سدرہٴ وطوی

اردو زبان کے مشہور و مقبول شاعر جناب آلم مظفر نگری کا تیسرا مجموعہ کلام ہے، کوثر و نسیم کے بعد جتنی غزلیں اور نظمیں لکھی گئی ہیں وہ سب اس مجموعہ میں شامل کر دی گئی ہیں۔

سدرہٴ وطوی آلم صاحب کا بہترین شاہکار ہے۔ آہنگ سرمدی کے بعد یہ دوسرا مجموعہ کلام ہے جو مکتبہ برہان نے شائع کیا ہے۔

گرد پوش جاذبِ نظر۔ قیمت: -/۶ روپے

پتہ:- مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۱۱